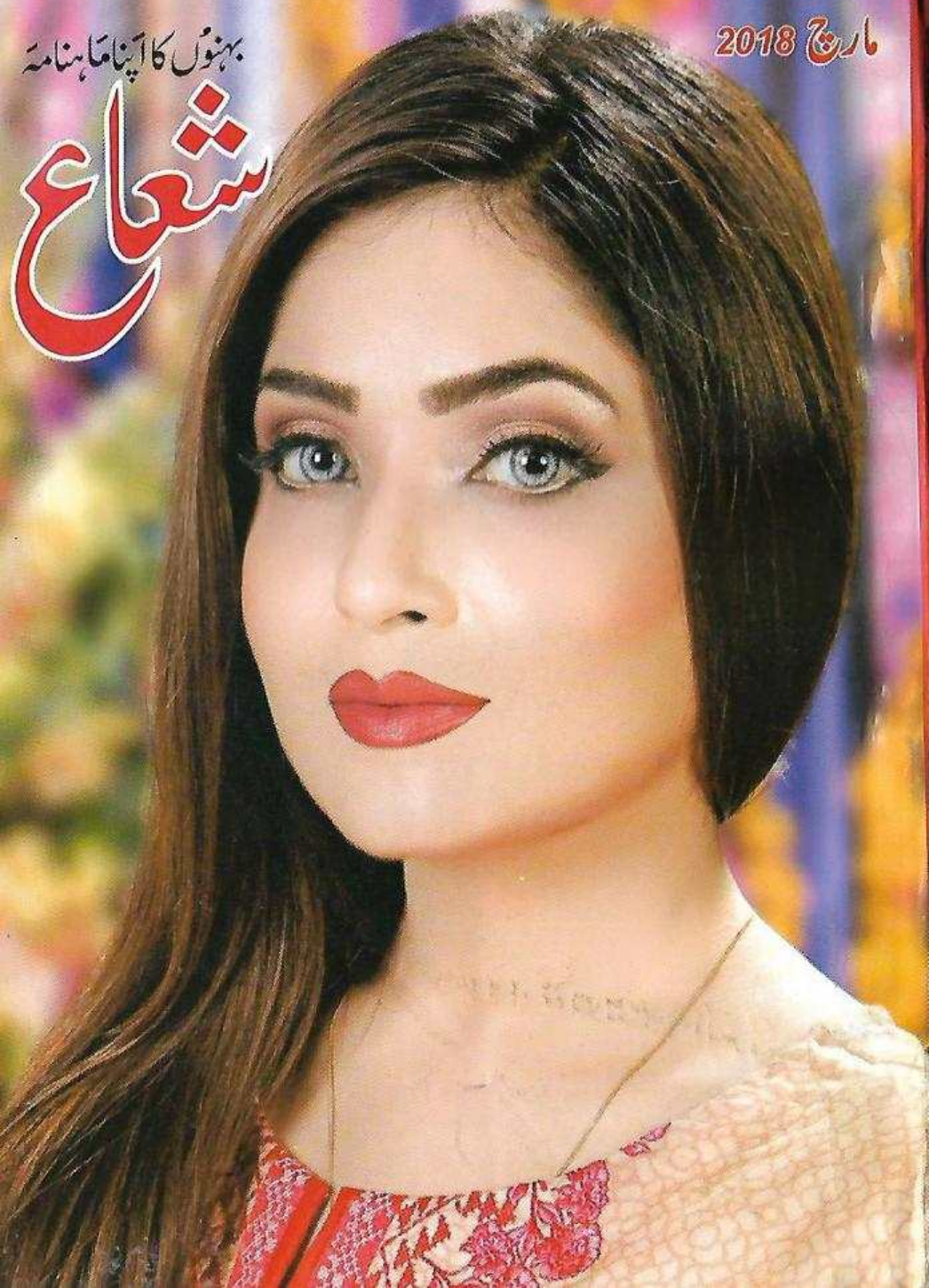


مارچ 2018

بہنوں کا اپنا مہنامہ

شعاع



بہنوں کا اپنا ہمارا

شعاع

خاکہ و کماکت لکھی

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نئے نئے دوسرائی  
رکن کراچی آل پاکستان نئے نئے دوسرائی

MEMBER  
APNS  
CPNE

باقی و مہینہ لکھی

مسیح

مہینہ و مہینہ

مہینہ و مہینہ

مہینہ و مہینہ

مہینہ و مہینہ

مہینہ و مہینہ

دوسرا لکھی و مہینہ لکھی

پاکستان (سالانہ) 700 روپے

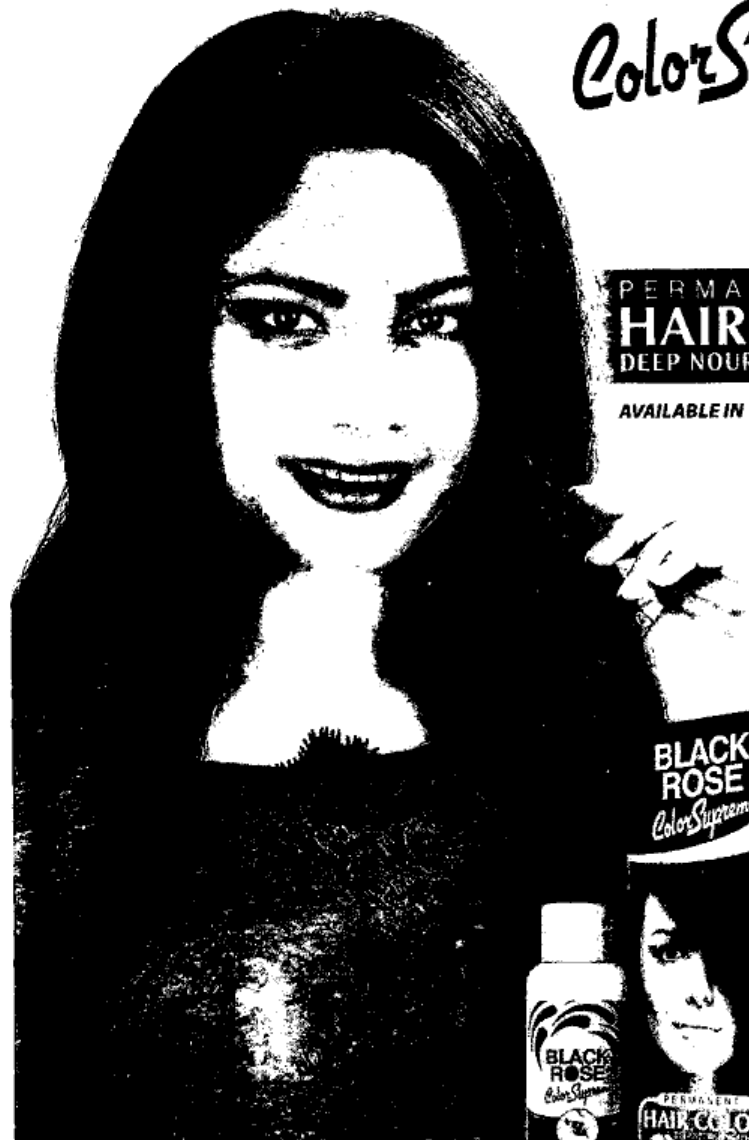
ایشیا و افریقہ، یورپ 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 7000 روپے



WITH  
COLOR LOCK  
TECHNOLOGY™

BLACK ROSE®  
Color Supreme



PERMANENT  
HAIR COLOR  
DEEP NOURISHING EFFECTS

AVAILABLE IN 10 DIFFERENT SHADES



COLOR EXPERTS!

www.blackrosecolor.com





282	امت الصور	تاریخ کے جھوکے	271	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	موسم کے پگوان	264	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خواصورت بننے	280	واصفہ سہیل	ایٹینہ خالے میں
			268	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
			266	خالہ جیلانی	کھٹلنا کسی پیہ

مارچ 2018  
جلد 32 نمبر 7  
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل غلام حسن پریشک پریشک سے پچھو کر شائع کیا - علامہ اقبال انسٹیٹیوٹ، لاہور

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



78 سائرہ رضا 'ثریا کی کڑیا'



62 حیرانہ بیگم 'ویران دریچے'

72 ریحانہ آفتاب 'گدھ'

103 ماہوش طالب 'ابلیہ پانی کے بعد'

140 قرۃ العین ٹانگا 'دم'

183 عمارہ خان 'چھٹی کا دین'

67 ثمینہ قرچان 'تقلوں کا ٹالپ'

254 قرۃ العین رائے 'بہار آتی'



262 عبدالحمد عید 'غزل'

263 خماریاں بکوی 'نظم'

262 انور شعور 'غزل'

263 محمود شام 'نظم'

10 رضیہ جمیل 'پہلی شعاع'

11 ریاض حسین قمر 'حسد'

11 حاجی امداد اللہ 'نعت'

12 ادارہ 'نئی کی باتیں'



17 سمیرا حمید 'کتاب کہانی'

27 شائین رشید 'عناویر'

31 شائین رشید 'دستک'

286 ادارہ 'شعاع کے ساتھ'

22 ع - م 'جب مجھ سے ملتا'

24 ع - ط 'جب مجھ سے ملتا'



234 عفتہ بخاری 'خواب شیشے کا'

36 صائمہ اکرم 'ستہر زاد'



112 سلوی علیاٹ 'شہری دھوپ'

148 صائمہ اقبال 'حال دل کھل چکا'

188 مہوش اختر 'شب تاب'

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کی کسی بھی انداز سے ترقی شائع کیا جاسکتا ہے، جس کی بھی فی وی بکٹیں پڑھ رہے ہیں، ڈرامائی، تخیلی اور سلسلہ وار قطع کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

شعلہ مارچ کا شمار آپ کے ماقول میں ہے۔  
جدید ٹیکنالوجی نے جہاں بہت سی آسانیاں ہم پہنچائی ہیں وہاں اس کا غلط استعمال بہت سے  
مسائل کا باعث بھی بن رہا ہے۔ دنیا گھومل و پیچ بن گئی ہے۔ فاصلہ سمٹ گئے ہیں لیکن تخلیق و شوق کے  
مابین فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ پوری دنیا سے رابطے میں لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بچوں کو والدین  
سے بات کرنے کی فرصت نہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں آن دیکھی دوستیاں بن رہی ہیں لیکن ساتھ بیٹھا دوست  
کس تکلیف میں مبتلا ہے؟ اس سے لاعلم۔

موشل میڈیا، فیس بک اور یوٹیوب کا استعمال کرنے والے لاکھوں کروڑوں ہیں۔ کوئی بھی بات خواہ  
وہ جھوٹ ہو یا سچ، ایک کلک کے ذریعے لاکھوں کروڑوں افراد تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک سچ خواہ اس  
کا تعلق کسی کی نجی زندگی سے ہو یا کوئی اجتماعی مسئلہ ہو، ناقدین کے بغیر سوجھے سمجھے ایک کلک کر کے بڑھا  
دیا جاتا ہے۔ چینلز پر بھی مقبول شخصیات کے متعلق جھوٹی اور سن گھڑت باتوں کو منظر طریقے سے چھایا جاتا  
ہے تاکہ عوام اصل مسائل پر غور و فکر نہ کر سکیں۔ لیکن وہاں پھر بھی خود حدود و حدود میں جیکسا سوشل میڈیا پر  
آزادی حاصل ہے۔ آپ جس طرح چاہیں اپنے نظریات و خیالات کی ترویج کر سکتے ہیں۔  
اس جدید ترین ٹیکنالوجی کا ایک خطرناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمارے مذہب کے متعلق گمراہ کن عقائد  
کی ترویج کی جا رہی ہے۔

امادیت اور قرآنی آیات کا ترجمہ موشل میڈیا پر آسان ہے اور ہم اسے انگلی کی ایک جنبش سے آگے بڑھا  
دیتے ہیں کبھی یہ سوچنے یا تصدیق کرنے کی زحمت نہیں کرتے کہ قرآن پاک کی آیت کے ترجمے کے نام پر جو بیس لگیا  
ہے قرآن پاک میں وہ آیت موجود بھی ہے یا نہیں۔ کسی نے قرآن پاک کی آیت کے ترجمے میں غلطی تو نہیں کر دی  
ہے یا جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے فیس بک یا یوٹیوب پر لگائی گئی ہے وہ واقعی آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہی ہے۔

کبھی چار لوگوں کو کنگے پیچ کرے پر مراد پوری ہونے کی پیش گوئی کی جاتی ہے تو کبھی کسی بیٹے کی پہلے مبارک باد  
دینے پر بچت کی شہادت دی جاتی ہے۔  
خوشی یا غم خیزی خیر یا شر کے کرم سے ملتی ہے۔ یہ کسی بیچ کو آگے بڑھانے سے نہیں ملتی۔ مراد بھی اللہ ہی پوری  
کرنا ہے اور جنت کا حصول بھی اس قدر آسان نہیں ہے کہ کسی بیٹے کی پہلے مبارک باد دینے سے جنت واجب  
ہو جائے۔ جنت میں اللہ پر کامل یقین اور ایمان کے ساتھ اللہ کے احکامات پر عمل کرنے اور اس کی رحمت سے  
ہی ملے گی۔

اسلام پر کچھ لکھنے یا آگے بڑھانے سے پہلے ہمیں اسلامی تعلیمات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے۔  
اگر کسی بھی بات کو آگے بڑھانے سے پہلے اس کے متعلق تصدیق کر لینا چاہیے کہ اس میں کبھی صداقت ہے۔ کسی  
آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہرگز سنا فی بات کو تصدیق کے بغیر آگے بڑھا دے خصوصاً  
دین کے معاملے میں تو بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم اس طرح غلط عقائد کو پھیلانے میں معاون  
اور مددگار ہو سکتے ہیں۔

#### اسٹن شہارے میں،

ہر موشل اختیار کا مکمل ناول۔ شب تاب،  
ہر سلفیافت اللہ کے مکمل ناول۔ سنہری دھوپ،  
ہر شہزادان، قرۃ العین خرم ہاشمی، ماہ و فن طالب، قرۃ العین ولے، رشاد آفتاب اور عمار خان کے افسانے،  
ہر ان وی کنکارہ عشا نور سے ملاقات،  
ہر جب تجھے نہاتا جوڑا ہے۔ تارین کا سلسلہ،  
ہر سب تارین کو کیسا لگا، خط لکھ کر اپنی رائے سے مفرد قرار دے گا۔



تو خالق ہے زمین و آسمان کا  
تو مالک ہے مکان و لامکان کا

ہے ستر ماڈل سے بڑھ کر محبت  
نہیں پایا ہے تجھ سا مہرباں کا

کرے حمد و ثنا ہر وقت تیری  
یقیناً پتا پتا گلستاں کا

ہے چاروں طرف رحمت کا سمندر  
کنارا کب ہے بحرِ بے گراں کا

قمر جو سب خزانوں کا ہے مالک  
گدا گر ہوں میں اس کے آستان کا

رباعی حسین قمر

کہے ہے شوقِ نبی یہ اکبر، چلو مدینے چلو مدینے  
میں ہوں گادل سے تمہارا ہر چلو مدینے چلو مدینے

صبا بھی لائے گی ہے اب تو نسیم طیبہ، نسیم طیبہ  
کہے ہے شوقِ اب ہوا میں اُڑ کر چلو مدینے چلو مدینے

شہر شہر کیوں پھر ہے مارا، خود دوزخ عالم کی چاہے لہو  
تو سر قدم ہو کے درد یہ کر چلو مدینے چلو مدینے

ہو کفر و ظلم و فسادِ عصیان ہر گ شہر میں ہو گئی  
تو دینِ اسلام اُٹھے یہ کہہ کر چلو مدینے چلو مدینے

جب کے ہوتے ہیں جب بیٹھے، پھر ہیں شوقِ نبی بیٹھے  
مدد یہ کیے میں کو یہ کوئے، چلو مدینے چلو مدینے

ہلاکتِ ابدی و اب تو آئی، جو فتنہ عصیان کی چڑھائی  
نجات پا ہو تو اے بلو د چلو مدینے چلو مدینے

حضرت حاجی امجد اللہ صاحب





وقار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم اس کے لیے دوڑتے ہوئے نہ آؤ (آرام سے معمول کی چال) چلتے ہوئے آؤ اور سکینیت اختیار کرو جو نماز امام کے ساتھ پالو، وہ پڑھ لو اور جو تم سے فوت ہو جائے اسے پورا کرلو۔“

(بخاری و مسلم)

مسلم نے اپنی روایت میں یہ الفاظ زیادہ بیان کیے ہیں۔

”تمہارا ایک آدمی جب نماز کا قصد کر لیتا ہے تو وہ نماز (کی حالت) ہی میں شمار ہوتا ہے۔“

فوائد و مسائل:

1- اس سے معلوم ہوا کہ جماعت کے حصول کے لیے دوڑ بھاگ کر آنا ممنوع ہے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے جبکہ حکم وقار اور سکینیت (سکون) اختیار کرنے کا ہے، بالخصوص نماز وغیرہ کے لیے آتے وقت۔

2- جب انسان گھر سے وضو کر کے نکلتا ہے تو اسی وقت سے اسے نماز میں شمار کر لیا جاتا ہے۔

3- امام کے ساتھ ملنے والی رکعت مقتدی کی پہلی رکعت ہوگی۔ بعد میں جو ادا کرے گا وہ آخری رکعتیں ہوں گی۔ اور یہ بات عقل و نقل (دلائل) کے عین مطابق ہے۔

تیز رفتاری

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ وہ عرفے کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (عرفات سے) واپس لوٹ رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے سخت ڈانٹ، مار اور اونٹوں (کے بڑبڑانے) کی آواز سنی تو آپ نے اپنے کوڑے کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔

”اے لوگو! سکینیت اختیار کرو (یعنی سکون سے چلو) اس لیے کہ تیز رفتاری نیکی نہیں ہے۔“

(بخاری۔ مسلم نے بھی اس کا کچھ حصہ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل:

1- اس میں بھی وقار اور سکون اختیار کرنے اور تیز روی سے اجتہاد کی تلقین ہے۔ مناسک حج کی ادائیگی کے دوران مقامات حج پر اس ہدایت پر عمل کرنے کی بڑی شدید ضرورت ہے کیونکہ وہاں ہر جگہ انسانوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔ ایسے میں ایک دوسرے کو دھکیل کر خود تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش دوسروں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے جس کا مشاہدہ ہر سال ایام حج میں ہوتا ہے لیکن مسلمانوں میں صبر و ضبط کی کمی اور اسے مذہب کی اخلاقی ہدایت سے نا آشنا یا بے اعتنائی کی وجہ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو پاتا اور سعودی حکومت کے بے مثال اور وسیع انتظامات کے باوجود انسانی جانوں کا ضیاع تقریباً ایک معمول سا بن گیا ہے۔

مہمان کی عزت و تکریم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات پہنچی ہے؟ جب وہ ان کے پاس گئے تو انہوں

نے سلام کیا، حضرت ابراہیم نے بھی جواب میں کہا: سلام (اور کہا: یہ) انجانے لوگ ہیں۔ پھر اپنے گھر کی طرف چلے اور ایک پلا ہوا بچھڑا (بھون کر) لائے اور ان کے قریب کیا اور فرمایا: تم کھاتے کیوں نہیں؟“ (سورۃ الذاریات 24-27)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لوٹ کے پاس ان کی قوم دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے پہلے بھی وہ براہیوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ حضرت لوط (علیہ السلام) نے فرمایا:

”اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں، چنانچہ اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں سے

کوئی بھی سمجھ دار آدمی نہیں ہے؟“ (سورۃ ہود۔ 78)

فائدہ آیات: قرآن مجید کے ان دونوں مقامات پر مہمانوں کی عزت و تکریم کا ذکر ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ذیل کی احادیث

ملاحظہ ہوں۔

مہمان کی عزت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہیے۔ اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ صلہ رہی (رشتے داروں سے حسن سلوک) کرے۔ اور جو

اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ بھلائی کی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- مہمان کی عزت کرنے کا مطلب ہے، خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے، حسب استطاعت، خوش دلی سے، اس کی مہمان نوازی کرے اور اس کے آرام و راحت کا خیال رکھے۔

2- صلہ رہی کا مطلب، رشتے داروں کے حقوق

کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے۔

3- گفتگو کرنے کا مطلب ہے کہ بے وجہ اور فضول باتوں سے گریز کرے۔ زبان کو ذکر الہی، توبہ و استغفار اور کلمہ خیر کے لیے وقف رکھے یا پھر زیادہ خاموش رہے۔ یہ تینوں خوبیاں ان لوگوں کی بھلائی کی ہیں جو حج معنوں میں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ان میں کوتاہی کرنے والوں کا ایمان ناقص اور خام ہے۔

مہمان کا حق

حضرت ابو شریح خلیلہ بن عمرو خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اسے مہمان کی عزت کرتے ہوئے اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔“

صحابہ نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس کا حق کیا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایک دن اور رات (یعنی اس میں اپنی طاقت کے مطابق بہتر کھانا تیار کرے۔) اور مہمان نوازی تین دن ہے، جو اس کے علاوہ ہو، وہ صدقہ ہے۔“ (بخاری و مسلم)

مہمان کا قیام

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے پاس (اتنا زیادہ) ٹھہرے حتیٰ کہ اسے گناہ گار کر دے۔“

صحابہ نے پھر عرض کیا:

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کو گناہ گار کیسے کرنے کا؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اس کے پاس ٹھہرا ہے اور اس کے پاس کوئی چیز نہ رہے جس کے ساتھ وہ اس کی مہمان نوازی کرے۔“

فائدہ: اس میں مہمان نوازی کے مزید آداب و حدود کی وضاحت ہے کہ پہلے دن اور رات عمدہ کھانے کا اہتمام کیا جائے اور اس کے بعد دو دن مزید معمول کے مطابق مہمان نوازی کی جائے۔ تین دن کے بعد مہمان کو چاہیے کہ وہ وہاں سے چلا جائے، تاہم اگر وہ نہ جائے تو اس کے بعد مہمان نوازی بطور صدقہ ہوگی۔

### خوش خبری

عبداللہ بن ابی اونی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو خوش خبری دی کہ (ان کے لیے) جنت میں موتیوں کا گھر ہوگا، جس میں نہ شور ہوگا نہ ٹکناں۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت کے علاوہ خیر کی خوش خبری دینے کا اثبات ہے۔

### جنت

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے گھر میں وضو کیا اور باہر نکل گیا۔ (اپنے دل میں) کہا کہ میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہوں گا اور آج کا دن آپ کے ساتھ ہی گزاروں گا۔

چنانچہ میں مسجد میں آیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت (لوگوں سے) پوچھا تو صحابہ نے بتلایا۔ ”کہ آپ نے اس طرف کارخ فرمایا ہے۔“

(حضرت ابو موسیٰ) فرماتے ہیں: ”میں آپ کے قدموں کے نشانات پر آپ کے متعلق پوچھتا ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نکل کھڑا ہوا، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑا ریس (قباء کے قریب ایک باغ) پہنچ گئے۔“

میں دروازے پر بیٹھ گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قضائے حاجت کے بعد وضو فرمایا تو میں آپ کی طرف گیا تو دیکھا کہ آپ بڑا ریس کی منڈیر پر بیٹھے ہیں اور پنڈلیوں کو نکا کر کے کنویں میں لٹکایا ہوا ہے۔

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اور پھر واپس آ کر دروازے پر بیٹھ گیا۔ اور میں نے (دل میں) کہا کہ میں آج ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دربان رہوں گا۔“

اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

میں نے پوچھا ”کون ہے؟“  
انہوں نے فرمایا: ”ابوبکر۔“  
میں نے کہا: ”ٹھہریے۔“  
پھر میں گیا اور کہا:

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ ابوبکر، اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔“  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انہیں اجازت دے دو اور جنت کی خوش خبری (مجھے) دے دو۔“

چنانچہ میں آیا اور ابوبکر سے کہا: ”تشریف لائیے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔“

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اندر تشریف لائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منڈیر پر آپ کی دائیں جانب بیٹھ گئے اور اپنے دونوں پیر کنویں میں لٹکالیے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور اپنی پنڈلیاں ننگی کر لیں۔

میں پھر واپس آ کر (دروازے پر) بیٹھ گیا۔ اور میں (گھر سے نکلے وقت) اپنے بھائی کو وضو کرتا چھوڑ کر آیا تھا کہ مجھے خود ہی آ کر مل جائے گا۔ تو میں نے (دل میں) کہا:

”اگر اللہ تعالیٰ فلاں (یعنی اس کے بھائی) کے

ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اسے یہاں لے آئے گا۔“

اتنے میں کوئی شخص آیا اور دروازہ ہلانے لگا۔ میں نے کہا:

”کون ہے؟“  
اس نے کہا: ”عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔“  
چنانچہ میں نے کہا: ”ذرا ٹھہریے۔“  
میں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کو سلام عرض کیا اور کہا:

”یہ عمرؓ ہیں، اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انہیں اجازت اور جنت کی خوش خبری دے دو۔“  
لہذا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا:

”آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اندر آنے کی) اجازت اور جنت کی خوش خبری دی ہے۔“  
چنانچہ وہ تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منڈیر پر آپ کی بائیں جانب بیٹھ گئے اور اپنے دونوں پیر کنویں میں لٹکالیے۔

میں پھر واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور (دل میں) کہا: اگر اللہ تعالیٰ فلاں (یعنی اس کے بھائی) کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اسے (یہاں) لے آئے گا۔

اتنے میں ایک اور شخص آیا۔ اس نے دروازہ ہلایا تو میں نے پوچھا:

”کون ہے؟“  
اس نے کہا: ”عثمان بن عفان۔“  
میں نے کہا:

”اچھا ٹھہریے!“  
اور میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر اطلاع دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انہیں اجازت دے دو اور ایک بڑے (حادثے) کے ساتھ جو

انہیں پیش آئے گا، جنت کی خوش خبری سنا دو۔“

چنانچہ میں آیا اور ان سے کہا: ”تشریف لائیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ایک حادثے کے ساتھ، جو آپ کو پیش آئے گا، جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔“

چنانچہ وہ اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ ہوئی ہے (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں دونوں جانب جگہ نہیں ہے) پس وہ آپ کے سامنے دوسری جانب بیٹھ گئے۔

حضرت سعید بن مسیب (مشہور تابعی اور حضرت ابو موسیٰ سے روایت کرنے والے راوی) فرماتے ہیں کہ: ”میں نے اس سے ان کی قبروں کی تائید کی۔“

(یعنی ابوبکرؓ اور عمرؓ میں بھی اسی طرح ساتھ ہوں گے جب کہ عثمانؓ کی قبر الگ ہوگی۔)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: ”اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دروازے کی نگرانی کا حکم فرمایا۔“ اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جب خوش خبری سنائی تو انہوں نے اللہ کی حمد بیان کی اور فرمایا: ”اللہ ہی اس لائق ہے کہ اس سے مدد طلب کی جائے۔“

فوائد و مسائل:

1- اس حدیث کا تعلق باب سے واضح ہے کہ اس میں بھی خوش خبری دینے کا اثبات ہے۔

2- خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو، ان کے جنتی ہونے کی بشارت دے دی گئی۔ اس کے بعد ان کے ایمان میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

3- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بابت جس بلوے کی پیش گوئی فرمائی، وہ ان کی خلافت کے آخر میں پیش آیا، جب کہ عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے مکروہ اور بے بنیاد پردہ پیگنڈے سے متاثر فساد گردہ نے حضرت عثمان کا محاصرہ کر لیا اور بالآخر

# کتاب کہانی

سید رحیم

جسے ترتیب وغیرہ لیکن جو ”لہجہ“ ہوتا ہے وہ بہت مشق سے آتا ہے یا مشکل سے آتا ہے۔ جب کوئی انسان کسی دوسری زبان کے لہجے کو بھی پوری طرح سے اپنا لیتا ہے تو وہ واقعی میں کمال کرتا ہے۔ اتنے یہ کمال کر دکھایا تھا۔

رلتا کی مادری زبان مراٹھی تھی، قوی زبان ہندی اور مذہبی زبان سنسکرت اگر وہ ”کامیاب“ ہونے کے لیے اردو سیکھ سکتی ہیں تو اردو تو ہماری اپنی ”قوی“ زبان ہے۔ ہماری پہلی شناخت ہے۔ روز کے دو نئے لفظ ”مینے“ کے ساتھ لفظ بننے ہیں۔ نوے دنوں میں ایک سوامی الفاظ آپ کے پاس ذخیرہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ذخیرہ کسی خزانے سے کم نہیں اور اس خزانے کی چابی آپ کے پاس ہے۔ آپ کی سوچ اور عمل کے پاس۔

آج کی کتاب کہانی ”زبان کہانی“ کے ساتھ۔ میری پیاری زبان ”اردو“ کے نام۔

اردو: ہماری زبان اردو ”ایک قدیم زبان“ شور سنی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی ہے۔ جب کوئی زبان دم توڑ رہی ہوتی ہے یعنی ختم ہو رہی ہوتی ہے تو اس زبان میں سے کئی زبانیں ”کھڑی ہوئی“ کی صورت میں نکل کر آتی ہیں۔ اردو بھی وہی زبان تھی جو پہلے ”ہوئی“ تھی اور جس کے کئی نام تھے۔ پھر یہ سفر کرتے کرتے ’ہوئی‘ سے زبان بنتی چلی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ زبان مقامی زبانوں کے ساتھ مل کر پھلنے پھولنے لگی۔

اس زبان کا باقاعدہ آغاز دہلی اور اتر پردیش سے ہوا تھا۔ برصغیر میں نئے آنے والے مسلمانوں اور مقامی باشندوں (جن کی یہ بولی تھی) کے باہمی میل جول سے اس زبان میں عربی اور فارسی کے

رسول حمزہ قوف زبان کے بارے میں کہتے ہیں کہ

”میرے نزدیک زبانیں آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی حیثیت رکھتی ہیں اور میں یہ نہیں کہوں گا کہ تمام ستارے ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک بڑے ستارے کا روپ لے لیں۔ کیونکہ اس کے لیے تو سورج موجود ہے۔ لیکن سورج کے وجود کے بعد بھی یہ ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ستارے آسمان پر چمکتے رہیں۔ اور ہر آدمی کے پاس اس کا اپنا ستارہ ہو۔ مجھے اپنے ستارے یعنی اپنی مادری زبان سے محبت ہے۔ میں ارضیات کے ان ماہروں کی بات پر یقین رکھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی پہاڑی میں بھی سونے کی کان نکل سکتی ہے۔“

لٹریچرنگل سے ہمیں اپنے کریز کی تلاش میں آئی تھیں۔ چونکہ انہیں مراٹھی زبان آتی تھی تو ٹرین میں انہیں کسی نے مشورہ دیا کہ اگر وہ ہمیں ”کامیاب“ کا کارہ بننا چاہتی ہیں تو اردو سیکھیں۔

لٹریچرنگل نے اپنی کہی تھیں۔ انہوں نے اردو سیکھنی شروع کر دی۔ وہ اردو پڑھ نہیں سکتی تھیں، اس لیے ان کے جاننے والوں میں ایک مسلم قانون تھیں جن سے انہوں نے لفظ لفظ کر کے یہ زبان سیکھنی شروع کر دی۔ اور پھر ایسی سیکھی کہ لوگ یہ بھول ہی گئے کہ ان کی اصل زبان کون سی ہے۔ انہوں نے تلفظ ادائیگی زبان وییان میں ایسی مہارت حاصل کی کہ کوئی بھی ان کے گانے سن کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ لٹریچرنگل نے یہ زبان سیکھی ہے۔

آپ لٹریچرنگل کا کوئی بھی گانا سن لیں اور اپنا تلفظ ٹھیک کر لیں۔ ایسا لگتا ہے کہ لٹریچرنگل زبان کو لے کر پیدا ہوئیں۔ اسی میں پٹی برہیں اور یہی ان کی مادری زبان ہے۔ زبانیں بولنے سے آ جاتی ہیں یعنی لفظ

کر دیا گیا ہو، چنانچہ ہم کھراٹھے، گھبرانے والوں میں سب سے پہلا آدمی میں تھا۔ اس لیے میں اس باغ تک آ گیا اور (اندر داخل ہونے کے لیے) اس طرح سمٹ سکا گیا جس طرح لومڑی سٹپٹی سٹپٹی ہے۔ اور لوگ میرے پیچھے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے ابو ہریرہ!“ اور آپ نے مجھے اپنے دونوں جوتے دے کر ارشاد فرمایا:

”جاؤ میرے یہ دونوں جوتے ساتھ لے جاؤ، اس باغ کی دیوار کے باہر جو بھی ملے، جو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس پر اس کے دل میں پورا یقین ہو تو اسے جنت کی خوش خبری دے دو۔“ اور نبی (پوری) حدیث ذکر کی۔ (مسلم) فوائد و مسائل:

1- دل کی گہرائی سے اللہ پر ایمان رکھنے والا، اگر اس نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا ہوگا، تو وہ یقیناً جنت میں جائے گا، یا تو پہلے مرحلے ہی میں چلا جائے گا، اگر اللہ کی مشیت ہوئی، بصورت دیگر سزا بھگت کر جنت میں جائے گا۔ اس کا دائمی گھر جہنم نہیں، جنت ہی ہوگا۔

2- اس حدیث میں خوش خبری کے اثبات کے علاوہ مومن کے بہر حال جنتی ہونے کی نوید ہے۔

بدلہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کافر جب دنیا میں کوئی اچھا عمل کرتا ہے تو اسے اس کا بدلہ دنیا کی کچھ لذتوں میں سے دے دیا جاتا ہے (یعنی آخرت میں اسے کوئی صلہ نہیں ملے گا) لیکن مومن کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس کی نیکیوں کا آخرت میں (صلہ دینے کے لیے) ذخیرہ کر لیتا ہے اور دنیا میں اسے رزق اس کی فراہم برادری کی وجہ سے دیتا ہے۔“

آپ کو شہید کر دیا۔ رضی اللہ عنہا۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے۔

4- حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجرہ عائشہ میں اور حضرت عثمانؓ بقیع الغرقد (جنت البقیع) میں مدفون ہیں۔

یقین

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھے تھے، اور ہمارے ساتھ (لوگوں میں) حضرت ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

تو (اچانک) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان سے اٹھ کر چلے گئے اور ہمارے پاس واپس آنے میں آپ نے کافی دیر فرمائی تو ہم ڈر گئے کہ ہماری غیر موجودگی میں آپ کو قتل (شہید) نہ کر دیا گیا ہو اور ہم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اور میں سب سے پہلے گھبرانے والا تھا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلا، یہاں تک کہ میں انصار کے قبیلے بنو نجار کے باغ کی چار دیواری پر پہنچ گیا۔ میں اس کے ارد گرد گھومنا کہ مجھے کسی دروازے کا سراغ مل جائے لیکن مجھے کوئی دروازہ نہیں ملا، تاہم ایک چھوٹے سے نالے پر نظر پڑی جو باغ سے باہر ایک کنویں سے نکل کر باغ کے اندر جا رہا تھا۔ اور رنج چھوٹی سی نہریا (چھوٹے سے نالے کو کہتے ہیں)۔

میں اس میں سے سمٹ سنا کر اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مجھے دیکھ کر) فرمایا: ”ابو ہریرہ؟“ میں نے کہا: ”جی ہاں یا رسول اللہ!“ فرمایا: ”کیا بات ہے؟“

میں نے کہا: ”آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پس آپ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور واپسی میں آپ نے دیر فرمادی تو ہمیں ڈر محسوس ہوا کہ ہمیں آپ کو ہماری غیر موجودگی میں قتل (شہید) نہ

الفاظ داخل ہوئے۔ جس سے اس میں نکھار پیدا ہوا۔ کھڑی بولی کے نکھار کا یہ زمانہ ”اردو“ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ کھڑی بولی کے اس نئے اور کھرے ہوئے روپ کو ہندی ہندوی اور ریختہ کہا گیا۔ اور اسی کو بعد میں ”اردوئے معلیٰ“ پھر ”زبان اردو“ اور پھر ”اردو“ کہا گیا۔ یعنی وہ زبان جو ابتدا میں صرف ایک بولی تھی۔ وہ ترقی کرتے کرتے ایک اعلیٰ درجے کی زبان بن گئی اور ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک کہلانے لگی۔

یہ ہے ہماری اردو زبان کی طویل ترین کہانی کا مختصر سا جائزہ۔ آپ نے دیکھا کہ ہماری زبان نے کتنا لمبا سفر طے کیا ہے۔ یہ زبان راتوں رات ہی تکمیل کے مرحلے طے کر کے مکمل نہیں ہوئی بلکہ اسے صدیاں لگی ہیں۔

اکثر لوگ اس عام سی بات کو بھی نہیں جانتے کہ اردو چونکہ سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کے ملاپ سے بنی ہے تو ہماری زبان میں ان سب زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ پھر بھی لوگ اکثر شاعروں، ادیبوں وغیرہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ لوگ ہندی کے الفاظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ مجھے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ میں فارسی کا استعمال بہت کرتی ہوں۔ تو مجھے یہ بتانا ہے کہ یہ سب الفاظ ہماری اپنی زبان ”اردو“ کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ ہماری زبان ان زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے۔

تو یہ جو ہماری زبان ہے اردو یہ عام زبان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو جو اتنا طویل سفر کرایا ہے۔ اسے وقت کے ساتھ ساتھ نکھار، پھر اس کے لہجوں کو سنورا، تو اس میں کوئی راز ہی تھا۔ یہی کہ چند صدیوں بعد ایک قوم اور ایک ملک وجود میں آئے گا۔ یہ زبان اس قوم کو جنھیں میں دی جانے گی۔

”ہماری زبان اردو“ اس کی ابتدا کا فیصلہ آسانی تھا اور اس کی تکمیل کا بھی۔ ماؤزے تنگ چین کے عظیم لیڈر تھے جن کی وجہ

سے چین نے حیران کن ترقی کی۔ ماؤزے تنگ انگلش زبان کو پوری طرح سے سمجھتے تھے۔ لکھ پڑھ اور بول سکتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں انگلش میں لطیفہ سنایا گیا تو وہ خاموش بیٹھے رہے جیسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ لیکن جب لطیفہ کو چینی زبان میں ترجمہ کر کے انہیں سنایا گیا تو وہ دل کھول کر ہنسے۔ انگلش میں لطیفہ سمجھ لینے پر بھی وہ انجان بن کر نہیں بلکہ اپنی قومی غیرت کو بلند کر کے بیٹھے رہے تھے۔

”جان من! چین کو گناہ نہیں ہے۔“ (یعنی

ہمارے پاس ہماری زبان ہے ہم کسی دوسرے کی زبان میں بات کیوں کریں)

ان کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا۔ ساری دنیا نے ماؤزے تنگ کی اس انقلابی سوچ کو سراہا جو قومیں اپنی زبان پر کسی بھی وجہ سے شرمندہ ہوتی رہی ہیں انہیں اس مقولے سے روشناس کروایا گیا۔

اب آپ مجھے بتائیں کہ کیا پاکستان گوٹا ہے؟ ہاں تو کیسے؟

نہیں..... تو کیسے نہیں کیونکہ شواہد کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔

اپنی زبان کے لیے سب سے زیادہ غیرت مند فرانس کے لوگ مانے جاتے ہیں۔ کچھ انگریزوں اور امریکیوں سے ان کی تھوڑی تھنی ہوئی ہے اس لیے کچھ وہ اپنی زبان کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں اس لیے بھی۔ ایک فرانسیسی سے کہا گیا کہ وہ دنیا کے بہترین ملکوں زبانوں ”لباس“ ثقافت“ وغیرہ کی درجہ بندی کرے۔

اس نے کہا کہ دنیا کا سب سے بہترین ملک فرانس ہے۔ بہترین زبان فرانس ہے۔ غرض اس نے پہلے نمبر پر اپنے ملک کی ہر چیز کو نکھار دوسروں کو اپنے بعد میں رکھا۔ آپ کہیں گے اس کی جگہ آپ بھی ہوتے تو یہی کرتے.....

کیا واقعی؟؟ ہم اس کی جگہ ہوتے تو ہم ایسا کیسے کرتے؟

کیونکہ ایسا کرنے کے لیے ہمارے پاس ثبوت کا ہونا ضروری تھا۔ میں جینز پہن کر یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ دنیا کا سب سے خوب صورت لباس میرا لباس ”شلوار قمیص“ ہے۔ میں جامنی کو پر پل اور ستاروں کو اشارزہ کرتی ہوں تو میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ دنیا کی سب سے خوب صورت زبان اردو ہے؟ میں یہ سبھی نہیں مار سکتی۔ ایسی شے صرف وہی انسان مار سکتا ہے جو پوری طرح سے اپنی زبان بولتا ہے۔ اپنی ثقافت میں جیتا ہے۔

مجھے دنیا کی کوئی زبان ناپسند نہیں ہے لیکن مجھے

اپنی زبان سب سے زیادہ پسند ہے۔ دنیا کی سب زبانیں خوب صورت ہیں لیکن میری زبان اردو سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ کیونکہ یہ ”میری“ ہے۔ ”میں“ فخر ہونا چاہیے کہ ہم اور ہمارا ملک ”گوٹا“ نہیں ہے۔ اس زبان کا لب و لہجہ دل موہ لینے والا ہے۔ اس کے لہجہ اور انداز اتنے پیارے ہیں کہ عام بول چال میں بھی اس پر شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ ہماری زبان کے پاس احترام ”آپ“ میں اور ”بے تکلفی“ تم“ میں ہے۔ اس زبان کے پاس ایسے بے شمار منفرد الفاظ موجود ہیں جو شاید ہی کسی اور زبان کے پاس ہوں۔

گلوں میں رنگ بھرنے، بادلوں بہا رہے چلے چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔ مندرجہ بالا اور مندرجہ ذیل دونوں اشعار پڑھیں اور دیکھیں کہ ہماری زبان کتنی خوب صورت ہے۔ اس میں کیسے سُر تال اور سارنگیاں بولتی ہیں۔

فرض کرو یہ جی کی بیچتا جی سے جو سنائی ہو فرض کرو ابھی اور ہوائی آدمی ہم نے چھائی ہو قومی اور مادری زبان وہ تھنہ ہوتا ہے جو کسی بھی انسان کو پیدائش کے وقت ملتا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان اسے ٹھکراوے تو وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ہم سب کفرانِ نعمت کر رہے ہیں۔ اگر میں پڑھے لکھے یا ہائی فائی لوگوں کے

گروپ میں ”شام خیر“ کہتی ہوں تو مجھے حیرت سے کیوں دیکھا جاتا ہے؟ انہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ مجھے ”گڈ ایونگ“ کہنا چاہیے تھا اور نہ اپنا منہ بند رکھنا چاہیے تھا۔ یا مجھے ”میں“ مسٹر یا سر کا راجا جانا چاہیے لیکن ”محترم یا محترمہ“ نہیں۔ کیوں؟ کیونکہ یہ الفاظ پرانے ہو چکے ہیں۔ یہ ٹرینڈ میں نہیں ہیں۔ زبانیں ٹرینڈ میں نہیں ہوتیں وہ فرد کے ذریعے ”زندہ“ ہوتی ہیں۔ اگر وہ مردہ ہونے لگیں تو ”پرانی“ ہونے لگتی ہیں۔

ہماری زبان کسی فیشن کا حصہ نہیں ہے کہ فیشن بدلے گا تو یہ بھی بدل جائے گی۔ زبان تو شناخت

ہوتی ہے، فخر ہوتی ہے۔ تمنہ ہوتی ہے۔ اسے فخر سے سر کا تاج بنایا جاتا ہے، سینے پر سجایا جاتا ہے۔ سینہ ٹھونک کر کہا جاتا ہے کہ یہ ہے ہماری زبان اور ہم گوئے نہیں ہیں۔

”کیا ہم اپنی زبان پر شرمندہ ہیں؟؟ اگر ہاں تو کس لیے؟؟ اگر نہیں تو پھر مجھے ہر طرف اردو کی جگہ کوئی تیسری زبان کیوں نظر آتی ہے۔ میں اردو ادب کے نام پر ہونے والی کالفرنس میں جاتی ہوں اور وہاں انگلش میں بات ہوتی ہے۔ پیچھے تبصرے، تنقید، آراء سب کچھ۔ سننے والے سب پاکستانی ہوتے ہیں۔ بولنے والے بھی۔ جن کتابوں پر بات کی جاتی ہے وہ بھی اردو کتب ہوتی ہیں۔ سب کچھ موجود ہوتا ہے لیکن وہاں کہیں ”اردو“ موجود نہیں ہوتی۔

اس دور کے والدین اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ وہاں ہم انہیں علم کے لیے کم اور ”انگلش“ کے لیے زیادہ بھیجتے ہیں۔ آپ مائیں یا نہ مائیں لیکن یہی سچ ہے۔ والدین بچوں سے گھر میں انگلش میں بات کرتے ہیں۔ انہیں ایک ایک چیز کا نام انگلش میں بتاتے ہیں۔ میں نے ایسے والدین بھی دیکھے ہیں جو مہمانوں سے خاص طور پر یہ کہتے ہیں کہ پلیز ہمارے



بچوں سے صرف انگلش میں بات کریں، اردو میں بات کر کے انہیں کنفیوز نہ کریں۔ (میں ایسے موقعوں پر خاموش رہنا پسند کرتی ہوں)۔

ترقی کے لیے کامیابی کے لیے اس زبان کی سیرھی کا استعمال ٹھیک ہے۔ یہ ایک گلوبل زبان ہے۔ یہ زبان آئی چاہیے۔ لیکن برائے مہربانی اس سب ٹھیک میں اپنی قومی غیرت کا گلا نہ گھونٹیں۔ میں ایک پاکستانی سے بات کرنے کے لیے اردو میں خط لکھنے کے بجائے انگلش میں کیوں ہتھی ہوں؟ یہی کیوں ضروری ہے کہ میری فیس بک پوسٹ میرا بیان میرے خیالات، میری ڈائری سب کچھ انگلش میں ہونا چاہیے۔ ہماری اردو کہانیوں کو پڑھ کر ہمیں

انگلش میں تبصرے موصول ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس زبان کے استعمال پر اطمینان محسوس نہیں کرتے، ہم شرمندہ ہوتے ہیں تو اب تک بھی ہم نے اسے کیوں اپنایا ہوا ہے؟

دنیا میں کچھ ممالک ایسے ہیں جنہیں کوئی دوسری تیسری زبان چھوڑ بھی نہیں گزری۔ پھر بھی یہ ممالک ترقی یافتہ ہیں۔ جیسے چین، جرمنی، جاپان، شمالی امریکا، افریقہ وغیرہ کے بہت سے ملک۔ اب ان ملکوں میں سیاح بہت جاتے ہیں لیکن پھر بھی ان ملکوں کی سڑکوں اور ایسی ہی دوسری جگہوں کے نام "ان کی اپنی زبان" میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

کئی ملک ایسے ہیں کہ پورے ملک کا سسٹم ہی ان کی اپنی زبان میں ہے۔ لیکن پھر بھی ان ملکوں نے ترقی کی ہے اور بہت زیادہ کی ہے۔ ہمارے یہاں جو انسان پڑھا لکھا بھی نہیں ہے وہ بھی بیس تیس الفاظ انگلش کے بول ہی لیتا ہے لیکن ان ملکوں میں ایسے لوگ ہیں جو بہت پڑھے لکھے ہیں اور وہ مشکل سے انگلش کے چار پانچ لفظ جانتے ہیں۔

جاپان اس کی زندہ اور سب سے عظیم مثال ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اور خاص طور پر "ایٹم بم" کے دھماکے کے بعد جاپانیوں نے عہد کر لیا تھا کہ

وہ ہمیشہ پر امن رہیں گے۔ ابھی کسی طرح کی جنگ میں نہیں کودیں گے۔ وہ کام، کام اور بس کام کریں گے۔ جنگ کے بعد سارا جاپان اجڑ کر تباہ چکا تھا۔

جاپان کی کمرٹھ چکی تھی۔ ایسا سمجھ لیں جاپان کوڑے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ لیکن ایسا ہوا کہ جاپانیوں کے پاس جو کچھ تھا۔ جو کچھ اپنا تھا، انہوں نے اس کے بل بوتے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ تین عشروں کے بعد دنیا بھر سے لوگ بھر بھر کر جاپان جانے لگے، ان کی چکا چوند ترقی کا راز جاننے کے لیے۔ ان کی ترقی کا راز تھا۔ "قومی غیرت"۔

ان کا ملک، ان کی ثقافت، ان کی زبان، ان کے اصول، ان کا اخلاق، ان کا اپنا "قاعدہ"۔

آج ساری دنیا جاپان کی ترقی کا ان کا اپنے ہاتھوں سے لکھا ہوا "قاعدہ" پڑھ رہی ہے۔

میں ایک ایسے کوئین کو جانتی ہوں جو فخر سے اپنی زبان اپنیشن (ہسپانوی) بولتا ہے۔ جب مجھے اس سے بات کی ضرورت پیش آتی تو اس نے کہا کہ میں ٹرانسلیٹر کا استعمال کروں۔ اور اپنی زبان کو اس کی زبان اپنیشن میں ترجمہ کر کے اس سے بات کروں۔ میں نے کہا سب کو انگلش آتی ہے، آپ کو کیوں نہیں آتی تو اس نے کہا کہ "یہاں کسی کو انگلش نہیں آتی۔ مجھے میری زبان اپنیشن آتی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔"

طے یہ پایا کہ ہم باری باری اپنی اپنی زبان میں بات کریں گے۔ ابھی اپنیشن ترجمہ ہوئی اور ابھی اردو۔ لیکن میں یہ خوشی حاصل نہیں کر پائی کہ کوئی غیر ملکی مجھ سے میری زبان میں بات کرے کیونکہ ٹرانسلیٹر اس کی زبان کا ترجمہ تو بہت اچھی طرح سے کر رہا ہے لیکن میری کمی نہیں۔

جن قوموں نے ترقی کی انہوں نے اپنی زبان کو بھی ترقی دی، اور ان چیزوں کو بھی جن میں ان کی زبان استعمال ہوتی تھی۔ ظاہر ہے اب غیر ملکی انٹرنیٹ کمپنیوں یا ایپ کمپنیوں کو کیا مصیبت پڑی ہے

کہ وہ "اردو ٹرانسلیٹر" بنائیں۔ فرض تو ہم پر ہے کہ ہم ایسا ٹرانسلیٹر بنائیں جو ہماری زبان کو دنیا کی کسی بھی دوسری زبان میں بہترین انداز میں ترجمہ کر سکے اور وہ ان لائن میسر بھی ہو۔

میں اس بات پر بحث کر رہی نہیں رہی کہ ہمارے اسکولوں، نصاب، حکومتی سطح اور دفتر میں غیر ملکی زبان کیوں استعمال ہوتی ہے۔ میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں یا آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ ہمارے دلوں میں اردو کیوں نہیں ہے؟ ہماری زبان اسے بولتے ہوئے پہچانی کیوں ہے؟

دنیا کی کوئی بھی زبان جو سکھی جاتی ہے وہ کسی خاص مقصد کے تحت سکھی جاتی ہے۔ آپ بھی زبانیں سیکھیں لیکن مقصد کے لیے۔ یہ ترقی میں مددگار ثابت ہوتی ہیں تو انہیں ترقی کے لیے ہی استعمال کریں اپنی زبان کو کمتر ثابت کرنے کے لیے۔

ایک غور طلب بات ہے کہ اردو کے بہت سے الفاظ ہم سب نے مل ملا کر پرانے کر دیے ہیں۔ انگلش زبان کا لفظ ٹھیک ہو ہماری پوری کی پوری زبان سے زیادہ پرانا ہے۔ لیکن آج بھی یہ لفظ بہت شوق سے ادا کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ زندہ بھی ہے اور تروتازہ بھی۔ لیکن ہمارے یہاں اردو بولنے والوں کو "بونا پتلون، محترم، جامنی، جھنڈی" وغیرہ کہتے ہوئے بڑا پرانا پن محسوس ہوتا ہے۔

اگر بڑوں نے اپنی زبان نہیں چھوڑی اس لیے ان کی زبان آج بھی زندہ اور تروتازہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ٹرانسلیٹر کے وقت کی انگلش اور آج کی انگلش میں بہت فرق ہے لیکن یہ فرق ان کی زبان کا ان کی زبان سے آیا ہے۔ اس میں کوئی تیسری یا چوتھی زبان آکر شامل نہیں ہوگی۔ زبانیں دوسری زبانوں کا اثر لیتی ہیں۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوتی۔ لیکن تب برا ہوتا ہے جب اثر لیتے لیتے زبان خود کو پوری طرح ختم ہی کر لیتی ہے۔

آپ شکر یہ کی جگہ ٹھیک ہو کہہ لیں۔ سیاہ کو

بلیک، کرسی کو چیئر۔ لیکن یہ یاد رکھیں، آج ہم تین لفظوں کو زبان سے نکالیں گے تو کل وہ تیس ہو جائیں گے۔ پرسوں تین سو۔ اور تیس چالیس سالوں کے بعد وہ "تین چار سو" الفاظ بنیں گے جو اردو کے ہوں گے۔ باقی ساری زبان "انگلش" میں دھل چکی ہو گی۔ اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو جہاں آپ بیٹھے ہیں وہاں سے ایک ایک چیز کا نام لینا شروع کریں۔ اور ان میں کہ کتنی چیزوں کے نام آپ اردو میں لے ہی نہیں سکتے یا لیتے ہی نہیں۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم اپنی زبان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔

اتصل کے پاس کہانیاں آتی ہیں اور وہ ان میں موجود گرامر، زبان و بیان کی غلطیاں درست کر کے انہیں شائع کر دیتی ہیں۔ وہ بھی کبھی کسی سے یہ نہیں کہتیں کہ تمہاری کہانی میں گرامر اور زبان و بیان کی اتنی غلطیاں تھیں۔ انہیں ٹھیک کر دو۔ یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے۔ نئے لکھنے والے مجھ سے اس خوبی کی امید نہ رکھیں۔ میں صاف صاف آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ اپنی اردو ٹھیک کریں۔ زبان و بیان درست کریں۔ روز کے دو لفظ سیکھیں۔ اگر واقعی میں آپ نے کوئی کمال کرنا ہے تو اپنی زبان کو آج سے ہی سیکھنا شروع کر دیں۔ زیادہ فخر اور زیادہ ذمہ داری سے۔ آپ کو ان لوگوں میں شامل نہیں ہونا چاہیے جو فخر سے کہتے ہیں کہ "ہمیں تھوڑی سی اردو" آتی ہے۔ آپ کو تھوڑی سی اردو نہ آئے لیکن پوری سے کچھ کم ضرور آتی چاہیے۔ میں پاکستانی ہوں جو زبان اتنا طویل سفر طے کر کے مجھ تک آئی ہے، وہ زبان میری ذمہ داری ہے، آپ بھی اپنی ذمہ داری نبھائیں اور اس زبان کو اور ترقی دیں۔ دنیا کی خوب صورت ترین زبانوں میں شمار ہونے والی زبان "اردو" کو زبان ہی رہنے دیں اسے دھکیل کر پھر سے بولی نہ بنا دیں۔ جس کی کھیل کا فیصلہ آسانی تھا، اس کی بربادی کا فیصلہ زمین پر نہ کریں۔

☆

س ”شادی کب ہوئی؟“  
ج ”15 اپریل ماہ رجب جمعہ المبارک 2016ء“

س ”شادی سے پہلے مشاغل؟“  
ج ”گھر کے کام کاج - بھائیوں کی ذمہ داری - صفائی ستھرائی - ڈائجسٹ پڑھنا - کتابیں پڑھنا - ٹی وی دیکھنا۔“

س ”رشتے میں مرضی؟“  
ج ”ہم سے مرضی پوچھی ہی کب گئی تھی - ویسے ہمارے بلوچی ماحول میں عورتوں سے پوچھا نہیں جاتا سراسر والدین کی رضائے رشتہ طے ہوا۔“

س ”جیون سا بھی کے حوالے سے تصور؟“  
ج ”با اخلاق - خوش گفتار - مہذب - نمازی، دین دار پر جو ماں باپ نے چُنا تھا - دل جان سے قبول کیا تھا اسی وقت۔“

## جب تجھ سے نکلا جوڑا ہے

ع - ۲



س ”دماغی کتنا عرصہ چلی؟“  
ج ”پانچ سال۔“

س ”شادی کے لیے قربانی؟“

ج ”کوئی نہیں - بس اللہ کی طرف سے اور بڑوں کی مرضی سے رشتہ طے ہوا۔“  
س ”رسموں پر کوئی جھگڑا؟“  
ج ”جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔“

س ”شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟“  
ج ”دیکھ کر ماشاء اللہ کہا اور شروع ہو گئے نصیحتیں کرنے - ایسا کرنا دوسرا کرنا - میرے ماں باپ بہن بھائیوں کا خیال رکھنا وغیرہ وغیرہ۔“

س ”شادی کے بعد تبدیلی؟“  
ج ”بہت زیادہ آئی بلکہ لائی گئی زبردستی وہ ایسے کہ اپنی پسندنا پسند چھوڑ کر ان کی پسند کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑا اگر میں پسندنا پسند کا اظہار کرتی تو ہر فرد طنز اور مذاق پر اُتر آتا - اس لیے خاموشی سے ویسے بدلتی گئی جیسوہ لوگ چاہتے تھے۔“

س ”کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“  
ج ”شادی کے تیسرے دن کھیر پکائی - چوتھے دن امی والوں نے دعوت دی - پانچویں دن کام شروع کیا تقریباً سارا کام سوائے سائن کے وہ میری ساس نے آج تک پکائے نہیں دیا کیونکہ سر صاحب کی اجازت نہیں - وہ میری ساس کے ہاتھ کے علاوہ کسی کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاتے - ایک دن ساس کی غیر موجودگی میں سائن بنایا اور تحفہ خوب ساری گالیاں ملیں۔“

س ”میکے اور سسرال کے کھانے میں فرق؟“  
ج ”کچھ خاص نہیں - بس سادہ سا کھانا ہاں مگر کھانا کھانے میں یہ فرق تھا کہ میکے میں سب کی پسندنا پسند کا خیال رکھا جاتا اور سب اپنی مرضی سے کھاتے ہیں - جبکہ یہاں ساس اپنی مرضی سے جودل چاہتا منگوا کے پکائی اور اپنے ہاتھ سے دیتی ہیں بھلے کسی کے لیے کم ہی نہ ہو اور اپنی تعریف خود ہی سب

سنے زیادہ کرتی اور گھر والے بھی رطب اللسان ہوتے اور دوسرے لوگوں پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔“  
س ”سسرال میں کس بات پر حریف، تنقید ہوئی؟“

ج ”تعریف تو یاد نہیں - تنقید بے حد اور بے شمار ہوئی - بیٹھنے اٹھنے سونے جاگنے کام کرنے غرض ہر چیز پر تنقید کا سامنا ہوا ہاں مگر شوہر ہمیشہ تعریف کرتے ہیں سامنے اور اگر کبھی کبھار گھر والوں کے سامنے کرتے ہیں تو رد کی جاتی ہے - پر میرے شوہر ہمیشہ میرے کام کو سراہتے ہیں دل سے کیونکہ میرے میکے والے بھی مجھے ہر کام میں ماہر گردانتے تھے اپنی تعریف نہیں کر رہی سب کہتے تھے۔“

س ”سسرال سے وابستہ توقعات کہاں تک پوری ہوئیں؟“  
ج ”ہم توقعات .....؟ جب تک منافقت کا پردہ نہ ہٹا اور میری آنکھوں سے تصوراتی پٹی نہ کھلی لگتا تھا میری تمام توقعات توقع سے زیادہ پوری ہوئیں (کیونکہ میری ساس میٹھی چھری تھیں اور وہ جیسا کہتیں سب ویسا ہی کرتے) آہستہ آہستہ حقیقت واضح ہوئی اور مکررہ صورتحال سامنے آئیں اور پھر لگا میں کہاں پھنس گئی جہاں کوئی سننے والا نہیں - سب بولنے اور زیادہ بولنے - لڑنے جھگڑنے کے شوقین۔“

س ”پہلے بچے کی پیدائش؟“  
ج ”دوسرے مہینے ابارشن ہوتے ہوتے بچا اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ اتنی تکلیف کے بعد بھی بچا رہا - میرے رب کی مہربانی ہے پورے آٹھ ماہ کے بعد بچہ ہوا اور اتنا عرصہ میں نے جیسے گزارا - مجھے پتا ہے کنواری نندیں بھی ان ڈائریکٹ طعنے دیتیں اللہ کا شکر ہے بس دعا کریں۔“

س ”سسرال میں مقام؟“  
ج ”ابھی تک تو دوسرا درجہ ہی ملا پہلا درجہ ساس اور نندوں کو حاصل ہے - چھوٹی نندی بھی ایسے علم چلائی ہیں جیسے میں باندی غلام ہوں۔“

س ”سسرال میں مقام؟“  
ج ”ابھی تک تو دوسرا درجہ ہی ملا پہلا درجہ ساس اور نندوں کو حاصل ہے - چھوٹی نندی بھی ایسے علم چلائی ہیں جیسے میں باندی غلام ہوں۔“

س ”میکے اور سسرال میں فرق؟“  
ج ”فرق بہت زیادہ محسوس ہوا - میکے میں ہر چیز اپنی اور اپنائیت تھی - دو غلامین اور مقابلے بازی نہیں تھی جب کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے حتیٰ کہ اپنی چیزیں بھی اپنی مرضی سے استعمال نہیں کر سکتی چائے تک ساس اپنے ہاتھ سے نکال کر دیتی ہیں - آدھا کپ سردیوں میں بھی کبھار پورا کپ پینے کی خواہش ہوتی ہے تو خواہش ہی رہ جاتی ہے اور سب کے سامنے کہتی ہیں کہ

”سب کچھ بڑی بہو کا ہے اور اس کے ہاتھ میں ہے - ہمارا کیا ہے - گھر بھی اس کا ہم بھی اس کے -“ میکے میں سب ساتھ ساتھ تھے - دوستانہ ماحول تھا - بھابیوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ اور یہاں سب نے مل کر مجھے تیار کر دیا - کوئی بات ہوتی آغاز ان میں کسی ایک سے ہوتا ہے اور سب مل کر مجھے سناتے ہیں کوئے گالیاں طعنے جھگڑا طول پکڑ جاتا ہے اور غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی سب سے آخر میں مجھے معافی مانگنی پڑتی ہے۔

کبھی عید پر جب نند شاپنگ کے لیے جاری تھی - میں نے کپڑوں کے لیے شوہر سے ایک ہزار مانگا اور سب شروع ہو گئے ساس صاحبہ نے پورا ایک گھنٹہ جھگڑا کیا - دیوروں نے کوئے طعنے دیے نندوں نے الگ اور پھر ساس صاحبہ بے ہوش ہو گئیں - میں اس سب میں کھلے منہ اور کانپتے جسم کے ساتھ حیران پریشان کھڑی رہی اور جب ساس ہوش میں آئیں تو شوہر کے کہنے پر معافی مانگنی پھر بڑی مشکلوں سے اپنے اتنے بڑے کیرہ گناہ کی معافی ملی - شادی سے پہلے یہی ساس نندیں واری صدقے جاتیں - مہنگی اور عمدہ شاپنگ کر کے لاتیں اور اب آخر یہ سارے مکررہ چہرے صرف مجھ پر عیاں ہوئے ہیں - دوسرے ان کی خوش اخلاقی کے گرویدہ ہیں جو سب کے سامنے منہ پر ہوتی ہے جیسے وہ دور ہوتے ہیں - ان کی غیبتیں شروع ہو جاتی ہیں میں پہلے والے حالات اور بعد والے خیالات دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں۔“

## جب تجھ سے نکاح چاہے

ع-ط

سوال:- ”شادی کب ہوئی؟“

جواب:- ”12 اکتوبر 1978ء“

سوال:- ”شادی سے پہلے کے مشاغل؟“

جواب:- ”مشاغل نہیں، مشغلہ صرف اور

صرف پڑھنا، شاید ہی کوئی رسالہ چھوڑا ہو۔ زندہ می ہارر ناول تھا۔ ساتویں کلاس میں تھی جب نصاب کی کتاب کے اندر چھپا کر کلاس میں بیٹھ کر پڑھا۔ اردو ڈائجسٹ سے لے کر اخبار جہاں، سنسری میگزین، عمران ڈائجسٹ سب پرچے پڑھے اور بریک لگی شعاں اور خواتین پڑھ کر۔“

ہم نے جس جس کو چاہا تیرے بھراں میں وہ لوگ آتے جاتے موسم تھے، زمانہ تو تھا سوال:- ”رشتے میں مرضی؟“

جواب:- ”سولہ سال کی عمر میں شادی ہوئی، ڈھائی سال کا عرصہ منگنی کا۔“

تو خود ہی اندازہ لگائیں۔ اتنی عمر میں اور اتنے پرانے دور میں مرضی پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر بھی اتنا عرصہ منگنی رہے تو مرضی شامل ہو ہی جاتی ہے۔ طارق میرے ماموں زاد تھے۔ ظاہر ہے، اتنا قریبی رشتہ تھا تو شادیوں وغیرہ آنا سامنا ہو جاتا تھا، پھر سارے کزنز مل کر وہ شہر کرتے کہ پوچھیں مت۔ لڑکیاں مجھے چھپانے میں لگی رہتیں اور لڑکے ان کے ساتھ مل کر آ کر خراخرا دھوٹ ہی لیتے۔ بس اسی لگاچھپی میں ایسی محبت ہوئی، ساری زندگی ایک دوسرے کے بغیر جینا محال تھا۔“

سوال:- ”منگنی کتنا عرصہ رہی؟“

جواب:- ”منگنی کا عرصہ ڈھائی سال پر محیط تھا۔“

سوال:- ”شادی کے لیے قربانی؟“

جواب:- ”کوئی قربانی نہیں دینی پڑی، بس جو

رسالے یہ بانگ دہل پڑھا کرتی تھی، چھپ کر پڑھنے پڑے، کیوں کہ ماموں چونکہ امام مسجد تھے، گھر کا ماحول مذہبی تھا تو اتنی پابندی تو لگنی ہی تھی، مگر چار دیواری میں پسینے داڑھنے کی مکمل آزادی تھی۔“

سوال:- ”رسموں کے لین دین میں کوئی جھگڑا؟“

جواب:- ”ہمارے خاندان میں فرسودہ قسم کی رسمیں ہوتی تھیں تو جھگڑا کیسا۔“

سوال:- ”شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟“

جواب:- ”بس اپنے بارے میں اور سب گھر والوں کے بارے میں بتاتے رہے اور میں سوئی جا گئی کیفیت میں نلتی رہی۔“

سوال:- ”شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟“

جواب:- ”بہت خوش گوار تبدیلیاں آئیں۔ میں اپنے اسی ابو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ادھر ماشاء اللہ دس

بہن بھائی تھے جن میں سے تین مندریں اور دو جیٹھ شادی شدہ تھے اور سب چار چار بچوں کے والدین بن چکے تھے۔ جوائنٹ فمیلی تھی۔ مجھے تو بڑا مزہ آیا۔ اتنے ڈھیر سارے بھائی بہن مل گئے، مجھے تو لگتا تھا کہ جانے کس نیکی کے انعام میں مجھے یہ سب مل گئے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ نے میرا خیر ہی محبت کی مٹی سے بنایا تھا۔ سب سے بہت زیادہ محبت کی اور بہت زیادہ پائی بھی۔“

سوال:- ”کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“

جواب:- ”شادی کے ایک ماہ بعد میرا ہاتھ کھیر میں ڈلوایا گیا، بقر عید کی توای جان (ساس) نے دس منٹ کھیر میں چھچھوایا اور کہا۔ ”جاؤ جا کر سو جاؤ۔“ بس یہ کام تھا جو میں نے کیا۔ بعد میں بھی بہت عرصہ میں نے کام نہیں کیا۔ فمیلی بہت بڑی تھی۔ میکے میں تین لوگ اور سسرال میں تقریباً بیس لوگ تھے، چونکہ میں اکلوتی تھی۔ اس وجہ سے امی نے پھیلی کا کھانا بنا کر پالا تھا، تو میں ہلکے ہلکے کام کرنے کی عادی تھی

اور یہاں بڑے بڑے کام۔

جب میں نے پہلی مرتبہ کپڑے دھوئے تو میرے ہاتھ کپڑے دھونے والے صابن سے زخمی ہو گئے تھے۔ پوروں میں چھوئے چھوئے سوراخ ہو گئے جن سے خون رستا تھا۔ امی ہر آنے والے کو میرے ہاتھ دکھاتیں اور کہتیں۔

”دیکھو، آج ہماری دہن نے کپڑے دھوئے اور ہاتھ زخمی ہو گئے۔“

ہنڈیا میں بہت اچھی بناتی تھی، مگر وہ بھی بناتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ تقریباً سال بعد میں نے سارے کام سیکھے۔ میری چھوٹی دو دندیں کنواری تھیں، ہم نے بالکل بہنوں اور دوستوں کی طرح وقت گزارا اور میں نے اپنی بڑی پیاری بہن اور دوست (صدیقہ) سے سارا کچھ نئے سرے سے سیکھا۔ پھر بڑی بڑی دعوتوں کا کھانا بنایا اور اللہ کا شکر ہے بہت محبت اور تفریق پائی۔

سوال:- ”میکے اور سسرال کے کھانوں میں کیا فرق؟“

جواب:- ”کافی فرق تھا، کیونکہ میکے میں ہم تین لوگ تھے، ادھر فمیلی بڑی تھی اور پکانے والا ایک ہاتھ نہیں تھا۔ میں میری دو بھانیاں اور ایک نند (صدیقہ) یوں ہم چار لوگ باری باری ہنڈیا پکاتے تھے، ہر بندے کی چوتھے دن باری آتی تھی۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد کھانا کھایا جاتا تھا۔ اباجی چونکہ امام مسجد تھے۔ انہوں نے مسجد میں اٹھنا ہوتا تھا، تو وہ عشاء کی نماز کے فوراً بعد سو جاتے تھے، اس لیے مغرب کی نماز کے بعد وہ کھانا کھالیتے تھے۔ چاہے وہ کچا پکا ہی ہوتا، نمک کم ہوتا تو اور ڈال لیتے۔ اگر زیادہ ہوتا تو پانی ڈال لیتے غرض کہ کھانے کے معاملے میں ہمیں کبھی کچھ نہیں کہا جاتا اور میرا خیال ہے، جس گھر کے مرد کھانے کے بارے میں اتنے لاپرواہوں وہاں شادی ہنڈیا اچھی بنتی ہے۔“

سوال:- ”سسرال میں کن باتوں پر تعریف، تنقید ہوئی؟“

جواب:- ”تعریف اور تنقید دونوں ہی چلتی رہیں، ظاہر ہے پر فیٹ تو صرف اللہ کی ذات ہے۔

انسان میں لاکھ اچھائیاں ہوں، مگر کوئی ایک ہی بات ہے۔“

مجھے غصہ بہت جلدی آتا تھا، تو غلامانہ فطرت میں انسان کو خود پر کنٹرول نہیں رہتا تو تنقید کی۔ یہ فطرت یہ ہی رہی، مگر ایک بات تھی، اگر کسی کا دل، بھٹے دکھ جاتا تو فوراً معافی مانگ لیتی تھی۔ منانے میں بھی دیر نہیں کی۔ ہم پندرہ سال جوائنٹ فمیلی میں رہے اور ہمارے گھر کا ماحول اتنا اچھا تو تھا جو ہمارے گھر آتا۔ اس کا دل کرتا کہ وہ بیٹیں رہ جائے۔ گھروں میں تو سب ہی رہتے ہیں، ہم سارے ایک دوسرے کے دلوں میں رہتے تھے۔ مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ بہت سے لوگ دنیا سے جاتے ہیں، جن میں میرے شوہر بھی ہیں۔ میرا خیال ہے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو فطرتا برے ہوں گے، اگر بڑے محل اور بردباری سے کام لیں اور چھوٹے عزت و احترام ملحوظ خاطر رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ گھر خوشیوں کے گہوارے نہ ہوں، جیسا کہ کہتے ہیں۔

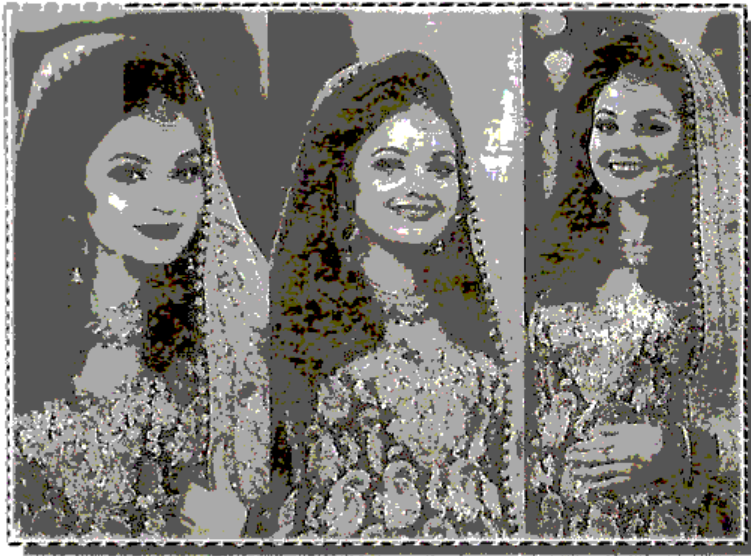
”سب سے بڑا غی وہ ہے جو اللہ کی تقدیر پر شاکر ہے۔“

اگر بندہ یہ سوچ لے تو پھر کبھی پریشان نہ ہو۔ مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ تجربہ یہی کبھی ہے جو انسان کو تب میسر آتی ہے جب سر پہ کوئی بال نہیں رہتا۔

سوال:- ”سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟“

جواب:- ”چھوٹی عمر میں شادی ہوئی۔ عقل بھی چھوٹی تھی۔ توقعات بھی چھوٹی اور بے ضرر تھیں۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے بہت پیار ملا اور مجھے لگتا ہے محبت سے بڑی دولت نہ ہے، نہ ہوگی، بس یہ ہی توقع رکھی تو اللہ کا شکر ہے کہ محبت ہم سفر رہی، کبھی ماں باپ کی صورت، کبھی بہن بھائیوں اور دیگر رشتوں کی صورت۔“

سب رشتوں کا جتنا مجھ پر حق تھا۔ اس سے بہت زیادہ ادا کیا یا وصول کیا گیا۔ اتنا کہ میں خالی دل، خالی ہاتھ رہ گئی۔ شوہر کے بے وقت موت نے جو قیامت ڈھائی۔ وہ علیحدہ اور رشتوں نے جو قیامت ڈھائی وہ



معروف فنکار

## عشائور سے ملاقات

شاہین رشید

”ہاں اور ملکہ“۔ ”میری ماں“۔ ”ڈبلیز“۔ ”وارث“۔ ”روگ“۔ ”ہونے لگا تم سے پیار“۔ ”بابا کی اونچی خوئی“۔ ”صحرا میں سفر“۔ ”بچاری مہر النساء“۔ ”میرا آنگن“ اور نور زندگی ایسے پروڈیوٹس تھے جو بہت زیادہ پسند کیے گئے اور ان سب میں میرا کام، میرے کردار بھی بہت اچھے تھے۔

”صحافیوں کو انٹرویو دینے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ صحافی کا کردار کرنا کیسا لگا تھا؟“

”بہت اچھا لگا۔۔۔ اور میرا یہ کردار پسند بھی کیا گیا۔ اور میرے اس کردار نے یا میری پرفارمنس نے میرے لیے مزید راستے ہموار کیے۔ فلم ”راستہ“ میں صحافی کے کردار نے مجھے خاصی شہرت دی۔“

”فلم ”راستہ“ میں تمہارا انتخاب کیسے ہوا؟“

”سار لوہی صاحب میرے بارے میں

معصوم اور مشرقی خدوخال کی خوب صورت اداکارہ عشائور ترقی کا راستہ آہستہ آہستہ طے کرتے ہوئے فلم میں کامیابیاں سنبھالنے کی منتظر ہے اور اپنی پہلی ہی فلم میں صحافی کا رول کر کے کافی حد تک فلم کے لیے اپنی جگہ ہموار کر لی ہے۔

”کیا حال ہیں عشائور؟“

”الحمد للہ۔“

”کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“

”مصروفیات کے بارے میں کیا بتاؤں۔۔۔ اس فیلڈ کی ہی مصروفیات ہیں۔ کچھ مکمل ہو چکے ہیں پروڈیکٹ کچھ ہونا باقی ہیں۔ اس لیے کچھ بتا نہیں سکتی۔“

”اب تک آن ایر کیا کیا آچکا ہے؟“

”آن ایر تو ماشاء اللہ بہت کچھ آچکا ہے۔ پھر بھی جو یاد ہیں، وہ آپ کو بتاتی ہوں۔“ خوشبو کا گھر

تو صبر ہی دے، کیونکہ میں بہت روتی تھی بچی کے لیے اور پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے صبر کی نعمت سے مالا مال کر دیا اور مجھے بچی کے لیے رونا بھول ہی گیا، کیوں کہ آگے جا کر میرے لیے صرف رونا ہی تھا۔

سوال:- ”جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟“

جواب:- ”جوائنٹ فیملی سسٹم ہی پسند تھا، کیونکہ ہم نے تو بہت اچھا وقت گزارا، مگر جب بیٹوں کی شادیاں کیں تو وہ بات نہیں بنی، جب تک میرے شوہر حیات رہے، سب ٹھیک تھا، مگر ان کے جاتے ہی جو کچھ ہوا۔ اس نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے۔ پھر بھی لکھوں گی، اس لیے کہ موضوع یہ نہیں۔“

سوال:- ”شوہر سے تعلقات؟“

جواب:- ”بہت ہی اچھے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، میں نے تو بھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“

توں اک پل وی ہے ریا اس  
او پل ہینا دی مشکل سی  
ہن اپنے چین تے حیرت اے  
کنوے تل تل کے اسی مرنے آں  
ترجمہ:-

”تم ایک پل بھی جو ناراض ہوئے  
وہ پل جینا کتنا مشکل تھا“  
”اب اپنے جینے پہ حیرت ہے  
کیسے تل تل کر رہے مرنے ہیں“  
اتنا پیار مجھے نہیں لگتا کہ آج کل ہو، آج تو عورت برابری چاہتی ہے، جب اللہ تعالیٰ نے مرد کا درجہ اوپر رکھا ہے اور عورت کی جنت اپنے شوہر کے قدموں میں ہے تو پتا نہیں یہ بات آج کی عورت کیوں سمجھ نہیں پاتی کہ جو حق اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے، اسے تسلیم کرے۔

عورت کا تہہ افضل ہے، ماں کے روپ میں۔

الگ، چونکہ ان باتوں کا اس سروے سے کوئی تعلق نہیں، روانی میں بات کہاں سے کہاں جا چکی، اس کے لیے معذرت۔

سوال:- ”سسرال میں وہ مقام ملا جس کی توقع تھی؟“

جواب:- ”سسرال میں مقام بنانا پڑتا ہے، جب میری شادی ہوئی تو میری دو جھنائیاں تھیں، بہت اچھی تھیں، مگر مجھے لگا کہ کچھ کمی ہے، سو جا جب میں جھنائی بنوں گی تو لوگ مثال دیں گے کہ جھنائیاں ایسی بھی ہوتی ہیں اور صد شکر کہ میں کامیاب رہی۔ میری دو دیورائیاں ہیں، بہت عزت کرنی ہیں۔ سب سے چھوٹی تو مجھے ماؤں جیسا مان دیتی ہے، حالانکہ مجھ سے صرف نو سال چھوٹی ہے، میرے شوہر کی وفات کے بعد صرف وہی نہیں بدلی، اللہ اسے جزا دے۔ (آمین)

سوال:- ”میکے اور سسرال میں فرق؟“

جواب:- ”میکے اور سسرال کا فرق کیا بتاؤں، بڑا تکلیف دہ ہے، سسرال کو چھوڑ کر میکے جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ سب سے اتنا پیار تھا کہ لگتا تھا میں سب کے بغیر جی نہیں پاؤں گی، مگر شوہر کے بعد یہی بات سمجھ میں آئی کہ۔۔۔۔۔

جب تک ہنسا گاتا موسم اپنا ہے، سب اپنے ہیں وقت پڑے تو یاد آ جاتی ہے سب کو اپنی مجبوری شوہر کا جانا ہی میرے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ بعد میں سب کا بدلنا اس سے بھی تکلیف دہ۔ شاید سب کے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے یا میں نے زیادہ محسوس کیا ہے۔

سوال:- ”پہلے بچے کی پیدائش؟“

جواب:- ”جی پہلے بچے کی پیدائش بہت بڑا مسئلہ بنا، پہلی مرتبہ مس کیرج ہوا۔ اس کے بعد بڑی دعاؤں کے بعد تین سال بعد میرا بیٹا ابوبکر پیدا ہوا۔ دوسرا بیٹا اس سے تین سال بعد ہوا، جس کا نام عمر فاروق رکھا۔ بیٹی اللہ تعالیٰ سے بہت مانگی۔ نہیں ملی، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ اگر بیٹی نہیں دینی





لیتی ہوں۔ ہر آفر پر بہت غور و خوض کے بعد ہاں کرتی ہوں۔۔۔۔۔ اور اگر آپ نے میرے ڈرامے دیکھے ہوں تو آپ نے خود محسوس کیا ہو گا کہ میں نے اب تک جتنے کردار کئے ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے اور آگے بھی آپ ہمیشہ مجھے مختلف رولز میں ہی دیکھیں گی۔“

”بھی تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟“

”سچ بتاؤں۔۔۔۔۔ لوگ مجھ پر تنقید کم اور میری حوصلہ افزائی زیادہ کرتے ہیں۔ کیونکہ اچھا کام سب کو نظر آتا ہے۔ اور مجھے خود بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں نے کہاں غلطی کی ہے اور پھر میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنی غلطیوں کو دور کروں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ اپنی غلطیوں پر نظر رکھتی ہیں؟“

”بالکل جی۔۔۔۔۔ میں اپنی نقاد اور اپنی استاد خود ہوں۔ میں اپنے ڈرامے دیکھتی ہی اس لیے ہوں کہ اپنی غلطیاں دیکھوں، اپنی پر فارمنس کی کمزوریاں دیکھوں اور پھر دور کرنے کی کوشش کروں۔“

”کیا اداکاری سیکھی جاسکتی ہے؟“

”بالکل سیکھی جاسکتی ہے اور لوگ سیکھتے بھی ہیں۔ میں لوگوں سے، ڈائریکٹر سے اور دوسروں کی پر فارمنس سے سیکھتی ہوں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ میں اپنے آپ سے سیکھتی ہوں۔ میں اپنی استاد خود ہوں۔ اور اپنے آپ سے بھی بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”عشما ماشا اللہ آپ اتنی ذہین ہیں۔ اپنی استاد بھی خود ہیں تو پروڈکشن یا ڈائریکشن کی طرف کیوں نہیں آ جاتیں؟“

”بہت دل چاہتا ہے کہ ”عشاور“ کے نام سے اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولوں۔۔۔۔۔ مگر اس کے لیے پیسہ۔۔۔۔۔ اور میں بہت جلدی اپنی اس خواہش کو پورا کروں گی، اور جب پروڈکشن ہاؤس بن گیا تو پھر ڈائریکشن کی بھی کوشش کروں گی کہ اس جانب بھی

”میرا تو خیال ہے کہ ہمارے ڈراموں کا معیار بہت عمدہ ہے۔ تب ہی تو بڑی ملک میں بھی ہمارا ڈرامہ بہت دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں ہمارا ڈرامہ بہت دیکھا جاتا ہے۔“

”دیگر جائز میں تو کہا جاتا ہے کہ محنت کریں۔۔۔۔۔ اداکاری میں بھی محنت ہوگی۔ مگر کس قسم کی؟“

”سب سے بڑھ کر آپ کو پورا اسکرپٹ پتا ہو کہ کیا ہے۔ کہانی کیا ہے۔ آپ کا کردار دوسروں کے ساتھ کتنا لکڑ (Linked) ہے پھر آپ کے کردار کی کیا ڈیمانڈ ہے۔ پوری دل جمعی سے کام کریں تو کامیابی یقینی ہے۔ ہم اچھا پر فارم کریں گے تو رائٹر اور ڈائریکٹر کو بھی خوشی ہوگی اور آگے مزید راستے کھلیں گے۔“

”آپ ڈراموں کے اچھے معیار کی بات کر رہی ہیں جبکہ ڈراموں کے موضوعات تو تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں؟“

”نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ آج کل تو بلکہ نئے نئے اور بولڈ موضوعات پہ ڈرامے بن رہے ہیں۔ پہلے کبھی بولڈ موضوعات پہ ڈرامے نہیں بنے تھے۔ کبھی کبھار ہی ڈرامے یکسانیت کا شکار لگتے ہیں مگر ہمیشہ نہیں۔“

”ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ اگر کوئی فنکار کسی ایک کردار میں مقبول ہو گیا ہے تو پھر اسے اسی طرح کے رول کی آفرز ہونے لگتی ہیں؟“

”بالکل ایسا ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ بے شک ایک اچھا رول فنکار کی پہچان بن جاتا ہے مگر اگر وہ مسلسل اسی انداز کے رول کرے گا تو اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ نہیں بلکہ کمی ہی آئے گی۔ اس لیے فنکار کو اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔“

”آپ احتیاط سے کام لیتی ہیں؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ میں تو بہت احتیاط سے کام

جیسے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے مارٹک شو میں بلایا اور پھر مجھے اپنی فلم کے لیے منتخب کر لیا۔۔۔۔۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح میرا انتخاب ہو جائے گا۔ جبکہ میں فلم کے لیے کئی آڈیشنز دے چکی تھی۔ تو میں ساحر لودھی بھائی کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے فلم میں کام کرنے کا موقع فراہم کیا اور میری صلاحیتوں پہ اعتبار کیا۔“

”انڈیا سے بھی یقیناً آفرز آئی ہوں گی؟“

”بالکل جی۔۔۔۔۔ جھوٹ نہیں بولوں گی۔ فلم ”راستہ“ سے پہلے مجھے انڈیا سے کئی فلموں کی آفرز آ چکی ہیں۔ لیکن وہاں کام کرنے سے پہلے مجھے یہ سوچنا ہے کہ میں ایک پاکستانی اور اسلامی ملک کی مسلمان لڑکی ہوں لہذا میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے میرے ملک پہ کوئی آج آئے یا میرے مذہب کے حوالے سے مجھ پر کوئی آج آئے۔۔۔۔۔ اگر ایسا کوئی کردار ملا جو میری شخصیت اور ملک کو نقصان نہ پہنچائے تو میں ضرور کروں گی۔“

”پاکستانی فلمیں ہیں آپ کے پاس؟“

”فی الحال تو کوئی فلم سائن نہیں کی میں نے۔ آج کل میری ساری توجہ ڈراموں کی طرف ہے اور کئی سیریز انڈر پروڈکشن ہیں۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی اچھا اور منفرد رول ملا فلم میں تو ضرور کروں گی ڈراموں کو ایک طرف کر کے۔“

”فلم اور ڈرامے میں کیا نمایاں فرق محسوس کرتی ہیں آپ؟“

”فہم۔۔۔۔۔ فرق تو صاف ظاہر ہے۔ فلم کی اسکرین سلور اسکرین کہلاتی ہے اور سب فلم میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ سب کا خواب ہوتا ہے فلم میں کام کرنا۔۔۔۔۔ اور دوسرا فرق یہ کہ ڈرامہ اقتباس پر مبنی ہوتا ہے فلم چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ فلم میں گانے، ڈانس اور ٹیگسی بہت ہوتی ہے۔ مجھے تو فلم ڈرامے سے ہر لحاظ سے مختلف ہی نظر آتی ہے۔“

”ڈراموں کے معیار سے آپ مطمئن ہیں؟“

”آؤں۔۔۔۔۔ کبھی ٹیلیو رول کیا؟“

”ہے کہ کس قسم کے رول کروں؟“

”میں تو ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں۔ جو میرے لیے ہونے چاہئے پہلے رول سے ملنے چلتے نہ ہوں۔ میں چیلنج رول کرنا چاہتی ہوں۔ اور اپنی صلاحیتوں کو مزید منوانا چاہتی ہوں۔ اور ایک نئے پروڈکشن کے لیے میرا ٹیکو رول ہے۔ جب وہ آن ایئر ہو گا تو آپ دیکھ کے بتائیے گا کہ کیسا رہا۔۔۔۔۔ عازہ خان اور عمران عباس اس میں لیڈ رول کر رہے ہیں۔ اگر اس رول میں مجھے میرے ناظرین نے پسند کیا تو مزید ٹیکو رولز کی آفر کو قبول کروں گی۔“

”کام کا مزہ کہاں ہے، کراچی یا لاہور؟“

”جہاں مزے کا کام ہو، وہاں ہی مزہ آتا ہے۔۔۔۔۔ ویسے میں کام کے سلسلے میں لاہور ایک ہی بار گئی تھی جیب ڈرامہ سیریل ”میں کون ہوں“ کی ریکارڈنگ تھی۔۔۔۔۔ اور بس۔۔۔۔۔ سارا کام تو کراچی میں ہوتا ہے۔ مجھے تو خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ پورا پاکستان اپنا

# دستک دستک دستک

شکایتیں



آمنہ الیاس  
”کیا حال ہیں؟“  
”اللہ کا شکر ہے۔“  
”ٹی وی اور فلم میں آپ بہت کامیاب ہیں۔  
لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مگر سنا ہے کہ آپ ملنا  
پسند نہیں کرتیں؟“  
”ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔  
درحقیقت میں فطرتاً بہت شرمیلی ہوں۔ زیادہ لوگوں  
کے سامنے بولنا مشکل لگتا ہے۔ بس یہی بات ہے۔  
ورنہ مجھے احساس ہے کہ آج جو کچھ بھی ہوں ناظرین  
کی وجہ سے ہی ہوں۔“

”فیلڈ میں آنا شوقیہ تھا یا اتفاقاً؟“  
”نہ شوقیہ نہ اتفاقاً۔۔۔۔۔ میں اس فیلڈ میں ضرورتاً  
آئی، ہمارے گھر کے حالات بہت اچھے نہیں تھے۔  
والد کا انتقال ہماری کم عمری میں ہو گیا تھا۔ لہذا گھر کی  
ساری ذمہ داری والدہ پر آ گئی تھی۔ جب میں تھوڑی  
باشعور ہوئی تو خیال آیا کہ مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے۔  
چنانچہ میں نے ماڈلنگ کی راہ اختیار کی اور اللہ نے  
مجھے کامیاب کیا۔“

”امید تھی کہ کامیاب ہو جائیں گی؟ اور والدہ  
نے کچھ اعتراض کیا؟“  
”مجھے معلوم تھا کہ راستے کٹھن ہوں گے  
ضروری نہیں کہ میں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جاؤں۔۔۔۔۔  
ہوسکتا تھا کہ مجھے کوئی پسند ہی نہ کرے مگر۔ اتنا ٹکٹو  
سوچتی تو شاید اس فیلڈ میں آئی ہی نہ۔۔۔۔۔ میں پوزیٹو  
سوچ کے آئی اور پوزیٹو ہی ہوتا چلا گیا۔ والدہ نے یہ  
ضرور کہا کہ تم ابھی کم عمر ہو۔ اعتراض اس لیے نہیں کیا  
کہ میری دو بہنیں بھی اس فیلڈ سے وابستہ تھیں۔۔۔۔۔  
بس پھر اللہ کی مدد شامل حال رہی اور سب کچھ ٹھیک ہو

”کیا۔۔۔۔۔“  
”کس نے متعارف کرایا؟۔۔۔۔۔ اور اس وقت  
آپ کی عمر کیا تھی؟“  
”مجھے اس فیلڈ میں عاکف الیاس صاحب نے  
متعارف کرایا۔ یہ ہمارے ملک کے ممتاز فوٹو گرافر  
ہیں۔ یہ ہمارے فیملی فرینڈ بھی ہیں۔۔۔۔۔ اس وقت  
میری عمر سولہ سال تھی۔ اور ماڈلنگ میری پہچان کا پہلا  
زینہ بنا۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں نے کافی لوگوں کے  
ساتھ کام کیا۔۔۔۔۔ اور میری امی کی سپورٹ نے مجھے  
بہت آگے تک پہنچایا۔“  
”لگتا ہے، آپ اپنی امی کے بہت قریب  
ہیں؟“

”جی۔۔۔۔۔ میں اپنی امی کے بہت قریب ہوں۔  
اپنی ہر بات سب سے پہلے اپنی امی کے گوش گزار  
کرتی ہوں۔ کیونکہ انہوں نے ہی مجھے بہت سپورٹ

میں کیا کیا کیا؟“  
”نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی دشواری نہیں  
ہوئی۔ بہ حیثیت چائلڈ اسٹار کے میں نے اس فیلڈ میں  
قدم رکھا اور بہ حیثیت چائلڈ اسٹار کے میرا پہلا ڈرامہ  
”میاں کا المیہ“ تھا جو کہ سٹ کام تھا اور میرے ساتھ  
بلال قریشی، تبسم عارف، اسماعیل تارا اور سلیم آفریدی  
جیسے سینئر فنکار تھے۔۔۔۔۔ پھر ایک پرائیویٹ چینل سے  
ایک سال بچوں کے پروگرام کی میزبانی کی، جس نے  
میری پہچان گروائی، اس کے بعد ایک سیریل ”کیا  
مبول ہے؟“ کیا۔ اس میں میرا کردار ایک دھمی اور مظلوم  
لڑکی کا تھا۔۔۔۔۔ اور میں جتنی ہوں کہ میرے ہوش کا یہ  
میرا بہترین کردار تھا۔“

”میرے خیال سے آپ کا ڈرامہ سیریل  
”روگ“ بھی آپ کے لیے ٹرنک پوائنٹ ثابت ہوا  
تھا؟“

”جی یہ میں نے 2011ء میں کیا تھا اور ٹرنک  
پوائنٹ تو نہیں، کیونکہ میں کہیں رکی نہیں۔۔۔۔۔ اللہ کا  
شکر ہے کہ میں جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں کام  
ہی کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ اور اب تو شو بزم کی ہر فیلڈ میں طبع  
آزما کر چکی ہوں۔ فلم، اداکاری، ماڈلنگ سب  
کچھ۔۔۔۔۔ بس اب پروڈکشن اور ڈائریکشن رہ گئی ہے۔  
وہ بھی ضرور کروں گی۔“

”فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں اور فٹ رہنے  
کے لیے کیا کرتی ہیں؟“

”فارغ اوقات میں مجھے ٹینس کھیلنا اچھا لگتا ہے  
اور فٹ رہنے کے لیے میں بہت ہی سادہ خوراک  
استعمال کرتی ہوں۔ مرغن غذائیں استعمال نہیں کرتی  
فریش جوسز کا استعمال زیادہ کرتی ہوں ورزش یعنی  
ایکسرسائز ضرور کرتی ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عشاء نور سے  
اجازت چاہی۔

☆



ہے اس لیے کام کو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“  
”گھروالے آپ کی اداکاری کو کتنا پسند کرتے ہیں؟“  
”بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اور سچ بتاؤں  
کہ میرے گھروالے تو میری اداکاری میں اتنے انوالو  
ہو جاتے ہیں کہ اگر ڈراموں میں میں روتی ہوں تو  
میرے گھروالے بھی روتے ہیں۔۔۔۔۔ اور یہی ایک  
آرٹسٹ کا حق ہے کہ وہ اپنی اداکاری سے دوسروں کو  
اس حد تک متاثر کرے کہ حقیقت کا گمان ہو۔۔۔۔۔“  
”آپ نے بتایا کہ گھروالے آپ کی اداکاری میں  
بہت انوالو ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں آپ  
کے اس فیلڈ میں آنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا؟“  
”جی۔۔۔۔۔ میرے والدین نے مجھ پر اعتبار کیا  
اور مجھے اس فیلڈ میں آنے کی اجازت دی۔۔۔۔۔ اور  
مجھے ہر موقع پر سپورٹ کیا۔ اور میں بہت خوش نصیب  
ہوں کہ مجھے ایسے والدین ملے کہ جنہوں نے مجھے  
بہت سپورٹ کیا اور شو بزم میں آنے کی اجازت دی۔  
اور میں بھی اس معاملے میں بہت احتیاط کرتی ہوں کہ  
ایسا کوئی کام نہ کروں کہ جس سے میرے والدین کے  
اعتبار کو کھینچوں۔“  
”فیلڈ میں آنے میں دشواری ہوئی۔۔۔۔۔ اور ابتدا

دنیا بھر کے منتخب اخباری ادب

# عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

مارچ 2018

ایک نیا جہان

**آزادی**

قدم قدم سے ترقی یافتہ ملکوں کا خوف 1971ء کے پس منظر پر لکھی گئی ایک نئی کہانی

مشہور فلمی جوبہار اکرام سبگل کی آپ جی،

**سیدیوں کے دل**

الہیہ کے ایک اعلیٰ طبقہ کے دل میں دل بڑھانے کی حقائق

مہم جوئی کے خفیہ حقائق کے لیے

ایم اے راحت کے گم کا ہمارا

**مؤذی انسان**

ناگ دھڑانے کے خوب صورت اور دل آویز نغمے کے لیے لکھی

ایم الیاس کا ایک نیا نیا نیا

**محبت ناتوا**

محبت میں انسان جان دے بھی سکتا ہے اور جان لے بھی سکتا ہے

جاوید راہی کی ایک دل دہکنے والی روایت

**دل نادان کی**

دعویٰ کی ہر شکل میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے والے

فیادہ کلائے ہیں

سیدین شہو کا سونو اعمار

**سوشل میڈیا**

سوشل میڈیا نے جہاں لوگوں پر بہت اثرات مرتب کیے ہیں وہاں اس کے

حق اثرات نے لوگوں کی زندگیوں کو شکست دے دیا ہے

عمارہ خان کی حقیقت نگاری

اس کے علاوہ سپر منس کی رومیس، سیدیس اور تھیسس سے

مہربان 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع ناز و نوحہ نگاری

مارچ 2018 کا نازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

محمد علی تو واقعی خدا داد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔  
”کچھ عرصہ آپ اسکرین پر یعنی اس پروگرام  
میں نظر نہیں آئیں تھے۔ وجہ؟“  
”کوئی خاص نہیں..... کچھ گھریلو مصروفیات  
تھیں، اس لیے چھٹی پہ چلی گئی تھی۔“  
”بے ساختہ ایسی..... بے ساختہ بن آپ کا ہی  
کمال ہے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ پروگرام میں ری  
ٹکس کتنے ہوتے ہیں؟“  
”بس یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ اس نے عزت  
دی ہے۔“  
”کامیڈی شوز کرنا زیادہ آسان ہے یا سنجیدہ  
شو کرنا؟“

”کامیڈی..... دنیا بھر میں کامیڈین کے لیے  
ایک چیلنج رہی ہے۔ کیونکہ میں جتنی ہوں کہ رانا  
آسان ہوتا ہے یہ نسبت ہنسانے کے۔ اور ہم اس  
پروگرام کے ذریعے لوگوں کو ہنساتے ہیں یا ان کے  
لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہیں تو جیسے کہ ہمیں اپنی  
پرفارمنس کا صلہ مل جاتا ہے۔ میری نظر میں ہنسانا ایک  
مشکل ترین کام ہے۔“  
”خس مزاح کس میں زیادہ ہوتی ہے۔ خواتین  
میں یا مردوں میں؟“

”میرے خیال میں ابھی ایسا کوئی پیمانہ ایجاد  
نہیں ہوا کہ یہ بتایا جاسکے کہ کس میں خس مزاح زیادہ  
ہوتی ہے۔ بے شک خواتین جذباتی اور حساس ہوتی  
ہیں مگر خس مزاح میں بھی وہ کسی سے کم نہیں ہوتیں۔“  
”انٹیکٹرونک میڈیا جو ان کرنے کے بعد کیا  
نمایاں تبدیلی آئی آپ میں؟“

”میڈیا میں آنے سے پہلے میں دوسروں پہ  
بہت آسانی سے بھروسہ کر لیا کرتی تھی۔ مگر اب میں  
خاصی محتاط ہو گئی ہوں۔ کافی کچھ سیکھ لیا ہے میں نے  
اس فیلڈ سے۔“  
”پہلے سوشل زیادہ تھیں یا اب؟“  
”میرے خیال میں نہ پہلے سوشل تھی اور نہ ہی

اداکاری ہی ہوتی ہے۔“  
”یہ ایک وسیع فیلڈ ہے۔ کہاں تک جانے کا  
ارادہ ہے؟“  
”میں ایک فلم کر چکی ہوں۔ مزید کرنا چاہتی  
ہوں اور کبھی رہی ہوں..... کیونکہ میں اپنے آپ کو  
ایک جگہ محدود نہیں کرنا چاہتی۔ میں اداکاری اور  
ماڈلنگ اور فلم سب کو ساتھ لے کر چلوں گی..... آنے  
والے دنوں میں آپ چند ایسے ڈرامے دیکھیں گی جو  
بہت یادگار ہوں گے۔ ان میں ایک پروڈیجکٹ مائیکل  
ڈن کا ڈراما Driven ہے۔ اس میں میرے ساتھ  
جاوید شیخ ہیں۔ جاوید شیخ کے ساتھ کام کرنا میرے  
لیے اعزاز ہے۔ اور ہاں فیشن انڈسٹری بھی میری  
پہچان ہے۔ اسے بھی نہیں چھوڑوں گی..... مجھے بہت  
آگے جانا ہے۔“

”شو بزنس انڈسٹری کے لیے کیا کہیں گی؟“  
”شو بزنس انڈسٹری میں جان آگنی ہے اس کے ہر  
شعبے میں بہت معیاری کام ہو رہا ہے۔ اور میں جتنی  
ہوں کہ انٹرنیشنل لیول کا کام ہو رہا ہے۔ اور مجھے  
بہت امید ہے کہ ایک دن آنے کا جب انٹرنیشنل  
مارکیٹ میں پاکستان کی فلم انڈسٹری کا شمار صف اول  
میں ہوگا۔“

”کوئی ایوارڈ بھی تو آپ کو ملا تھا؟“  
”جی..... جی..... مجھے کس اسٹائل ایوارڈ مل چکا  
ہے اور مزید ایوارڈز بھی لینا چاہتی ہوں اپنی پرفارمنس  
کی وجہ سے۔“

☆☆☆

**عائشہ جہاں زیب**

”کیسی ہیں؟“  
”اللہ کا شکر ہے۔“  
”خبرناک دو لوگوں کی وجہ سے بہت مقبول  
ہے۔ ایک آپ اور ایک میر محمد علی..... کیا خیال  
ہے؟“  
”یہ تو دیکھنے والے ہی بتا سکتے ہیں..... البتہ میر

کیا میری امی میری بہترین دوست بھی ہیں..... اور  
میں اپنا ہر کام ان کے مشورے سے کرتی ہوں۔“  
”کتنے بہن بھائی ہیں آپ؟“  
”ہم چار بہنیں ہیں۔ میں سب سے چھوٹی  
ہوں۔ بڑی دو بہنیں اس فیلڈ سے وابستہ ہیں۔ والدہ  
تعلیم یافتہ اور لیبرل ہیں، اس لیے ہم بھی اس فیلڈ میں  
آئیں۔“  
”والدہ کی کوئی خاص بات جو گھر سے باندھ لی  
ہو آپ نے؟“  
”میری امی کا ہمیشہ سے یہ کہنا ہے کہ کبھی بھی  
اس آدمی پہ اعتبار نہ کرنا جو تمہاری بے جا تعریف  
کرے یا بہت زیادہ تعریف کرے۔ اور میں نے بھی  
اس بات کو کوئی بار آرمایا ہے کہ جو آدمی آپ کی خوب  
صورتی کی تعریف کرے وہ بہت کم قابل اعتبار ہوتا  
ہے۔“

”کیا یہ ایک آسان فیلڈ ہے؟“  
”نہیں جی..... جو لوگ یہ سوچ کر آتے ہیں کہ  
یہ فیلڈ آسان ہے اور ایک دو ڈراموں میں کام کرنے  
کے بعد شہرت مل جائے گی تو یہ بہت غلط سوچ ہے ہر  
کوئی اداکار نہیں بن سکتا۔“  
”مگر یہ کہنا کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر شخص  
ادا کار ہے تو کیا غلط ہے؟“

”ہتے ہوئے۔“ مگر میں جس اداکاری کی بات  
کر رہی ہوں اس میں ہمیں کسی اور کارکردار پر فارم کرنا  
پڑتا ہے۔ اور یہ ایک مشکل کام ہے۔ اگرچہ میرے  
کیریئر کی ابتدا ماڈلنگ سے ہوئی لیکن مجھے اداکاری  
پسند ہے۔ حالانکہ اداکاری ماڈلنگ سے زیادہ مشکل  
کام ہے۔ مگر مجھے مزہ آتا ہے۔“

”ماڈلنگ کتنی آسان ہے..... بہت باکچھ کم؟“  
”ماڈلنگ بہت نہیں۔ مگر آسان ہے نہ بہ نسبت  
اداکاری کے۔ ماڈلنگ خواہ کرشل ہو یا ریپ پہ.....  
اتنی مشکل نہیں ہے۔ ہاں ریپ پہ اپنی انفرادیت کو  
نمایاں کرنا ہوتا ہے جو ایک طرح سے ہلکی چٹکی سی



مرحبا  
SINCE 1974  
قند کی سبک

بھول پھول کا رس  
مرحبا شہد میں گیا بس

f Marhabalaboratoriespk | www.marhaba.com.pk | UAN: 111-152-152



اب کوئی بہت زیادہ سوشل ہوں۔ میری سوشل لائف صرف میری ٹیلی اور کچھ فرینڈز تک محدود ہے۔  
”ویسے تو آپ اسکرین پر بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔ عام لائف میں کیسی ہیں۔ غصے کی تیز یا نرم؟“  
”میں عام زندگی میں بھی بہت فرینڈلی ہوں۔ مگر غصہ فطری ہوتا ہے اور عموماً نا پسندیدہ باتوں پر ہی آتا ہے۔ مثلاً کسی کا بھلا چاہو اور وہ کوئی اور مطلب لے لے۔“  
”آپ کا ایک بیٹا اور ماشاء اللہ دو بیٹیاں ہیں۔ گھریلو زندگی کی روٹین متاثر ہوئی؟“  
”نہیں۔ الحمد للہ بالکل بھی متاثر نہیں ہوئی، بچے اسکول جاتے ہیں تو میں ریکارڈنگ کے لیے آ جاتی ہوں اور پھر اسکول کی چھٹی کے بعد بچے بھی میرے پاس آ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور وہ بھی انجوائے کرتے ہیں۔ ہم سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور بس۔“  
”کھانا خود بناتی ہیں؟ اور اس پروگرام سے







شہر زاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچی بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ سوت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک انجین پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک شے کے نیچے رکھ دیا اور نو دین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں مختتم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

مختتم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاں، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے

ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو ان کے دونوں بچے نمبرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمبرہ کو لگاؤ کی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبی اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سر دروپیہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

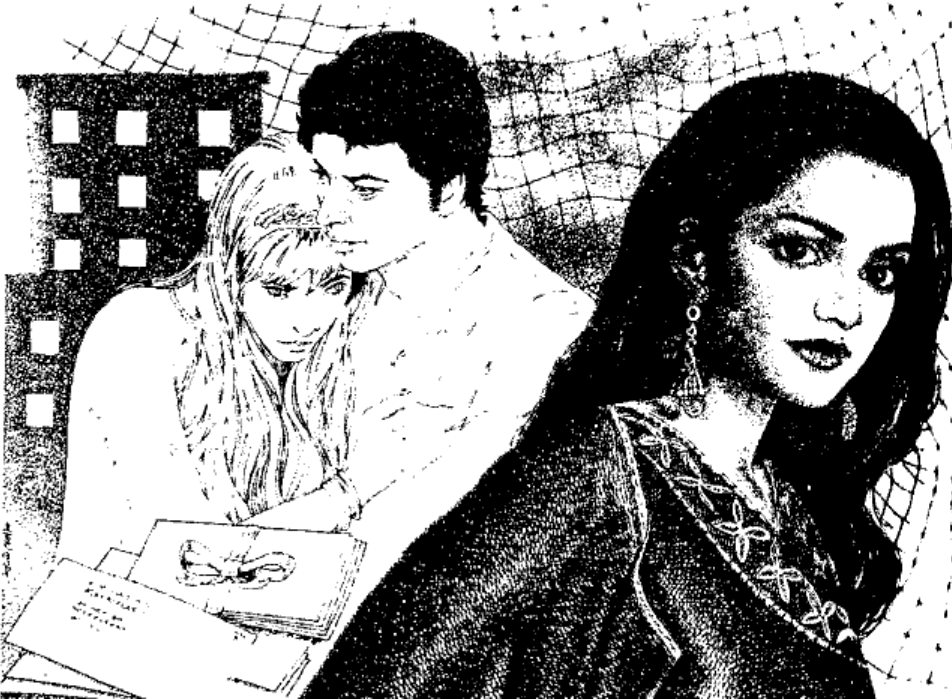
بیٹا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف پیورو کریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزادہ سے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں جیتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بننے لگے۔

اس نے خود کشی کی دھمکی دے کر شہزادہ کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ طوبی اور در شہوار عطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر چھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

مختتم علی کا بیٹا دھاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمت صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور بیٹا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزادہ سے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبی طوبی محمد ہادی کے بنگلے میں جاتے ہیں اور درخت پر بڑھ کر خوبائیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے



پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان جھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ منال، ہادی کی بہن ہے درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ منال اور برہان کی بے تکلفی سے اسے اپنے منتقلی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار دروانی، شہزاد کے پاس بیٹھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے منتقل ہو کر بیٹھنے کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع بھی کس واپس لے لیتا ہے، اس پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ نہیں پاتے۔ رومیہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا تینارشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوطی کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوطی کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

موزیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع بھی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کس واپس لے لیتا ہے، شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابہ، درشہوار اور منال کی بے تکلف گفتگوں کو صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے درخی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت شخص کر رہے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر موزیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔ صندل کے گھر والے، شہزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی خوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

جارج، مارٹھا کو علاقے کے گولڈر کی حرکتوں کا بتاتا ہے۔ جو وہ اس کا گھر زبردستی تھپانے کے لیے کر رہا ہے۔ دونوں پریشان ہوتے ہیں۔ مائیکل کی آمد پر وہ موزیکا کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ مگر موزیکا، ذوالکفل سے خفیہ نکاح کے باطل ہے اس کے گھر منتقل ہو جاتی ہے۔

## تیرہویں قسط

میر ریٹ ہوٹل میں ہونے والے مسز تریشی کے ڈنر کی رونقیں عروج پر تھیں۔

رنگ دیوار اور روشنیوں کے طوفان کے پیچھے بچتا ہوا دھمے سروں کا میوزک اب ہادی کے دماغ کو ناگوار کی احساس بخش رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان سب چیزوں پر لعنت بھیج کر خود کو اس منظر سے غائب کر لیتا۔

درشہوار اس کے سامنے تھی، پنک لکری میکی کے ساتھ اس نے اپنے چہرے کے گلش نفوش کو بڑی مہارت اور نفاست سے کیے جانے والے میک اپ کے ساتھ اجاگر کرنے کی شعوری کوشش کی تھی۔ آنکھیں اس کی پہلے ہی وگش تھیں، اوپر سے اس نے اپنی کھنسی پلکوں پر مسکارے کا گہرا کوٹ لگا کر انہیں مزید جاذب نظر بنالیا تھا۔ براؤن کلر کے ٹوپیٹ سوٹ میں میر برہان کی تیار بھی کسی سے کم نہیں تھی لیکن ہادی کو ان دونوں بہن بھائی سے یکساں پزیرائی اور کوفت محسوس ہوتی اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ درشہوار کی نظریں مسلسل اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

”ارے ہادی صاحب آپ.....؟“ برہان کے لہجے سے جھلکتی شناسائی پر منال چونکی۔

”آپ لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں کیا.....؟“ منال بے تابی سے گویا ہوئی۔

”مجھے ان کا پڑوسی ہونے کا اعزاز حاصل ہے.....“ ہادی نے جان بوجھ کر طنز پر انداز اختیار کیا۔

”دیش گر ہٹ، پھر مجھے تو مستقل طور پر مری میں شفٹ ہو جانا چاہیے.....“ منال کھلکھلا کر ہنسی۔

”تم جس جگہ پر ہو، وہیں رہو تو بہتر ہوگا.....“ ہادی نے ڈھکے پیچھے الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی، جو اس وقت برہان کو سامنے پا کر خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی اور اس کے رنگ ڈھنگ ایسے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھے۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ منال ہر وقت جس ہادی کا ذکر کرتی ہے، وہ آپ ہو سکتے ہیں۔“

”جی..... یہ شخص ایک اتفاق ہے۔“ اس کے لہجے میں موجود تنجیدگی اور فراخ پیشانی پر گہرے ہوتے بل درشہوار کے اندر مایوسی کا دھواں پھیلا رہے تھے لیکن اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہونے کا احساس بھی فی الحال کافی تھا۔ وہ شعوری طور پر تھوڑا اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی، اس کے لباس سے انشتی قیمتی کولون کی مسحور کن مہک نے درشہوار کو کونہ بھر کے لیے بے بس کیا۔

”آئیں ناں برہان، آپ کو ماموں اور ممانی جان سے ملواتی ہوں۔“ منال کے لہجے سے جھلکتی بے چینی ہادی کو سخت بری لگی۔

”شیور.....!!!“ برہان کی گہری نظریں منال کے چہرے کا حصار کیے ہوئے تھیں۔

”صرف ملوانا، ان سے تعارف مت کروانا۔“ ہادی نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے منال کے تھوڑا قریب آ کر ہلکی سی سرگوشی کی۔

منال نے ہلٹ کر پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اور ہادی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، جو منال سمجھ تو نہیں پائی لیکن اس کے چہرے پر پہلی تنجیدگی نے اسے لمبے بھر کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”ایکسیکو زدی برہان! ایک منٹ۔“

وہ پریشان انداز سے ہادی کے پاس آئی، جو اس وقت ساری دنیا ہی سے خفا خفا سا لگ رہا تھا۔ درشہوار اور برہان دونوں نے چونک کر انہیں دیکھا، لیکن ہال میں بیٹے ہوئے میوزک کی وجہ سے وہ ان کی گفتگو سمجھنے سے قاصر تھے، البتہ ہادی کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کم از کم خوش گوار نہیں تھی۔

”تم بتا کیوں نہیں رہے ہو، آخر پر اہلکم کیا ہے.....؟“

”کہاناں، مجھی پاپا سے تعارف مت کروانا ان لوگوں کا، باقی ڈشیل بعد میں بتا دوں گا۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلا یا۔ منال نے کچھ لمحے اسے غور سے دیکھا، اور پھر سر جھٹک کر بے نیازی کے ساتھ اپنے انتہیل مہمانوں کی طرف بڑھ گئی، جبکہ ہادی کا تو سارا مزاج ہی کرکرا ہو گیا تھا، وہ زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے جاننے والے لوگوں سے ملتے ہوئے نسبتاً ایک خالی گوشے کی طرف آ گیا، جہاں ذرا الگ تھلگ رکھے صوفے پر شہزاد برہان تھیں۔

منال کی بے تابیوں اور بے چینیوں نے اس کا سکون تو برباد کیا ہی تھا لیکن اسے اس بات پر بھی حیرانی تھی کہ میر برہان ختم اپنی بہن کو لیے اتنے دھڑلے سے انجان لوگوں کی گید رنگ میں کیسے آسکتے ہیں، اور بہن بھی اس وقت سولہ سگھار کیسے کسی بھی اچھے بھلے شخص کے ہوش اڑا سکتی تھی لیکن آگے بھی ہادی تھا جو اپنے دل کے دروازے سختی سے بند کر کے جانی کہیں ڈور جنگلوں میں پھینک چکا تھا۔

”پاکل ہیں دونوں بہن بھائی۔“ وہ دل ہی دل میں ان دونوں کو کوسے ہوئے غیر دانستہ طور پر شہر زاد کے عین برابر میں بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان دونوں کے درمیان میں بس چنداچ کا فاصلہ ہے۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ہادی؟“ شہر زاد اس کی غائب دماغی کو بھانپ چکی تھی۔

”اوہ آئی ایم سوری۔“ وہ خفت زدہ انداز میں تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھا۔

”اُس اویکے..... مجھے لگتا ہے، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید۔“ وہ چہرے پر نرم مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”جی، کچھ ایسا ہی ہے، سر میں درد ہے، لگتا ہے کوئی پین کمر لینی پڑے گی۔“ ہادی نے اپنی دو انگلیوں سے ماتھے کو لا شعوری انداز میں مسلا۔

”آپ کسی دیر کو بلوآ کر پوچھیں، مل جائے گی ادھر ہی سے۔“ وہ تھوڑا فکر مند ہوئی۔

”ارے نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں، آپ سنائیں کسی ہیں اور کیا ڈرگئی ہیں میری بیٹی سے، جو دوبارہ مری کا رخ ہی نہیں کیا آپ نے۔“ اس نے دانستہ اپنا دھیان منال اور برہان سے ہٹانے کے لیے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ایک بات یاد رکھیے گاندھ ہادی صاحب! جس دن شہر زاد نے اپنے پروفیشن سے ڈرنا شروع کیا، اس سے اگلے دن وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنی مام کا سیلون سنبھال لے گی، کیونکہ اس کے لیے پھر یہی شعبہ بہتر ہوگا۔“ اس کے پُر اعتماد انداز پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرایا۔

”یہی اسپرٹ ہوئی چاہیے زندگی کے ہر معاملے میں، اور مجھے یقین ہے کہ ایسا دن کم از کم آپ کی زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔“

”اللہ کرے، میں آپ کی امیدوں پر پورا اُتروں۔“ شہر زاد نے ویٹر کی ٹرے سے فریش جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”مجھے تو شجاع غنی والے کیس سے بہت امیدیں تھیں کہ کم از کم میری فیملی پر ہاتھ ڈالنے کا ایک مضبوط جواز ہاتھ میں آجائے گا۔“ وہ اب بہت تسلی سے اس سے گپ شپ لگانے کے موڈ میں تھا۔

”امیدیں تو مجھے بھی بہت تھیں لیکن، وہی حضرت علی کا قول ہے ناں۔“ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے خدا کو پچھانا۔“ وہ تھوڑا افسردہ ہوئی۔

”میں آپ کی بات سے متفق ہوں، شجاع غنی کے پیچھے بٹنے کے بعد کوئی اور مضبوط جواز بھی تو نہیں رہا تھا اس کیس کو لڑنے کا، لیکن آپ کو جب موقع ملے اس کیس کا بدلہ ضرور لیجیے گا۔“

”میں کسی ذاتی عناد یا دشمنی پر تو لوگوں پر کیس نہیں کر سکتی، لیکن جب کبھی ان کے خلاف ایسا کچھ ملا تو پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ شہر زاد نے اسے اپنے امدادوں سے باخبر کیا۔

”ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جائے گا کیونکہ، یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز تو آنے والے ہیں نہیں۔“ ہادی نے کافی فاصلے پر کھڑی درشوار کو نا پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے حل کر کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ مضبوط جواز مل چکا ہو مجھے، جو ان کے پورے خاندان کی سیاست کی بنیادیں ہلا دے۔“ اس کے پُر اعتماد لہجے میں کچھ تھا۔

ہادی ایک دم سنبھل کر بیٹھا اور اسے اپنا سارا سر درد فضاؤں میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

”آر یو شیور.....؟؟؟“ اس نے شہر زاد کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کی۔

”آف کورس، میں کوئی ایسی بات اندازوں پر تو کر نہیں سکتی۔“ وہ ابھی بھی پُر اعتماد تھی۔

”اگر ایسی کوئی بات ہے تو میں بے چینی سے اس وقت کا منتظر ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کروائیں گی۔“ ہادی کی بات پر شہر زاد کے لبوں پر ایک جان دار مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

”میں نے مسز عالیہ فریٹی یعنی آپ کی والدہ سے زندگی کا ایک ہی اصول سیکھا ہے ابھی۔“

وہ اس کی بات پر چونکا۔ ”کیا.....؟“

”زندگی بھی شطرنج کی بساط کی مانند ہوتی ہے جہاں درست وقت پر درست مہرے کا استعمال ہی آپ کی کامیابی کی ضمانت بنتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”اور یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے کہ کسی سیاسی خاندان کے لیے الیکشن کے قریب کا وقت ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہوتا ہے، اس وقت پر لگنے والی چوٹ کے اثرات بہت دیر پا ہوتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں موجود چمک پر شہر زاد مسکرائی۔

”مسز فریٹی کی اولاد کو کوتاہی ذہن ہونا چاہیے جتنا دنیا انہیں سمجھتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، میرا اندازہ درست ہے، آپ بھی اسی وقت کا انتظار کر رہی ہیں۔“ ہادی کی بات کو اس نے مسکرا کر ٹالا۔

اسی ہال میں کچھ فاصلے پر موجود درشوار کی نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں، شہر زاد کا پُر وقار انداز میں مسکراتا اور ہادی کا کھویت کے ساتھ اسے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دینا، یہ سارے رخ مناظر بھولنے کے لیے درشوار کو ہماڑ جتنا حوصلہ چاہیے تھا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شہر زاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے ہال سے کہیں دُور چینگ آئی یا ہادی کو گھسیٹتی ہوئی وہاں سے کہیں اور لے جاتی۔ اسے دنیا میں کوئی لڑکی اتنی بُری نہیں لگی تھی، جتنی اس وقت ہادی کے ساتھ بیٹھی ہوئی شہر زاد لگ رہی تھی۔

ہادی اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے کسی جانے والے کے ساتھ جو گفتگو ہو گیا اور شہر زاد کی ساری توجہ اس کے سیل فون پر آئے والے ٹیکسٹ میسج نے اپنی طرف مبذول کروالی، وہ میسج کی مخصوص ہپ سے جان چکی تھی کہ

دوسری طرف ہم زاد ہوگا اور وہی تھا۔ اسکرین پر نظریں دوڑاتے ہوئے اس کے لب خود بخود مسکرائے، کیونکہ سامنے کچھ نہ تھا۔

الٹنی کیوں نہیں اٹھتی قیامت، ماجرا کیا ہے.....

ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

شہر زاد نے اسکرین پر جھگوڑے اس کے نام کو مسکراتے ہوئے دیکھا، ایک ساتھ کئی جتنو اس کی اپنی بھی آنکھوں میں چمکے اور اس نے شرارت سے فوراً اس کے شعر کا جواب تیزی سے ٹائپ کیا۔

صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

خوب پر وہ ہے چلن سے لگے بیٹھے ہیں

جیسے ہی شہر زاد کا ٹیکسٹ گیا، اگلے ہی منٹ میں اس کا شاعری ہی کی زبان میں برجستہ میسج کی صورت میں فوراً جواب آیا۔

عشق منقل میں کبھی ہم کو پکارے تو سہی

پابجولاں ہی چلے آئیں گے جھم جھم کرتے

وہ بھی کون سا کسی سے کم تھی، جھٹ سے شان بے نیازی سے اسے لکھ مارا۔

ان قدموں نے تمہارے، ان ہی قدموں کی قسم خاک میں اتنے ملائے ہیں، کہ جی جانتا ہے۔

اس شعر کے بعد چند منٹوں کا سناٹا چھا گیا، اسے پتا تھا کہ یہ بات براہ راست اس کے دل میں کھلی ہوگی، تب ہی دو منٹ اور تیس سیکنڈ کے بعد سیل فون اسکرین پر اس کا جواب آیا۔

کوئی فتنہ، بقا قیامت، نہ پھر آشکار ہوتا

تیرے دل یہ کاش ظالم، مجھے اختیار ہوتا

شہر زاد جان مکتی تھی کہ اس شعر کے اندر اس کی حسرتوں کا جہاں آباد ہے۔ اس نے بھی اس بار امید کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھام لی۔

اسی دنیا کے، اسی دور کے ہیں

ہم تو دلی میں بھی، بجنور کے ہیں

شہر زاد کو انداز نہیں تھا کہ سانسے بھی ہم زاد تھا جس سے چاہ کر بھی وہ کسی بھی معاملے میں جیت نہیں سکتی تھی۔

تجھ کو دعوا ہے محبت میں گرفتاری کا

لا دکھا، پاؤں میں زنجیر ہمارے جیسی

اس نے ہم زاد کے اس دعوے پر تپ کر اسے فوراً لکھا۔

وہ ہر ایک بات کا پہلو نکال لیتا ہے

میں کچھ ہوں تو، تراز و نکال لیتا ہے

شہر زاد کے اس دل جلے انداز پر اس نے ہنستے ہوئے لکھا۔

آخر میں تیرے کام تو آیا، کسی طرح

آخر میری مثال ہی دینا پڑی تجھے

اسی شعر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

”اب بیت بازی ختم اور جا کر کھانا کھا لیجیے۔“

شہر زاد نے چونک کر ہال کی طرف دیکھا، ہادی پتا نہیں کب وہاں سے اٹھ کر جا چکا تھا اور اس وقت سب ہی مہمان ڈنر میں مصروف تھے۔ اس نے بھی اپنا سیل فون بینڈ بیگ میں ڈالا اور مسز فریٹی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆☆

وال کلاک کی سوئیاں اس وقت ایک کے ہندے پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

ہادی اور منائل کے درمیان بوجھل خاموشی کا وقفہ کچھ لمحوں کے لیے آ کر ٹھہر گیا، منائل نے ہلکا سا جھنجھلا کر اپنے کزن کو دیکھا، جس کے بارے میں اسے دعو تھا کہ وہ اسے ساری دنیا سے زیادہ جانتی ہے لیکن اس کا یہ روپ تو اس نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

”تم پوچھنا کیا چاہ رہے ہو ہادی! صاف صاف کہو۔۔۔۔۔؟“ وہ ہلکا سا چڑ کر بولی۔

”مجھے تم صرف اتنا بتاؤ کہ تم میرا بہن کی فیلٹی کے بارے میں کتنا جانتی ہو۔۔۔۔۔؟“ اس کا سخت لہجہ منائل کو چونکا گیا۔

”تمہارے لہجے سے تو لگ رہا ہے جیسے مجھ سے زیادہ تم ان کو جانتے ہو۔“ وہ سنجیدہ ہوئی۔

”اسی بات کا تو افسوس ہے، جو بات تمہیں جانتی چاہیے تھی، وہ مجھے بتانی پڑ رہی ہے۔“ وہ جتاتے ہوئے انداز میں گویا ہوا۔

”ایسی کیا بات ہے جو تم اتنا زیادہ سیریس ہو رہے ہو۔“ وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر اس کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”سوچ لو، شاید سن کر تمہیں اچھا نہ لگے۔“ اس کے طنز یہ انداز پر منائل کو جھکا لگا۔

”میں براہان کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں اور میں نے ہر لحاظ سے پرفیکٹ پایا ہے انہیں۔“

”اس کے خاندان کو جانتی ہو۔۔۔۔۔؟“ اس نے طنز یہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

”میرا اس کے خاندان سے کیا لینا دینا۔“ اس نے دوہرہ جواب دیا۔

”منائل صاحبہ، یہ پاکستان ہے اور یہاں لڑکی کا اپنے شوہر سے زیادہ اپنے سرسرا والوں سے لینا دینا ہوتا ہے، پھر تم یہ بات کیسے بھول سکتی ہو۔“ اس کا استہزاء انداز اسے اچھا نہیں لگا۔

”جو بات ہے ہادی! تم صاف صاف کیوں نہیں کرتے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”اس سے پہلے تم خود کو راضی کر لو، تلخ سچائی کو ہضم کرنے کے لیے۔“

”میرا ہاضمہ اتنا کمزور نہیں ہے، تم جو بھی کہنا چاہتے ہو، کل کر کہو، میرے سامنے پہیلیاں مت بکھواؤ، کیونکہ مجھے ختم انجمن ہو رہی ہے۔“

”صرف اتنا بتاؤ کہ تم براہان کے علاوہ اس کے خاندان کے کتنے لوگوں کو جانتی ہو۔۔۔۔۔؟“ اس نے غور سے اس کے چہرے کے تاثرات جانچتے ہوئے کہا اور جواب حسب توقع وہی آیا تھا، جس کی اسے سو فیصد امید تھی۔

”اس کی بہن در شہوار سے ایک دو بار ملاقات ہوئی ہے میری، اور اچھی لگی ہے وہ مجھے۔“ منائل کی اس بات نے اس کا موڈ خراب کیا۔

”واہ منو صاحبہ! واہ! کون سی دنیا کی محبت ہے جہاں محبوب کے علاوہ کسی اور چیز کا علم نہیں اور اس کے ساتھ نئی دنیا بسانے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔“ اس نے اس بار اس کی اچھی خاصی عزت افزائی کی۔

”ہادی! بھول گئے ہو کیا، تم نے بھی تو محبت کرتے ہوئے ہر چیز بھلا دی تھی۔“ اس کے طعنے پر وہ تڑپ اٹھی۔

”سب کچھ بھلا دیا ہوتا تو وہ اس وقت میرے گھر میں میرے ساتھ ہوتی، میں ایک طرف محبت کی سزا نہ کاٹ رہا ہوتا۔“

”ہاں تو کروہمت، اب بھی کیا بگڑا ہے۔“ منائل کا یہ وار بھی خاصا کاٹ دار تھا۔

”بگڑا تو کچھ کچھ بھی نہیں ہے، بس کسی کی دوستی کا مان لوٹ جائے گا، اسی چیز کی حیا مار دیتی ہے مجھے۔“ وہ تلخی سے گویا ہوا۔

”جب تم خود کچھ نہیں کر سکتے تو میرے راستے کی رکاوٹ کیوں بن رہے ہو، کیا پر اہلم ہے تمہارا۔۔۔۔۔؟“ اس دفعہ وہ بھی برا مان گئی۔

”میرا پر اہلم تم ہو منائل! تمہیں، بہن کہا ہی نہیں، ہمیشہ سمجھا بھی ہے اور میں تمہیں کسی اندھے کوئیس میں گرنا دھکیلتی رہی۔“ اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا تھا لیکن اس کی اس بات پر منائل نے بیزارگی سے اپنے لہجے میں جھلک دے رکھی تھی۔



”برہان، اندھا کتاوں نہیں ہے۔“ منابل نے ٹوکا۔

”میر حاکم علی کا خاندان ایک ایسی اندھی کھائی ہے، جہاں اندر گرنے کے تو بے شمار راستے ہیں لیکن باہر نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے موت، یہ لوگ سانسوں پر پھرے لگاتے ہیں، دوسروں کی زندگیوں کا اختیار اپنی مٹھیوں میں رکھتے کے قائل ہیں۔“ اس نے نادان لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم یہ بات اتنی تفصیل سے کیسے جانتے ہو.....؟“ منابل مشکوک ہوئی۔

”میں ہی نہیں مٹی، پاپا سب جانتے ہیں، پاپا کے پاس ان کی کرپشن کے ڈھیروں ثبوت ہیں، جا کر دیکھ سکتی ہو تم۔“

”سیاست سے تعلق رکھنے والے خاندانوں پر ایسے الزامات لگتے ہی رہتے ہیں، یہ کون سی نئی بات ہے.....“ اس نے اس بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

”اس کا خاندان کرپشن، دھوکا دہی، قتل و غارت، اغوا اور لینڈ مافیا کے حوالے سے بھی مشہور ہے۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلا کر گویا ہوا۔

”بے شک ایسا ہوگا، لیکن برہان ایسا نہیں ہے، وہ بہت مختلف ہے.....“ اس بار اس کی آواز تھوڑی مدہم ہوئی۔

”منو غلط فہمی ہے تمہاری، وہ سب لوگ اوپر سے لے کر نیچے تک ایک جیسے ہیں، ہمیں ان کا خاندان بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا، ان کے مردوں کے لیے علیحدہ اصول ہیں اور خواتین کے لیے الگ.....“ ہادی نے سی سے کہا۔

”اگر ایسا ہوتا تو برہان بھی پروفیسری کے بجائے اپنی فیملی کے باقی لوگوں کی طرح سیاست کر رہا ہوتا، اس نے پورے خاندان سے بغاوت کر کے یہ پروفیشن اپنایا ہے، اسے نفرت ہے سیاست سے.....“ اس کے پاس بھی دلیل تھی۔

”لیکن وہ تمہارے ساتھ سیاست کر رہا ہے، میری یہ بات لکھ لو تم.....“ ہادی کے طنز پر وہ تڑپ کر بولی۔

”تم اس کی فیملی کے بارے میں غلط بات ضرور کرو لیکن برہان کے بارے میں نہیں۔ وہ ٹھیک ٹھاک بُرا مان گئی۔

”اس لیے کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتی ہو.....“ اس نے غصے سے کہا۔

”میں جانتا بھی نہیں چاہتی، وہ لوگ جو بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، لیکن میں اور برہان ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے.....“ منابل نے اس بار صاف گوئی سے اپنا موقف بتایا، اور ہادی کا ایک بار تو دل چاہا کہ وہ سامنے والی دیوار سے جا کر ٹکڑا کر لے، کیونکہ منابل کوئی بھی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

”کیا کوئی شخص اپنے خاندان، برادری اور رشتے داروں سے کٹ کر رہ سکتا ہے۔؟ کیا وہ ان سب لوگوں کو تمہارے لیے چھوڑ سکتا ہے کیونکہ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ میرا خاندان میں پہلی بھوکا اعزاز صرف ان کے اپنے خاندان کی عورت کو ہی ملتا ہے.....؟“ اس نے استہزاء سے لہجے میں پوچھا۔

”مطلب کیا ہے تمہارا.....“ منابل بیزاری سے گویا ہوئی۔

”وہ اپنی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہی کرے گا، لکھ لو تم میری یہ بات، اور اس کے بعد تم اس کی دوسری یا تیسری بیوی بنتا چاہو تو یہ الگ بات ہے۔“

ہادی کے استہزاء سے انداز پر وہ جذباتی ہو گئی..... ”برہان ایسا کبھی نہیں کر سکتے.....“

”خوش فہمیوں کی ریت پر اونچے اونچے محل مت بناؤ، اور ہو سکے تو اس موضوع پر اس سے کھل کر بات کرو، جب ہی تم کسی نتیجے پر پہنچو گی.....“ اس نے منابل کو ایک نئی راہ دکھائی تو وہ بھی کچھ الجھن کا شکار ہوئی۔

”بات تو میں کر لوں گی لیکن کیا ماموں اور مہمانی مان جائیں گے؟“ منابل کے لہجے میں کئی اندیشوں نے ایک ساتھ سر اٹھایا۔

”میں ان کی گارنٹی نہیں دے سکتا، کیونکہ مٹی کی اسٹنٹ شہر زاد پر فائزنگ برہان کے دادا اور باپ نے کروائی تھی اور یہ بات وہ لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں، اس لیے تمہیں اپنا مقدمہ خود لڑنا ہوگا۔“ ہادی نے اسے کسی خوش فہمی میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکنا نہیں تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے کمرے سے نکل گیا۔

”اوہ مائی گاڈ.....! اب کیا ہوگا.....؟“ منابل کو قطعاً اس صورت حال کا اندازہ نہیں تھا، اس نے وال کلاک پر وقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے اس نے کچھ سوچ کر برہان کا نمبر ڈائل کیا، چند سیکنڈ بعد یاروڈ آف کی فیل پردہ مایوس ہوئی۔ اس نے پریشانی سے سیل فون ایک طرف رکھ دیا، ہادی سے اس ایک گھنٹے کی بحث کے بعد وہ جان چکی تھی کہ اس کے اور برہان کے راستے اتنے بھی آسان نہیں تھے جتنا اس نے سمجھ لیے تھے۔

☆☆☆

میر ہاؤس اس وقت تاریکی اور خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔۔۔

درشہوار کے کمرے کی جلتی لائٹ دیکھ کر نیرہ نہ جاتے ہوئے بھی ادھر نکل آئی، اسے پتا تھا کہ وہ اور برہان بھائی فنکشن سے ابھی ابھی لوٹے ہیں اور وہ مزے کے نقشے سننے کے چکر میں اس کے پاس آئی تھی۔

اس نے ہلکا سا دروازہ کھول کر درشہوار کے کمرے میں جھانکا، اسے دھچکا لگا۔

درشہوار کی ٹی پنک میکی، جیولری، دوپٹے اور ہارنگھار کی ساری چیزیں لا پرواہی سے زمین پر پڑی ہوئی اپنی بے وقعتی کا ماتم کر رہی تھیں اور وہ ڈریننگ کے شیشے کے سامنے کھڑی گویا اپنے حواسوں میں نہیں تھی، سفید رنگ کی ٹی شرٹ اور غراؤڈ میں وہ اپنے مخصوص ٹائٹ ڈریس میں تھی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت اور بے بسی کا ڈیرا تھا، اس نے اپنے بازو کی پشت سے اپنے ہونٹوں کو

رگڑ کر میریون کلر کی لب اسٹیک اتارنے کی کوشش کی اور سفید رنگ کی آستین پر میریون رنگ عجیب سا دکھائی دینے لگا، اسے اس چیز سے تسلی نہیں ہوئی تو اس نے فرش پر بے دردی سے پڑی اپنی میکی کے ساتھ کے گلابی دوپٹے کو اٹھایا اور بے دردی سے اپنا میک اپ رگڑ کر اتارنے لگی۔ نیرہ نے کچھ کا لگا۔

”کیا ہو گیا ہے درشہوار! باگل تو نہیں ہو گئی ہو۔“ نیرہ نے بھاگ کر اس کا دوپٹہ چھینا۔

”میرا دوپٹہ واپس کرو.....“ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

”پاگل لڑکی! اتنا قیمتی سوٹ برباد کرنا ہے کیا، دیکھو ذرا کتنے داغ لگ گئے ہیں اس پر.....“ نیرہ نے پریشانی سے اس کا قیمتی دوپٹہ دیکھا جو اس کے سیاہ کا جل، اور آئی شیڈز کے مختلف رنگوں کے ساتھ خاصا بد نما ہو چکا تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”داغ خراب ہو گیا ہے میرا، دل کرتا ہے کہ پوری دنیا میں آگ لگا دوں کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑ دوں.....“ وہ اب رہنے لگی۔

”برہان بھائی نے کچھ کہا ہے تمہیں۔؟ فنکشن تو ٹھیک رہا ناں، تم تو اتنی خوش خوش گئی تھیں.....“ وہ پریشان

ہوئی۔  
”مجھے جانا ہی نہیں چاہیے تھا، خواہ مخواہ میں منہ اٹھا کر چلی گئی اپنی انسلٹ کروانے۔ پتا نہیں عقل کس دن آئے گی مجھے۔“ وہ اب بلند آواز میں خود کو کوس رہی تھی اور اس کی یہ لعن طعن کمرے میں داخل ہوتی طوبیٰ نے بھائی ہوش دجو اس کی اور اس کے چہرے پر ایک نہر آلودہ سم نے اٹھرائی لی۔  
”تمہاری انسلٹ.....؟ کس نے کی.....؟“ اس کی بات پر نیرہ بوکھلا گئی۔  
”اپنی انسلٹ کروا کر کون بتاتا ہے.....؟“ طوبیٰ نے اس کا مذاق اڑایا۔  
”تم کیوں میرے ہر دکھ اور ہر تکلیف پر اتنا خوش ہوتی ہو، شرم آتی چاہیے۔“ درشہوار نے اپنا غصہ طوبیٰ پر اتارا۔

”جو انسان خود دوسروں کے لیے برا سوچے، وہ کیسے خوش رہ سکتا ہے۔“ وہ اس کے سامنے آکر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔  
”کس کے لیے برا سوچا ہے میں نے.....؟ کس کے ساتھ غلط کیا ہے میں نے۔۔۔؟“ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

”یہ تم بیٹھ کر جب ایمان داری کے ساتھ اپنا احتساب کرو گی تو تمہیں خود پتا چل جائے گا۔“ طوبیٰ کی صاف گوئی اس کے تن بدن میں آگ لگا گئی۔  
”اٹھو تم دونوں اور ابھی اور اسی وقت نکلو میرے کمرے سے، میں تم لوگوں کی مخوس شکلیں نہیں دیکھنا چاہتی۔“ درشہوار نے دونوں کے بازو پکڑے اور گھسیٹتی ہوئی انہیں دروازے کی طرف لے گئی۔  
”یار! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تمہیں.....“ نیرہ نے بوکھلا کر صفائی دینے کی کوشش کی۔  
”مجھے تم میں سے کسی سے بھی بات نہیں کرنی۔“ درشہوار نے ان کو باقاعدہ دھکا دے کر اپنے کمرے سے نکالا۔

”اس کا تو واقعی دماغ خراب ہو گیا ہے اور عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے، بہت اچھا ہوا اس کے ساتھ، جس نے بھی کیا۔“ نیرہ کو اس کی بدتمیزی پر بے تحاشا غصہ آیا۔ طوبیٰ اس کا ہاتھ پکڑ کر سنگ روم کے صوفے کی طرف لے آئی۔

”جتنی پاگل یہ ہو رہی ہے، لگتا ہے اسی ہمایوں کے لڑکے سے بے عزتی کروا کر آئی ہے کیونکہ وہی اسے اس کی اوقات یاد دلاتا ہے۔“ طوبیٰ کی زبان پھسلی۔

”ہاوی، وہ اسے کہاں ملا.....؟“ نیرہ بے اختیار چونکی اور طوبیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔  
”کہیں بھی مل سکتا ہے یار.....“ اس نے بات نالائقی کوشش کی لیکن آج طوبیٰ کے ساتھ ساتھ درشہوار کے بھی ستارے گردش میں تھے، برہان جو کہ خود درشہوار کے کمرے سے کوئی تین کلرڈ صوفے کے لیے اوپر آ رہے تھے، ان دونوں کی بات پر ان کے قدم ساکت ہوئے۔

”درشہوار اور اس پر دوس لڑکے ہاوی کا کوئی چکر چل رہا ہے ناں۔؟ شک تو مجھے پہلے ہی تھا لیکن آج یقین آ گیا.....“ نیرہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

”وہ تو گھاس بھی نہیں ڈالتا درشہوار کو، یہ ہی پاگل ہو رہی ہے اس کے پیچھے، ورنہ میرے سامنے کئی دفعہ جھاڑا ہے اس نے، یا نہیں ایک دفعہ شکایت لے کر چلی آ گیا تھا وہ.....“ طوبیٰ کی بات پر برہان کو یوں لگا جیسے کسی نے ابلتا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں ڈال دیا ہو۔ ”ایسے ہی اپنی قیمت بڑھا رہا ہوگا، ورنہ درشہوار کو کون لڑکا انکار

لے رہا ہے۔“ نیرہ کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا جبکہ برہان کا دماغ کھولنے لگا۔  
”اس چھوٹی کو عقل سے کام لینا چاہیے جو ہر وقت اس پر ثار ہونے کے لیے تیار رہتی ہے، گھنٹوں اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھتی ہے اور اس کا بس نہیں چلنا کہ جا کر اس سے اپنی محبت کی بھیک مانگنے لگے۔“ اس سے زیادہ سننا برہان کے بس میں نہیں تھا، وہ تیز قدموں کے ساتھ سڑھیاں اتر کر نیچے چلے گئے۔  
”ہمیں کتنے نفوس کا ثواب مل رہا ہے ان دونوں کو آدھی رات کو ڈسکس کر کے، چلو اٹھو، تائی ای آگئیں تو انہیں تو پہلے ہی اعتراض ہوتا ہے کہ ہم ساری رات بدردحوں کی طرح پورے گھر میں گھومتے ہیں۔“ طوبیٰ اپنی بات مکمل کر کے کھڑی ہوئی۔

”ہم تو صرف گھومتے ہیں برہان کی اپنی سگی بیٹی تو ڈر نکولا بن چکی ہے، جس کا بس چلے تو ہمارا ہی خون پینا شروع کر دے، دیکھو ذرا کیسے دھکے مار کر نکال دیا کمرے سے، اب اس فضول لڑکی کو منہ لگانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ نیرہ کا غصہ ابھی تھمی کم نہیں ہوا تھا، تب ہی تو وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مسلسل بولتی رہی جبکہ طوبیٰ کے پاس اب ایک بے ضرری مسکراہٹ کے علاوہ کوئی اور جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

شہزاد، میڈم عالیہ قریشی کے ڈنر سے ابھی ابھی گھر پہنچی تھی۔  
اپنی گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے جیسے ہی وہ باہر نکلی، اس کی نظر لان میں اکیلے بیٹھی ہوئی سندس پر پڑی، جو کہ رشیدہ مائی کی بیٹی تھی، اس کے چہرے پر اس قدر وحشت اور اداسی تھی کہ درشہوار کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو گئے۔ ”تم اس وقت رات کے ایک بجے یہاں بیٹھی ہوئی کیا کر رہی ہو۔“

”کچھ نہیں بی بی جی، ویسے ہی اندر دم گھٹ رہا تھا۔“ سندس نے بڑی مہارت سے اپنے آنسو خشک کیے تو شہزاد کو حیرانی ہوئی، جنوری کے سخت سردی کے موسم میں کسی کو اپنے سروٹ کو اثر میں رکھنے کا احساس بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا، یہ بات وہ بن کے سمجھ سکتی تھی۔

”کل جب میں آفس سے آؤں تو میرے کمرے میں آنا، اس وقت اٹھو اور جاؤ اپنے کمرے میں، باہر اچھی خاصی ٹھنڈ ہے۔“

شہزاد اسے اٹھا کر سنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی آئی، سامنے ایکوریم کے پاس رکھے کاؤچ پر رومی لا پرواہی سے نیم دراز تھی اور اس کے ہاتھوں میں اس کا سیل فون تھا، جس پر وہ اس وقت کوئی ٹیکسٹ کرنے میں مصروف تھی، شہزاد نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی۔

”مام نے میڈیسن لی.....؟“

”نہیں.....“ اس کے جواب پر وہ فکر مند ہوئی۔

”رومی! میں جانے سے پہلے کئی دفعہ تمہیں یاد دلا کر گئی تھی کہ مام کو نام پر میڈیسن ضرور دے دینا۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے ان سے نہیں پوچھا ہوگا.....؟ اور اصرار کرنے پر جھاڑ نہیں کھائی ہوگی؟“ اس نے الٹا اسے لا جواب کیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ آج پھر اسٹریس کا شکار ہیں.....“ وہ پریشان ہوئی۔

”یہ تو اب روز کا معمول بن چکا ہے اور میرے ساتھ تو شاید انہیں خاص پرائیلم ہے، دس باتیں پوچھتی ہوں تو تب جا کر وہ کسی ایک بات کا ڈھنگ سے جواب دیتی ہیں، جیسے میں نے ان کا پتا نہیں کیا نقصان کر دیا ہو۔“

رومیہ کا موڈ بھی ٹھیک ٹھاک خراب تھا۔

”تم ٹینشن مت لو، ان کی ذہنی حالت ہی ایسی ہے۔“ اس نے نرمی سے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔  
”ابھی سیف الرحمن صاحب تشریف لے آئیں تو پھر دیکھنا، کیسے ان کی ساری بیماری دومنت میں غائب ہو جاتی ہے۔“

”وہ ان سے ملنے اور بات کرنے سے انکار کر چکی ہیں۔“  
”تمہارے سامنے ڈرامے بازی کر رہی ہیں، ورنہ مام اور سیف الرحمن کو چھوڑ دیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ رومیہ آج اپنی پرانی جون میں تھی۔

”تمہیں کیا پراپیم ہے سیف الرحمن سے۔؟ کم از کم ہارون رضا سے تو ہزار گنا بہتر ہیں وہ۔“ شہزاد نے تحمل سے کہا۔  
”یقیناً وہ بہتر ہوں گے، لیکن مجھے اب اپنے سوشل سرکل کے اس عمر کے مردوں پر تو قطعاً اعتبار نہیں رہا، جو گھر دیں میں اپنی بیویوں کو رکھے دوسری عورتوں سے انہیں چلا رہے ہوتے ہیں اور اس چیز پر ان کا تعمیر بھی ان کو ملامت نہیں کرتا۔“

”میں اللہ سے دعا کروں گی کہ زندگی میں تمہیں کوئی ایسا مرد نہ ملے۔“ شہزاد نے بات کو ہلکے پھلکے انداز میں ختم کرنے کی کوشش کی، اور اس کے اس جملے پر رومیہ کے چہرے پر بے ساختہ سا گلابی رنگ چھلکا۔  
اس کے ذہن کے پردے پر اسل کا چہرہ نمودار ہوا، جو کل دھڑلے سے اس کے گھر تک پہنچ گیا تھا، اور اس منظر کو یاد کرتے ہی ایک دلکش مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا، شہزاد کی زیرک نگاہوں نے بھی اس کے چہرے کے تاثرات کو تیز ہی پڑھا۔

”کیا ہوا۔؟ کیا ایسا کوئی شخص ڈھونڈ لیا ہے تم نے۔؟“ اس نے دانستہ لاپرواہی سے اسے چھیڑا۔  
”نہیں تو، بھلا کہاں سے ڈھونڈوں گی۔“ وہ صاف مکر تے ہوئے بولی۔ ”ویسے ہی تمہاری بات پر تھوڑا غور و فکر کیا تو قسم سے اپنے سوشل سرکل کا ایک بھی بندہ ذہن میں نہیں آیا۔“ رومیہ کے دل جلے انداز پر شہزاد نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی۔

”اچھا تم چھوڑو ان باتوں کو، میں جا کر دیکھتی ہوں مام کو۔“ شہزاد مسکراتے ہوئے ٹینا بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی، جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، سامنے ٹینا بیگم چھت پر نظریں جمائے بالکل ساکت و جامد لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ اتنا سیاہ تھا کہ اسے ایک لمحے کو خوف سا آیا، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی زندگی سے عاری وجود اس کے سامنے موجود ہو۔

شہزاد کو دیکھ کر بھی ان کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ چلتے چلتے ان کے پاس پہنچ گئی، اور ہلکا سا جھجک کر ان کے ماتھے کا بوسہ لیا، ٹینا بیگم کے چہرے پر ہلکا سا تغیر رونما ہوا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ان کی یہ بیٹی محبتوں کے اظہار کے معاملے میں بالکل کوری ہے اور رومیہ تو اپنی بڑی بہن کے لیے اکثر مشین یارو بوٹ کا لفظ استعمال کرتی تھی۔

”مام کیسی ہیں آپ۔؟ آپ کو پتا ہے، پی سی میں ویک اینڈ پر ایک فیشن ویک اشارٹ ہو رہا ہے۔“  
شہزاد نے دانستہ اپنے گھج کو ہلکا جھکا رکھا۔ ٹینا بیگم اس کی بات پر پھیکے سے انداز میں ہلکا سا مسکرائیں۔  
شہزاد نے ان سے ہلکی چٹکی سی معمول کی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ان کی میڈیکل فائل اٹھائی اور پھر میڈیسن پر سرسری سی نگاہ ڈال کر لاپرواہی سے پوچھا۔

”رات کی ڈونڈ نہیں لی ناں آپ نے۔؟ میرا انتظار کر رہی ہوں گی، پتا ہے مجھے۔“ شہزاد نے بڑی محبت

ان کی دوا ان کی طرف بڑھائی۔

”میرا دل نہیں چاہتا۔“ انہوں نے نظریں چرا کر آہستہ سے کہا۔  
”آپ سے ہمیشہ میں نے ایک چیز سیکھی ہے کہ زندگی کے فیصلے دل سے نہیں دماغ سے کرنے چاہئیں ہے ناں۔؟“ اس نے ماں کو بولنے کے لیے اکسایا۔  
”فیصلہ چاہے دل کا ہو یا دماغ کا، جو خواری قسمت میں لکھی ہو، انسان اس سے نہیں بچ سکتا۔“ وہ اس مردگی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”اگر خواری ہی کاٹنی ہے تو پھر مزے سے کاٹنی چاہیے مام، چلیں انھیں اور فائٹ کھائیں میڈیسن۔“ وہ بڑی مہارت سے ان کو ایک ایک کر کے سب دوائیاں کھلائی گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ اچھی خاصی گپ شپ لگا کر ٹینا بیگم کے پاس سے اٹھنے لگی تو انہوں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
اس نے حیرانی سے اپنی ماں کا زرد چہرہ دیکھا۔ ”کیا ہوا مام۔؟“

”شیری اتم دنیا کی سب سے میٹ بیٹی ہو۔“ ٹینا بیگم کے لہجے میں موجود محبت کو محسوس کر کے اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔  
”شاید اس لیے کہ میں دنیا کی سب سے میٹ مام کی اولاد ہوں۔۔۔۔۔!!!“ اس نے محبت سے ان کا ہاتھ دبایا۔

”میں اچھی ماں ہوتی تو رومی کے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔“ ان کا دماغ اسی ایک پوائنٹ پر آکر رک گیا تھا۔ شہزاد نے ان کی آنکھ کے کونے پر اٹکے ہوئے آنسو سے بے ساختہ نظریں چرائیں۔  
”اگر رومی کی قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا تو میں یا آپ ل کر بھی اسے نہیں بچا سکتے تھے، اس لیے جو ہونا تھا اسے بھول جائیں اور نیکسٹ کے لیے سوچیں، کیونکہ ہم دونوں کو آپ کی ضرورت ہے۔“ اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں پوری کوشش کروں گی۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔  
”تھینک یو۔ ہاں انکل سیٹی سے بات کر لیجئے گا، بہت اپ سیٹ ہیں وہ آپ کے لیے۔“ شہزاد دروازے کی طرف جاتے ہوئے لاپرواہی سے گویا ہوئی۔

اور اس کی بات پر ٹینا بیگم کے چہرے پر نمودار ہونے والی مسکراہٹ ایک پل کو غائب ہوئی اور اس کی جگہ تشکر نے لے لی تھی، وہ جانتی تھیں کہ شہزاد کا دل بہت بڑا ہے اور وہ اپنی ماں کو انسان ہونے کا کافی مارجن دیتی تھی، ورنہ ایسی کسی بات کی توقع وہ رومیہ سے تو ہرگز نہیں کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

برہان کا دماغ اس وقت شدید کھولنے کی زد میں تھا۔  
ٹھنڈے تازہ موسم میں بھی وہ رات کے اس پہر اپنے گھر کے سامنے والے لان میں مسلسل ٹہل رہے تھے۔  
ٹہلنے ہوئے وہ ہادی کے گھر کی طرف غصے سے نگاہ اٹھا کر دیکھتے اور اس کے ساتھ ہی ان کے وجود میں اٹھتا لاوا پھٹنے کے قریب۔ ہو جاتا۔

طوبی اور عمیرہ کی باتوں نے انہیں گویا آسمان سے زمین پر لا پٹا تھا، انہیں درشہوار کا منابل کے فنکشن میں اسرار کر کے جانا اور بار بار منابل سے شادی کے لیے اکسانے کے پیچھے موجود اصل وجہ سمجھ میں آگئی تھی، جو خاصی نالاوردل دکھا دینے والی تھی۔

میر برہان اور ان کی بہن در شہوار ایک ہی کشتی کے مسافر تھے لیکن برہان کی خاندانی روایات اور نام نہاد غیرت اپنی بہن کے معاملے میں ان کو اپنا ظرف بڑا کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دے رہی تھی تب ہی تو وہ اس وقت آگ بگولہ ہوئے گھوم رہے تھے، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ در شہوار کے کمرے میں کھس کر اس کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دیتے یا اس کی گردن تو ضرور ہی مروا دیتے۔

”واہ میر برہان واہ، اپنے لیے زندگی کے اصول الگ اور بہن کے لیے علیحدہ.....“ ان کے اندر موجود ضمیر نامی چیز استہزائے انداز میں کہتی۔

”ہاں ہاں، میں اپنے خاندان کی کسی عورت کو اپنی روایات سے بغاوت کی اجازت نہیں دے سکتا، میں بے شک یورپ سے پڑھ کر آیا ہوں لیکن داہی بالکل ٹھیک کہتے ہیں، ہماری کوئی مشرتی اور خاندانی روایات بھی ہیں.....“ انہوں نے ضمیر کی آواز دبانے کی کوشش کی۔

اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑی اتانیہ نے یہ منظر انتہائی دکھی انداز سے دیکھا، اسے میر برہان کی پریشانی بے بسی اور افسردگی کے پیچھے بس مناسبت قریبی کا ہی چہرہ نظر آ رہا تھا۔ جو اسے رات بھر..... دکھی کرنے کے لیے کافی تھا جبکہ برہان کا سوچنے سوچنے داغ شکل ہو گیا تو وہ فیصلہ کن انداز میں کھڑے ہوئے۔

”مجھے امی سے بات کرنی چاہیے، کیونکہ ہمارا خاندان ایسے کسی اسکینڈل کا تحمل نہیں ہو سکتا۔“ وہ تیز تیز قدموں سے لان عبور کر کے گھر کے اندر داخل ہوئے، جس وقت وہ تاجدار بیگم کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہے تھے اس وقت میر ہاؤس کے ہال کمرے میں لگے گھڑیاں پڑھانی بیچے کا وقت تھا۔

”برہان تم؟“ خیریت تو ہے ناں بیٹا.....“ تاجدار بیگم انہیں سامنے دیکھ کر بوکھلا گئیں، ان کی آنکھوں سے نیند ایک جھٹکے سے غائب ہوئی۔

”مجھے آپ سے انتہائی ضروری بات کرنی ہے ابھی اور اسی وقت.....“ برہان جانتے تھے کہ میر عیشم اس وقت اسلام آباد والے گھر میں ہیں، اسی لیے وہ بے دھڑک ماں کے کمرے کی طرف چلے آئے۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں.....؟“ وہ پریشانی سے ان کا بازو پکڑ کر اپنے بیڈ کے پاس لے آئیں، ان کا دل انہونی کے خیال سے کانپنے لگا۔

”امی! جو بات میں آپ کو بتا رہا ہوں، یہ آپ کے اور میرے بچ رہنا چاہیے، وعدہ کریں مجھ سے.....؟“

”ہاں ہاں بولو۔ کیوں پہیلیاں بکھوار ہے ہو۔؟“ انہوں نے خوف زدہ انداز میں اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، اتنا تو انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر کوئی بم پھوڑنے ہی آئے ہیں۔

”بولو ناں برہان، جب کیوں ہو؟“ انہیں شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر وہ جھنجھلا گئیں تو انہوں نے دل کڑا کر کے اپنا منہ کھول لیا۔ وہ ہنسنے سے انہیں در شہوار اور ہادی کے بارے میں سب بتاتے چلے گئے۔

جسے سنتے ہی تاجدار بیگم کا چہرہ بھی انڈے کی زردی کی مانند پیلا ہو گیا، وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بیڈ پر بیٹھیں، ابھی تو شاہ میر کی لائی ہوئی قیامت کو وہ اپنے اوپر پھیل رہی تھیں اور اب در شہوار کے تازہ ترین کارنامے نے ان کو دہلا دیا تھا۔

”اودہ میرے خدایا، یہ میری اولاد کا باجماعت داغ کیوں خراب ہو گیا ہے، یہ سب مجھے اباجی کی نظروں میں دلیل کر کے ہی رہیں گے، اس در شہوار کی تو میں ابھی جا کر طبیعت درست کرتی ہوں۔“ وہ جذباتی انداز میں کھڑی ہوئیں۔

”اسی اخوانوہ کی جذباتیت سے مسئلہ مت بگاڑیں، تھوڑا تحمل سے کام لیں، یہی سب کچھ کرنا ہوتا تو میں

۱ سے بہتر کر سکتا تھا.....“ برہان نے جھنجھلا کر اپنی ماں کا ہاتھ پکڑا اور انہیں بیڈ پر دوبارہ بٹھایا۔

”میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا، اس بے وقوف لڑکی کو نہیں پتا، ہمارے ہاں عورتیں تو دور کی بات مردوں کی شان پاں بھی خاندان سے باہر نہیں کی جاتیں، بھول گئی وہ ماضی کا کٹ قصہ، آدھا گاؤں جل مرا تھا جس میں میری روح انداز سے گویا ہوئیں۔

”آپ در شہوار کی خمدی طبیعت کو اچھی طرح سے جانتی ہیں، اسے جس کام سے منع کیا جائے، وہ کرنا تو اس پر گویا فرس ہو جاتا ہے، اس لیے میرے خیال میں ہمیں عقل مندی سے اس سارے معاملے کو ہینڈل کرنا ہوگا.....“ برہان نے اپنی ماں کو سمجھایا۔

”اور وہ طریقہ بھی اب تم ہی بتا دو، کیونکہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”مجھے تو داہی سولی چڑھائی رہے ہیں، ساتھ میں یہ قصہ بھی بننا دیں.....“ ایک تلخ مسکراہٹ نے ان کے لبوں کا احاطہ کیا۔

”وہ کیسے؟ محل کر بتاؤ بیٹا، میرا تو اس وقت داغ ہی کام نہیں کر رہا.....؟“ انہیں اپنی ماں پر بری طرح سے قس آیا، جنہوں نے ایک اچھی بہو بننے کے لیے ساری زندگی داؤ پر لگا دی تھی لیکن اب ان کی اپنی ہی اولاد ان کی ساری عمر کی عزت کو داؤ پر لگانے کے لیے تلی بیٹھی تھی۔

”در شہوار اور ارسل کا نکاح کر دیں، بلکہ میری مائیں ڈائریکٹ رخصتی بھی کر دیں، کیونکہ ارسل کی تعلیم مکمل ہونے والی ہے اور بابائے ایک ملٹی منٹل کمپنی میں اس کی جاب کے لیے بات بھی کر لی ہے.....“ ان کے مشورے پر تاجدار بیگم کے چہرے پر..... سکون کی کیفیت پیدا ہوئی۔

”لیکن ارسل کے لیے تو ندرت، طوبی کا سوچے بیٹھی ہے.....“ وہ پریشان ہوئیں۔

”طوبی کی بعد میں دیکھی جائے گی پہلے آپ اپنے گھر میں لگی ہوئی آگ تو بجھائیں، فوراً بات کریں داہی سے بالکل بھی وقت ضائع نہ کریں، ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی.....“ برہان کے لہجے کی سنگینی نے ان کو ایک بار پھر دہلا دیا۔

ان کا ذہن تیزی سے تانے بانے مچنے لگا، خاندانی سیاست اور جوڑ توڑ میں ان کا داغ ویسے ہی بہت تیز

چلتا تھا اور اس بات کا اعتراف تو پورا خاندان کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برہان کو تسلی تھی کہ اس کی والدہ یقیناً بہت جلد اس مسئلے کا حل نکال لیں گی۔

☆☆☆

کانی کا لگ لیے شہزادہ کھڑکی کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر آن کھڑی ہوئی۔

اس کے سیل فون کی مزنم گھنٹی بجی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل نے بے ربط انداز میں دھڑک کر گواہی دی کہ اس وقت اس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ شہزادہ نے مسکراتے ہوئے..... کال اٹینڈ کی۔

”آج آپ بتا ہی دیں، کب تک یہ آنکھ بھولی کا کھیل جاری رہیں گے میرے ساتھ.....؟“ اس نے طوکیا۔

”جب تک آپ میرے رقبوں کے ساتھ گھومنا پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا بند نہیں کریں گی.....“ دوسری طرف ہم راہی غیر سنجیدہ تھا۔

”آپ کو یہ کیوں لگتا ہے کہ ساری دنیا بس میرے ہی پیچھے ہے.....“ وہ مسکرائی۔

”تم ساری دنیا کو چھوڑو، یہ سسر قریبی کا بیٹا، کس چکر میں اتنا جڑ کر بیٹھا ہوا تھا تمہارے ساتھ۔؟“ اس کے دل جلے انداز پر وہ بے ساختہ ہنسی۔ وہ۔۔۔ اسے انتہائی احترام سے کبھی ”آپ“ کہہ کر اور کبھی بے تکلفی کی ساری حدیں عبور کر کے ”تم“ پر اتر آتا۔

”آپ بھی تو ہیں موجود تھے ناں، آپ وہاں آکر بیٹھ جاتے، کس نے منع کیا تھا۔۔۔“ وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئی۔

”جس دن میں بیٹھ گیا ناں تمہارے پاس، ساری زندگی کے لیے اٹھنا بھول جاؤ گی۔۔۔“ اس کے ذومعنی انداز پر شہر زاد کی دھڑکن رکی۔

”اور میں جانتی ہوں، وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔۔۔“ اس نے مسکرا کر اطلاع دینے کے انداز میں کہا۔

”وجہ پوچھ سکتا ہوں۔؟“ وہ ہلکا سا بے چین ہوا۔

”نہ آپ میں اتنی ہمت ہوگی کہ اپنی نقاب کشائی کر سکیں اور نہ آپ زندگی میں کبھی میرے سامنے بیٹھنے کی جرات کر سکیں گے، اس لیے معاملہ بیچ میں ہی انکار ہے گا، ویسے حد ہونی ہے بزدلی کی بھی۔۔۔“ وہ سراسر اسے اکسارتی تھی اور دوسری طرف وہ اس کی بات کے اندر چھپے مفہوم کو سمجھ کر ہنسا۔

اسی وقت ہم زاد کے پیڑروم کا دروازہ کھلا اور پہل فون کے ریسپونڈر سے آتی ہوئی ایک اور مردانہ بھاری آواز پر شہر زاد کے کان کھڑے ہوئے، کوئی اس کے بہت قریب آکر انگلش میں بولا تھا۔

”بیٹا، یہ فٹنس ہیں اور صبح جگھے بجے چیک ان شروع ہو جائے گا، ایر پورٹ ٹائم سے پہنچنا ہے، اس لیے ٹائم سے سو جانا۔۔۔“

”ابی! چیک ان کو چھوڑیے، میرا تازہ ترین غم سنئے، آپ کا دل بھی دہل جائے گا۔۔۔“ وہ شرارت سے اسے سناتے کو بلند آواز میں گویا ہوا۔

”فون پر بات کر رہے ہو تم۔۔۔“ انہوں نے تصدیق چاہی۔

”جی ہاں، اور پتا ہے فون کے دوسری طرف موجود لڑکی آپ کے بیٹے کو بزدل اور کم ہمت کہہ رہی ہے۔“ اس نے اپنے باپ کو بھڑکانے کی کوشش کی۔

”اور وہ لڑکی شہر زاد کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔“ اس مردانہ جملے پر وہ ساکت ہوئی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم زاد کے خاندان کا کوئی اور فرد بھی اسے جانتا ہوگا۔ کافی کنگ پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی۔ جب کہ اس کا رواں رواں جسم سماعت بن گیا۔

”میں اس کے علاوہ اور کس سے بات کرتا ہوں۔؟ ابی کیوں مشکوک کر رہے ہیں آپ اسے میری طرف سے۔۔۔“ وہ شوخ لہجے میں گویا ہوا جبکہ شہر زاد خود کو ایک عجیب سی صورت حال میں پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”اچھا نا لائق انسان! میری بات کرو اور اس سے۔۔۔“ دوسری طرف سے آنے والی فرمائش پر شہر زاد کا دل بڑی طرح سے دھڑکا۔

”بات کرو گی میرے قادر سے۔؟“ وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔! یہ سہری موقع وہ کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔۔۔“

”یہ لیں ابی، پیلیز، میری شکایتیں مت لگایے گا۔ ایسا نہ ہو، وہ پھر مجھ سے ڈر کر دوبارہ لندن بھاگ جائے۔۔۔“ اس نے فون ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے نصیحت کی۔

”ہیلو بیٹا! ہاؤ آر یو، اس نا لائق کی باتوں کو دل پر لینے کی ضرورت نہیں، اسے شروع ہی سے ڈرامے بازی

لے کی عادت ہے۔“ وہ امریکن انگلش لہجے میں بہت پیار اور اپنائیت سے گویا ہوئے۔

”ڈونٹ وری انکل! بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں میں بھی۔۔۔“ اس نے بھی انگلش میں ہی جواب دیا۔

”تم مجھے ابی کہو گی تو اچھا لگے گا مجھے۔۔۔“ ان کی اگلی فرمائش اردو میں آئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا دی۔

”کیسے ہیں آپ۔۔۔؟ اور کیا چل رہا ہے آج کل۔۔۔؟“ اس نے فوراً ہی پوچھا۔

”لائف اچھا لگتا، بہت اسٹیل ہے، کل میں اور یہ نا لائق جا رہے ہیں امریکہ، شاید اس نے بتایا ہو تمہیں۔۔۔“ ان کی اس اطلاع پر اس کا دل یکبارگی دھڑکا۔

”نہیں، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”آپ تو زیادہ ہی فری ہو رہے ہیں، ٹائف فون دیں میرا اور جا کر سو جائیں۔۔۔ گڈ نائٹ۔۔۔“ وہ ان سے اپنا فون واپس لے چکا تھا۔

”او کے بیٹا، گڈ نائٹ، الارم لگا لیتا، ورنہ فلائٹ نکل جائے گی۔۔۔“ وہ کمرے سے نکلتے نکلتے بولے۔

”کیوں، ڈر گئے، کہیں آپ کی اصلیت نہ بتا دیں مجھے۔۔۔“ شہر زاد نے اسے چھیڑا۔

”تم پوچھ لیتیں تو وہ بھی جھوٹ نہ بولتے۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اچھا تو پھر دوبارہ بات کروائیں میری۔۔۔“ وہ بے تاب ہوئی۔

”کیوں، میں صبح و شام گھاس کھاتا ہوں کیا۔؟ اتنا پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے۔۔۔“ اس کا لہجہ شوخ تھا اس لیے اس نے بات ہی پلٹ دی۔

”اچھا پھر اپنی می سے بات کروا دیں۔؟“ اس کو بھی نئی شرارت سوچھی۔

”ضرور کروا دیتا، اگر وہ قبرستان میں دائمی نیند نہ سو رہی ہو تیں۔۔۔“

”اوہ سوری۔۔۔ مجھے پتا نہیں تھا۔۔۔“

”اُس او کے ڈونٹ وری۔۔۔“

”اور بہن بھائی۔۔۔؟“ اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ایک جھوٹا بھائی کراچی میں پوسٹل ہے ان دنوں اور سب سے چھوٹی بہن اسپیشلائزیشن کرنے امریکہ گئی ہوئی ہے۔“ اس نے پہلی دفعہ اپنی فیملی کے بارے میں اتنی تفصیل سے کھل کر بتایا تھا۔

”اور آپ کیا کرتے ہیں۔۔۔؟“ وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئی۔

”ایک مصروف سی پیاری سی لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور دن رات اس کی جھاڑ کھاتا ہوں، اتنے سالوں سے اسے چنانے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن افسوس وہ مجھے گھاس ہی نہیں ڈال رہی، دیکھا۔ میں کتنا مشکل کام کرتا ہوں۔۔۔“ وہ پھر پٹری سے اترا۔

”آپ سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے، انتہائی فضول انسان ہیں آپ۔۔۔“ دوسری طرف موجود شہر زاد اس کی فیئر سنجیدگی پر تپ گئی، اس نے غصے سے فون بند کیا اور اگلے۔۔۔ میں سیکنڈ کے بعد اس کی کال دوبارہ آنے لگی، اس بار شہر زاد نے فون ہی آف کر دیا۔

”میں ہی پاگل ہوں، جو اتنے عرصے سے اس کے ہاتھوں بے وقوف بن رہی ہوں، اگر کسی کو پتا چل جائے تو یقیناً میری عقل پر ماتم ہی کرے۔۔۔“ وہ غصے سے اٹھ کر بیٹھنے لگی۔



”آخر مجھے اس سے بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جو بندہ اپنی شناخت چھپا سکتا ہے، وہ کیسے قابل اعتبار ہو سکتا ہے۔“ ایک اور سوچ نے اس کے دماغ کا احاطہ کیا، اس نے خود کو کونسا چھوڑا اور اپنا لپ ٹاپ اٹھایا، اس کا ارادہ بنیدگی سے اب کچھ کام کرنے کا تھا۔ اسی وقت ملازمہ ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں کارڈ لیس فون دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ دوسری طرف ہم زاد کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا، اس نے یقیناً اس کا سیل فون آف دیکھ کر اس کے گھر کے نمبر پر کال کر لی تھی۔

”بی بی جی! کال ہے آپ کی۔“ ملازمہ نے اس کی طرف کارڈ لیس بڑھایا جو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی پکڑنا پڑا۔

”اچھا جاؤ تم۔“ اس کی توری کے بل گھرے ہوئے۔

ملازمہ کے کمرے سے نکلے ہی وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑتے ہی ناراضی سے شروع ہو گئی۔ ”ہزار دفعہ میں نے آپ سے کہا ہے، گھر کے نمبر پر کال مت کیا کریں مجھے، لیکن آپ کو یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آتی، کیوں ہاتھ مند دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں میرے۔“

”آئی ایم سوری، شیر ی یہ میں ہوں ارنقی حیدر۔“

ریسیور کے اندر سے نکلنے والی ارنقی کی آواز سن کر اسے لگا جیسے کسی نے فریج سے ٹھنڈے بخ پانی کی بوتل نکال کر اس کے اوپر الٹ دی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ارنقی سی جم گئی اور کانوں میں شائیں شائیں کا شور بڑھ گیا۔

”اس سے پہلے تو آپ نے مجھے کبھی گھر کے نمبر پر کال کرنے سے منع نہیں کیا۔“ اس کی خفت زدہ آواز سن کر شہر زاد کا شہت سے دل چاہا کہ وہ جا کر اس کے منہ پر مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دے، اس کا ایک ایک لفظ اسے شرمندگی کی گہری دلدل میں ڈھیل رہا تھا۔

”اوہ آئی ایم سوری، میں کوئی اور بھی تھی۔“ اس نے پوری طاقت لگا کر چند لفظ بولے۔

”اگر آپ کو کوئی تنگ کر رہا ہے تو مجھے بتائیں، یہ تو کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے، دودن میں حل ہو جائے گا۔“ دوسری طرف موجود ارنقی کبھی سمجھ چکا تھا کہ اسے جھاڑ کسی اور کی غلط فہمی کے نتیجے میں پڑی ہے، لیکن اس غلط فہمی نے اس کے سارے حواس چوکس کر دیے تھے۔

”اٹس اوکے ارنقی، آپ نے خیریت ہے اس وقت کال کی۔“ اس نے جان بوجھ کر موضوع گفتگو بدلا لیکن اس کا ہاتھ عرق انفعال سے تر تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ فوراً فون بند کر دے لیکن یہ اس سے بھی بڑھ کر بدتہذیبی ہوتی۔

”صبح رہے کی پیشی ہے اور میں چاہتا ہوں آپ کچھ پوائنٹس انہیں راستے میں اچھی طرح سے سمجھا دیں۔ میں نے آپ کو ابھی ایک ای میل کی ہے، آپ ٹائم نکال کر اسے چیک کر لیجیے گا۔“ وہ بڑے مہذب انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

”جی تھینک یو، میں ابھی دیکھ لیتی ہوں، صبح ان شاء اللہ بات ہوگی۔“

اس نے جیسے ہی فون بند کیا، کارڈ لیس کی گھنٹی ایک دفعہ پھر بج اٹھی۔ اس دفعہ اس نے ذرا احتیاط انداز میں بیلو کہا۔

”اس طرح خفا ہو کر فون بند کر دی تو ساری رات سو نہیں پاؤں گا۔“ ہم زاد کا مخصوص لہجہ سن کر اس کے حلق سے ایک لمبی سانس برآمد ہوئی۔

”اور اتنی لمبی لمبی سانسیں لوگی تو اسلام آباد کا موسم مزید سرد ہو جائے گا۔“

”آپ کو پتا ہے، اس وقت کیا ہوا ہے۔؟“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔ ”آپ کے فون کال سے پہلے ارنقی کی کال آئی تھی اور میں نے آپ کے چکر میں اس بے چارے کو بُری طرح سے جھاڑ دیا اور بعد میں پتا چلا وہ آپ نہیں تھے۔“

”دیش گریٹ۔۔۔۔۔۔!“ اس کی بات سن کر وہ بے ساختہ ہنسا۔ ”گندی گندی گالیاں دی تھیں ناں اس خبیث کو۔؟ پولیس یو نیفارم پہن کر خود کو دنگ والا ہیرو سلمان خان ہی سمجھنے لگتا ہے گدھا۔۔۔۔۔۔“ اس کی شوخی آج عروج پر تھی۔

”کیا چیز ہیں آپ۔۔۔۔۔۔“ وہ نہ جانتے ہوئے بھی اس کی باتوں پر ہنس پڑی۔

”تھینک یو، آج رات بہت سکون کی نیند آئے گی مجھے، بس آپ یونہی میرے رقبوں کو جھاڑتی رہا کریں، اب اجازت دیں، ٹیک کبیر، بائے۔۔۔۔۔۔“ وہ فون بند کر چکا تھا، شہر زاد نے بھی اپنی فائل اٹھائی اور اس پر نیکسٹ پیشی کے نوٹس لکھنے لگی۔

☆☆☆

”ہادی یار، بات تو خاصی سچی ہے یہ۔۔۔۔۔۔“ سعد نے فحاشا انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”سچی ہے ہی نہیں باعث رسوائی بھی۔“ ہادی نے اپنا شل ہوتا ہوا دماغ سنبھالتے ہوئے سعد کی طرف دیکھا، وہ دونوں دوست اس وقت مال روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں موجود تھے اور ان کے سامنے رکھی آکس کریم کافی حد تک پھل چکی تھی۔

ہادی جب سے مری واپس آیا تھا۔ اس وقت سے شدید قسم کی ٹینشن کا شکار تھا، منال کی خود سری نے اس کے ہاتھوں کے توتے اڑا دیے تھے اور اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ وہ ضدی لڑکی جس چیز کے لیے اڑ جاتی، اسے حاصل کر کے ہی دم لیتی تھی۔

اس نے کافی غور فکر کے بعد سعد سے یہ بات ضمیر کرنے کا فیصلہ کیا، اور اسی لیے اسے لے کر یہاں آیا تھا، راستے میں آتے ہوئے وہ اسے کافی تفصیل سے منال اور برہان کا قصہ سنا چکا تھا۔

”میرے خیال میں تمہیں فوراً آٹنی سے بات کر لینا چاہیے۔“ سعد نے بنیدگی سے اسے مشورہ دیا۔

”لیکن اس سے پہلے میں میرا برہان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ ہادی کی بات پر وہ چونکا۔

”میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ جب کوئی لڑکی اس حد تک خود سری اور ضد پر اتر آئے تو یقیناً اس کے پیچھے کسی مرد کی دی ہوئی شہہ ہی ہوتی ہے۔“ سعد نے اپنا تجربہ پیش کیا۔

”تمہارے خیال میں میرا برہان سیریس ہے اس کے لیے۔؟“ اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

”اس کے سیریس ہونے سے کچھ نہیں ہوگا کیونکہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ لوگ خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے اور اگر کر بھی لیں تو انہیں وہ عزت اور اہمیت نہیں دیتے جو ایک عورت کا بیوی بننے کے بعد ملتی ہے۔“

”ہاں میرا خاقان علی کے چٹ پٹے قصے کون نہیں جانتا، سوائے میری بے وقوف بہن کے۔“ ہادی نے طعنے انداز میں لقمہ دیا۔

”تمہیں یہ بات تفصیل سے بتانی چاہیے منال کو۔۔۔۔۔۔“

”وہ کچھ سننے کو تیار بھی تو ہو، برہان نے اس کا دماغ کافی خراب کر رکھا ہے، اسے میری فیملی کی غلط رپورٹیشن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ خاصا تپا ہوا تھا۔

”مجھے لگتا ہے یہ ساری برہان کی، کی ہوئی برہان واشک ہے، بلکہ پورا خاندان ہی اس کام میں ماہر ہے اب اس کی بہن کو بیوی دیکھ لو، کتنی کوشش کی اس نے تمہاری توجہ حاصل کرنے کی.....“ سعد نے سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

”حالانکہ اس سے آدمی کوشش تمہارے لیے کرتی تو اب تک تم دونوں بھاگ کر شادی کر چکے ہوتے۔“ ہادی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”بکواس بند کرو، میرا دماغ سیٹ ہو چکا ہے اب، اور ویسے بھی مجھے اتنی منہ زور لڑکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں.....“ وہ پہلی دفعہ اتنا خٹل کر بولا۔

”تو صاف صاف کہو: اس کے خاندان کے ساتھ کوئی بگاڑ نہیں کر سکتے.....“ ہادی نے اسے چھیڑا۔

”اتنے بھی پیچھے خان نہیں ہیں وہ، اور شاید ان کا مقابلہ کر بھی لیتا، لیکن سچ پوچھو تو درشہواری کی خود سری اور بے باکی نے دل کھنا کر دیا ہے میرا، اور ویسے بھی اس کے تمام تر نیک جذبات اب صرف تمہارے لیے ہیں تو میں پھر اس دیوار سے سرکیوں پھوڑوں.....“ سعد کے لہجے کی چائی گواہی کر اسے عقل آچکی ہے۔

”اس کا مطلب ہے کہ میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں.....؟“ ہادی ہنوز شرارتی موڈ میں تھا۔

”ہاں۔ اگر تم اس کے ساتھ بھاگنا چاہو تو میں اس کا انتظام کروا سکتا ہوں.....“ سعد نے بھی اپنا حساب پورا کرنے کی کوشش کی

”نش اب.....؟“ اس نے نہ اسامہ بنایا۔

”یقین مانو، میرا خاندان سے بدلہ لینے کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے اگر میرا برہان نے منائل کے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کی تو شطرنج کا یہ میرا کھیل کر تم اس خاندان کو ناکوں پنے چبوا سکتے ہو.....“ سعد نے اسے ایک نئی پٹی بڑھانے کی کوشش کی۔

”یہ دیکھو.....!“ ہادی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ”ابھی اتنا بڑا وقت نہیں آیا مجھ پر کہ میں کسی عورت کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاؤں، اگر ایسا کوئی موقع آیا بھی تو میں خود سینہ تان کر ان کے سامنے جاسکتا ہوں.....“ اس نے بیزار سی جواب دیا۔

”ہاں ایک بہادر ماں کے بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہیے.....“ سعد اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

”چل اب اٹھ یہاں سے، سردی میری رگوں میں گھسی جا رہی ہے.....“ ہادی اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ گھسا کر کھڑا ہوا۔ وہ دونوں لمبی واک کرتے ہوئے جب مال روڈ سے نکلے تو سعد چلتے چلتے چونکا۔

”شاہ میرا کاس لڑکی کے ساتھ کوئی جکر چل رہا ہے کیا.....؟“

”ایف سی کے عین سامنے کھڑے شاہ میرا طوبی کو دیکھ کر سعد نے سرگوشی کے انداز میں تبصرہ کیا تو وہ تپ اٹھا۔“ اس خاندان کے لڑکے لڑکیوں کو بھی لگتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے، اب اس سے سلام دعا کرنے مت کھڑے ہو جانا، بس آنکھ بچا کر نکل جاؤ.....“

ہادی اور سعد دونوں کمال کی اداکاری کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوئے، دوسری طرف شاہ میر بڑی دلچسپ اور شرارتی نگاہوں سے طوبی کی طرف دیکھ رہا تھا، جو اس کے دیکھنے پر تھوڑا بڑل ہو رہی تھی۔

”قسم سے طوبی، اس رومانس کا مزہ لینے کے لیے تو مجھے کافی عرصہ پہلے ہی گھر پھوڑ دینا چاہیے تھا.....“ شاہ میر نے ڈسپوزیبل گلاس میں اسٹرا گھماتے ہوئے طوبی کو جان بوجھ کر چھیڑا۔ وہ دونوں آج سب سے نظر بچا کر یہاں اکٹھے تھے۔

”آج تو آگئی ہوں، دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گی.....“ طوبی نے اسے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

”یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلے گا جناب، ویسے بھی اپنی محبت پر اتنا یقین ہے مجھے کہ کچے دھاگے سے چلے میں گے سرکار بندہ.....“ وہ شوخی سے گویا ہوا۔

”آپ کی فضول باتیں ختم ہو گئی ہوں تو کیپٹن صاحب! مجھے گھر چھوڑ آئیں، دابھی آگئے تو آپ کا تو پتا نہیں میرا کورٹ مارشل ضرور ہو جائے گا۔“ طوبی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ڈسپوزیبل گلاس ڈسٹ بن میں اچھالا تو شاہ میر نے بھی رسٹ وائچ پر ناٹم دیکھا، شام کے پانچ بج رہے تھے اور اس سے زیادہ باہر رہنا دونوں کے لیے خطرناک تھا۔

☆ ☆ ☆

”غضب خدا کا، پورے میر ہاؤس کا حلیہ بگڑ چکا ہے.....!“

میر حاکم ٹیلیٹ ٹیلیٹ رے کے اور مزید گویا ہوئے۔ ”جس کو دیکھو ہر کوئی اپنا اپنا قبلہ بنائے بیٹھا ہے آج کل“

بہت دن بعد آج میر حاکم کے سامنے تاجدار بیگم کی بیٹی تھی، اور وہ جو شاہ میر کے گھر سے نکالے جانے پر احتجاجاً سب کا بائیکاٹ کر کے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر چکی تھیں، انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس بار میر حاکم سیدھا ان ہی کے بڈروم میں آکر کچہری سچائیں گے۔

”تایاجی! اس گھر میں میرے علاوہ بھی اور لوگ ہیں.....“ تاجدار بیگم نے ڈھکا چھپا انداز اپنایا۔

”جانتا ہوں میں، تمہارا اشارہ شارڈ اور ندرت کی طرف ہے، ان میں اتنی عقل ہوتی تو مل کر خاقان کو نہ سنبھال لیتیں، وہ جگہ جگہ منہ مارتا نہ بھرتا اور نہ ہی اس کی رنگ برنگی داستانیں سننے کو ملتیں۔“ ان کا طنزیہ انداز تاجدار بیگم کے دل و دماغ پر پھوار بن کر برسا۔

انہوں نے جتنی ہوئی نگاہوں سے اپنے سامنے خاموش بیٹھے میر مختشم کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہی ہوں کہ سن لیں اس خاندان کی واحد سمجھ دار خاتون کا تاج ان ہی کی بیوی کے سر پر ہے، اور سونے پہ سہاگہ نام بھی تو ان کا تاجدار بیگم تھا۔

”آپ کچھ بھی کہیں تایاجی! اس گھر اور خاندان کے لیے میں نے اپنی ہڈیاں تک گلا لیں لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

”آج تک میرا کسی نے لحاظ نہ کیا، اور پورے خاندان کے سامنے دو ٹکے کا کر دیا مجھے، آپ اپنے ایمان سے کہیں، میں کس منہ سے اپنے کمرے سے نکلوں اور اپنی دیورانیوں کے ساتھ جا کر بیٹھوں.....“ انہوں نے جذباتیت کی انتہا کرتے ہوئے آنسو تک نکال لیے۔

”شاہ میر والی بات پر میں ہزار دفعہ معذرت کر چکا ہوں، خدا کے واسطے بس کر دو اب.....“ میر مختشم اپنے والد صاحب کے سامنے دوبار ان ہی باتوں پر جھنجھلا سے گئے اور میر حاکم نے اپنی سب سے لاڈلی بہو کا آنسوؤں سے بھرا ہوا چہرہ دیکھا تو ان کا دل بچ گیا۔

”ماں ہوں میں کیسے بس کر دوں، ساری ساری رات مجھے نیند نہیں آتی، اتنے سالوں سے پوسٹنگ ہو رہی ہے اس کی، پہلی دفعہ تو اپنے گھر کے پاس پوسٹ ہوا تھا اور آپ نے نکال دیا اسے.....“ وہ میر حاکم کو جذباتی کرنے کے لیے ذرا اونچی آواز میں رونے لگیں۔

”اس بے وقوف نے بھی تو ایک دفعہ بھی معافی مانگنا گوارا نہیں کی اپنے باپ سے۔“ میر مختشم ہلکا سا جڑ کر

بولے۔  
”اسی سلسلے میں دو تین بار آپکا ہے وہ، لیکن میں نے ہی بھگا دیا کہ تمہارا باپ سخت غصے میں ہے۔“  
تاجدار نے آنسو پونچھے ہوئے اپنی طرف سے آدھا جھوٹ اور آدھا سچ بولا، شاہ میر گھر آیا ضرور تھا لیکن صرف اپنی ماں سے ملنے کے لیے۔

”اچھا! مختتم تم چھوڑ دو اپنا غصہ، اولاد ہی ناخبر ہو تو انسان کیا کر سکتا ہے، فون کر کے بتا دینا اسے، جب چاہے آسکتا ہے۔“ میر حاکم علی کی بات پر تاجدار کا چہرہ ایک دم کھل سا اٹھا، ان کے شوہر مختتم صاحب نے جھنجھلا کر انہیں دیکھا لیکن مصلحتاً خاموش رہے۔  
”تایا ابا! ایک اور درخواست کرنی تھی آپ سے۔۔۔۔۔؟“ تاجدار بیگم نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ایک اور کوشش کی۔

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔“  
”مجھے نہیں پتا، آپ میری اس بات کو کیسے لیتے ہیں، لیکن میری اور برہان کی دلی خواہش ہے کہ اس کی شادی کے ساتھ درشہوار اور ارسل کا قصہ بھی بننا دیا جائے۔“ وہ غلط انداز میں گویا ہوئیں۔  
”لیکن درشہوار اچھی توڑا بیچن میرا خیال ہے اسے گرجویشن کر لینی چاہیے۔“ مختتم صاحب نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔

”اس سے بھی چھوٹی عمر تھی میری، جب میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی اور ویسے بھی دو چار سال بعد بھی درشہوار کی عقل میں اضافے کی مجھے تو قطعاً بھی امید نظر نہیں آتی تو اچھا ہے لگے ہاتھوں یہ قصہ بھی نبٹ جائے۔“  
تاجدار بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے میاں کو وہ ساری داستان سنا دیں جس نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔

”ویسے تاجدار کی بات میں دم تو ہے، اچھا ہے گھر کی بچیوں کے فرض سے ہم جتنی جلدی سبک دوش ہو جائیں، تم کیا کہتے ہو مختتم۔؟“ میر حاکم آج اپنی بہو کے چیلن پر ہی چل رہے تھے، ان کی بات پر میر مختتم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔  
”دیکھ لیں بابا جان! جو بات آپ کو مناسب لگے۔۔۔۔۔“

”میری مائیں تو تایا ابا، آپ بس۔ بس۔ اللہ کریں، تیاری میں ایک ہفتے میں کر لوں گی۔ اس کی فکر مت کیجئے گا۔“ تاجدار بیگم نے بے جا تابی سے کہا۔  
”چلیں بابا جان، اس بہانے آپ کی بہو کے پیروں کی مہندی تو اترے گی ناں، ورنہ گھر کا نظام یوں ہی ورہم برہم رہے گا۔“ مختتم صاحب نے بھی اپنی بیگم کا موڈ بہتر کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو میر حاکم مسکرا دیے اور ان کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی رضامندی نے تاجدار بیگم کے سینے پر دھرا بوجھ تھوڑا کم کر دیا تھا۔

☆☆☆

جشن محمود کے بیٹے روحیل کے قتل کے واقعے میں ایک دلچسپ موڑ آیا تھا۔  
رومیہ کی آج صبح عدالت میں پیشی تھی اور وہ شہر زاد اور ارسل کے ساتھ ٹائم پرواہں موجود تھی۔  
اس کے آنے سے پہلے ہی احاطہ عدالت میں مختلف چیلنوں کے رپورٹرز کی چہل پہل نظر آرہی تھی، جو آج کسی خاص خبر کے منتظر تھے اور شہر زاد نے بھی ان کو مایوس نہیں کیا۔

کمرہ عدالت میں دیے جانے والے رومیہ کے بیان کے ساتھ روحیل محمود کے بیسٹ فرینڈ صارم خان کی گواہی نے ہر طرف ایک سنسنی سی چھادی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میڈیا میں رنگ برنگی خبروں کا طوفان آگیا۔  
صارم خان، شہر زاد کی رومیہ کے توسط سے پہنچا تھا اور اسے یہاں تک لانے میں ساری محنت ارسل کی تھی، جو خود بھی اس وقت کمرہ عدالت میں موجود تھا لیکن اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ میڈیا کے کسی نمائندے کے سامنے نہ آئے، بلکہ صارم اور رومیہ کے علاوہ کوئی بھی ارسل کو نہیں جانتا تھا۔

صارم خان نے دو دو گھنٹوں میں کمرہ عدالت میں بتایا کہ اس رات گاڑی رومیہ نہیں کتڑہ وقار چلا رہی تھی اور چونکہ صارم بھی اپنے دوست کی مدد کے لیے اپنی گاڑی پر اس کے پیچھے تھا، چنانچہ یہ سارا منظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا صارم نے مزید یہ دعویٰ نہ بھی کیا تھا کہ یہ بات اس کلب کے چوکیدار کے علاوہ بھی کچھ اور لوگ جانتے تھے کہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر کتڑہ وقار تھی۔

کورٹ سے پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے رومیہ نے کئی دفعہ ارسل کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں میں اس کے لیے ایک خاموش دلاسا تھا، اس کے دہاں ہونے کا احساس رومیہ کو خاصی تقویت بخش رہا تھا۔  
دوسری طرف میڈیا کے نمائندے وقار درانی کے گھر کے باہر براہِ نماز بیٹھ گئے تھے، اور ان کے خاندان میں ایک بالکل سی پچ گئی تھی، وقار درانی کا غصے اور پریشانی سے بُرا حال تھا کیونکہ شہر زاد نے ان کی کوئی بھی کال اسٹینڈ نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”ہم ان شاء اللہ یہ کیس جیت جائیں گے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔۔۔“ رومیہ نے ارسل کا یہ ٹیکسٹ میسج گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پڑھا۔  
”تمہاری محبت میری زندگی کے راستوں کو آسان ہی نہیں بلکہ خوبصورت بھی بنائے گی مجھے اس بات کا یقین ہے۔“ اس نے فوراً یہ میسج ارسل کے نمبر پر بھیج کر گاڑی کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی۔  
شہر زاد اس کے ساتھ بھی مسلسل اپنے ساتھیوں کی کالز اسٹینڈ کر رہی تھی، جو اس کیس میں اس کے ساتھ کھڑے تھے۔

”ویل ڈن شیر۔۔۔۔۔ تم وکٹری اسٹینڈ کے بہت قریب پہنچنے والی ہو۔“ مسز عالیہ قریشی کی کال ہمیشہ اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہے میم۔۔۔۔۔“ اس نے بھی کھلے دل سے اعتراف کیا۔  
مسز عالیہ قریشی کی کال جیسے ہی بند ہوئی، انٹرنیشنل نمبر سے آنے والی اگلی فون کال نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ربط کیا، وہ لاکھوں میل کے فاصلے پر بھی اس کی ایک ایک چیز پر نظر رکھے ہوئے تھا۔  
”تم نے تو اس بار مجھے حیران کر دیا، کہاں سے ڈھونڈ لائی ہو تم صارم خان کو۔۔۔۔۔“ ہم زاد کے لہجے میں چھپی ستائش نے اس کا حوصلہ مزید بڑھایا۔  
”تم ساری باتوں کو چھوڑ دو، یہ بتاؤ میری یہ مو کیسی لگی تمہیں۔۔۔۔۔؟“

”بہت زبردست لیکن وقار درانی کے بارے میں بہت زیادہ غلط ہو جاؤ، وہ اب تمہارے سامنے ہر قسم کا جارہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔۔۔۔۔“ وہ امریکہ میں بھی اس کے لیے فکر مند تھا اور یہ بات شہر زاد کو ہلکا چلکا کرنے کے لیے کافی تھی۔

”آپ بس مجھے ایڑی لیٹا چھوڑ دیں، باقی چیزیں میں خود سنبھال لوں گی۔“ شہر زاد کے لہجے کی کھنک پر رومیہ نے چونک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا، اور پہلی دفعہ اس کے ذہن میں بھی کوئی الارم گونجا، وہ فون بند کر

چکی تھی لیکن اس کے لیے برائے دلکش مسکراہٹ ابھی بھی موجود تھی۔  
دونوں ہمیشہ گھر پہنچیں تو یٹینا بیگم کو خلاف توقع اپنے بیڈروم سے لاؤنج میں دیکھتے ہی انہیں خوش گوار حیرت ہوئی۔ ان کی نظر ابھی سیف الرحمن پر نہیں پڑی تھی جو سنگ لائونج کی دائیں دیوار کے پاس رکھے سنگل صوفے پر براجمان سگار پی رہے تھے۔

”مبارک ہو شیری! درست موقعوں پر درست پتوں کا استعمال ہی کسی بیرشر کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے“  
سیف الرحمن کی سنجیدہ آواز پر وہ دونوں چوکیں اور رومیصہ کا چہرہ تباہ کا شکار ہوا۔  
”ٹھیک یوسر.....“ اس نے پُر وقار انداز میں جواب دیا اور یٹینا بیگم کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”مام کسی ہیں آپ.....؟“

”یہ صارف خان کہاں سے ملا تمہیں۔۔۔؟ وہ بے تابی سے گویا ہوئیں، بہت دن بعد انہوں نے معمولات زندگی کے کسی مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اور یقیناً اس کے پیچھے سیف الرحمن کی محنت اور کاوش تھی۔  
”رومیصہ کے ریفرنس سے آیا تھا وہ لڑکا۔۔۔“ شہر زاد نے اپنی بہن کی طرف دیکھا، جو سیف الرحمن کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی شہر زاد کو اس کی بد اخلاقی پر تھوڑی شرمندگی ہوئی۔  
”سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ روحیل کا بیٹ فریڈ ہے تو اس نے رومیصہ کے حق میں گواہی کیوں دی۔۔۔؟“ سیف الرحمن کے اس سوال پر وہ ہلکا سا گڑبڑائی۔

”ہم سچائی کو زیادہ دیر تک بند کروں یا بند نہوں کے پیچھے نہیں چھپا سکتے.....“ وہ عین ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور پراعتقاد انداز میں گویا ہوئی۔

”لیکن ایسی دل دکھا دینے والی سچائی جس سے اس کے بیٹ فریڈ کا سارا خاندان ہرٹ ہو سکتا ہے، اس کے لیے وہ کیسے راضی ہوا؟ میرا یہ مطلب ہے کہ اسے اس پوائنٹ تک کون لے کر آیا اور اس کا کیا مقصد تھا؟ وہ کیوں رومیصہ کی ہیلپ کرنا چاہتا ہے۔؟“ سیف الرحمن نے بیورو کرہی میں اتنے سال کام کیا تھا اور ان کا چیزوں کو دیکھنے کا اپنا زاویہ نگاہ تھا۔

”بس کرو سیفی، اس بچے کا خمیر جاگ گیا ہوگا.....“ یٹینا بیگم کو ان کی باتیں بے وقت کی راگنی محسوس ہوئیں اور دوسری طرف انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں شہر زاد ان کی باتوں کا براہ مان جائے۔

”اس اوکے مام.....“ شہر زاد نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بولنے سے منع کیا۔ وہ سیف الرحمن کے عین سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔؟“ شہر زاد نے سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا، اس کا دماغ ایسی پوائنٹ پر چلنے لگا تھا، جس پر سیف الرحمن اسے لانا چاہتے تھے۔

”یٹینا! میں کوئی کنفرم بات تو نہیں کر سکتا، لیکن ان تمام چیزوں کے درمیان میں کوئی کنکشن ایسا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے، اور ہمیں اس کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے کیونکہ ایسا نہ ہو کہ خدا خواستہ ساری بساط پلٹ جائے“

انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔  
”ٹھیک یوانکل، ٹھیک یوسوچ۔ میں آپ کا پوائنٹ بالکل سمجھ چکی ہوں۔ آپ بہت حد تک ٹھیک کہہ رہے ہیں.....“ وہ ایک گہرا سانس لے کر کھڑی ہوئی

اور یٹینا بیگم نے حیرانی سے سیف الرحمن کی طرف دیکھا۔  
”یٹینا! تمہاری بیٹی بہت لائق ہے، اور اسی رفتار سے چلتی رہی تو بڑے بڑے لوگوں کے جیہیز بند کروادے

کی۔“ اس کے لاؤنج سے نکلے ہی انہوں نے کھل کر شہر زاد کو سراہا اور یٹینا بیگم بے ساختہ انداز میں مسکرا دیں کیونکہ وہ بھی اپنی بیٹی کی بھرپور اڑان سے واقف تھیں۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں چاروں طرف خزاں کے زرد پتوں کا راج تھا۔  
مناہل کی گاڑی کیسپس کی پارکنگ میں آن رکی اور وہاں پہلے سے موجود برہان کی گاڑی دیکھ کر اس کے دل میں طمانیت کا احساس پیدا ہوا۔ برہان پچھلے دو روز سے یونیورسٹی نہیں آ رہے تھے اور مناہل نے یہ اڑتائیں کھٹے باقاعدہ کڑھتے ہوئے گزارے تھے کیونکہ ان کا سیل فون بھی مسلسل بند تھا۔

وہ جیسے ہی اپنی گاڑی سے اُتری، ہوا کے رخ جھونکے اس کے چہرے کے ساتھ ٹکرائے، زرد پتوں کو اپنے پیروں سے چلتی وہ اپنے آفس کی طرف بڑھ رہی تھی، ایک چھوٹی سی منڈ پر پر بھی ہوئی اتنا ہیہ نے حسرت بھری نگاہوں سے مناہل کی طرف دیکھا۔ وہ آج برہان کے ساتھ ہی یونیورسٹی آئی تھی اور اس وقت اپنی دوست کرن کے انتظار میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔

بلاشبہ اتنا ہیہ اس سے کہیں زیادہ حسین تھی اور اس کے باوجود برہان کی نظریں مناہل پر لپٹی کے چہرے کا طواف کرتی رہتیں، تب اتنا ہیہ کو احساس ہوا کہ محبت جسمانی ساخت اور حلیے سے بے نیاز ہوتی ہے۔

مناہل نے جیسے ہی ڈیپارٹمنٹ میں قدم رکھا، کلاس کے روسٹرم کے سامنے کھڑے برہان کو دیکھ کر اس کا دل بغاوت کر گیا، وہ کچھ لمحوں کے لیے رکی اور اندر جھانک کر دیکھا، مکی اسٹوڈنٹس کی نظریں اس پر اٹھیں اور وہ ہلکی سی خفت کا شکار ہو کر تیزی سے اپنے آفس کی طرف چل پڑی۔ اپنی اس بے وقوفی پر اس نے خود کو دل ہی دل میں لتاڑا۔

”میم! تھوڑی دیر پہلے آپ کا یہ کوریئر آیا ہے.....“ چراسی نے ایک خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔  
وہ لفافہ لیے اپنے چھوٹے سے آفس میں گئی، وال کلاک کی طرف دیکھا، اس کی کلاس میں دو گھنٹے کا وقفہ تھا اور وہ اسی ڈیپارٹمنٹ میں وزٹنگ پمچر تھی، اور اپنے ٹھیس کے ساتھ ساتھ فرسٹ اور سیکنڈ سسٹر کی کلاسز بھی لیتی تھی۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی احتیاط سے وہ لفافہ کھولا تو اندر سے ایک نفیس سا سلور گرے کلر کا شادی کارڈ نکلا،

مناہل نے بڑی خوش گوار حیرت کے ساتھ وہ دعوت نامہ پکڑا، وہ کبھی تھی کہ شاید کسی فرینڈ یا کلاس فیلو کی طرف سے سر پرانز ہوگا لیکن کارڈ کھولتے ہی جن ناموں پر اس کی نظر پڑی، ایک لمحے کو اسے حیرت اپنے اوپر گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ رنگ کے دائرے نے اپنے لگے اور دل تو گویا سینے کی پریسلان توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ قسمت نے اس کے ساتھ کیسا ہولناک مذاق کیا تھا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے گھبرا کر کارڈ میز پر رکھا۔ جیسے اس کے اندر کوئی آتش فشاں چھپا ہوا ہو۔ اس نے لمبے لمبے سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔

اس کے بعد اس نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے سامنے میز پر رکھے کارڈ کو دیکھا جہاں ”میر پران مختتم“ کے نام کے آگے لکھا ”اتنا ہیہ خاقان“ کا نام اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گئی تھی کہ یہ اتنا ہیہ کون ہے لیکن ابھی اس کا دل دماغ اس کی حقیقت کو ماننے سے انکار ہی تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ)

## دکانِ دیکھ

موسم کی رعنائی اپنے عروج پہ تھی، سرما کی پہلی بارش برسنے کو بے تاب تھی، گہرے بادلوں نے سورج کو اپنی آغوش میں چھپایا تو موسمِ ابر آلود ہو گیا، درخت ہوا سے جھونے لگے۔ ٹھیلے والوں نے گھر کی راہ لی۔ جب کہ چند دکانوں کے ستونوں تلے جا کھڑے ہوئے، لوگوں نے کچھا کچھا بھرا بازار خالی ہونے لگا۔

گلابی لمبی قمیص اور کالی جینز میں ملبوس افشاں آفس میں بیٹھی گلاس ونڈو سے نظر آتی افراتفری دیکھنے میں لگن تھی، وہ نہایت خوب صورت لڑکی تھی، اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں اس کی خوب صورت کالی سیاہ آنکھیں تھیں۔ آفس کی دیواروں پر بھی خوب صورت تصاویر کود کھینچنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ آفس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا ہے۔

چند تصاویر کے ساتھ لگی ایک تصویر نہایت ہی خوب صورت تھی، کافی مائڈرن ٹائپ انداز کی۔

افشاں اس تصویر کو دیکھتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے ذرا قریب ہوئی۔

خوب صورت مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

اس تصویر میں افشاں خوب صورت اور کاہدار براڈل سائز می زیب تن کیے کسی مغرور ملکہ کی طرح کرسی پر بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں چمکتے خوابوں کے جگنو اور ہونٹوں پہ ہلکی۔ کچھ بن جانے کی مسکراہٹ تصویر میں بھی اس کے چہرے سے عیاں تھی، جو دیکھنے والے کو کھر میں جکڑ لیتی۔

”یہ آفتاب عیاسی بھی نا..... مجھے ابھی تک نہیں بھول پایا، یعنی محبت ابھی باقی ہے۔“ اپنی تصویر کو دیکھتے

”افشاں.....“

یقیناً..... وہ سوچوں میں ابھی سانس روکے کھڑی رہی۔  
آنے والا دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آن کھڑا ہوا، اس کے لباس سے اٹھتی پرفیوم کی دلفریب مہک افشاں کی سانسوں میں اترنے لگی۔  
”مجھے یقین تھا کہ تم ایک دن ضرور آؤ گی کیونکہ

آنے والے نے نرمی سے اس کا نام پکارا جو میدھا اس کے دل پہ لگا، لیکن وہ بت بنی اس کی جانب پشت کیے کھڑی رہی۔  
کیسے سامنا کروں میں اس کا، جو کبھی میرا محسن تھا اور شاید آج بھی..... نہیں نہیں..... شاید نہیں بلکہ



اچانک آفس میں شناسا چاب سنائی دی، آنے والا اب بھی وہی پرفیوم استعمال کرتا تھا جس کی مخصوص خوشبو سانسوں تک کو معطر کر دیتی تھی۔ افشاں کا دل اتنے سالوں بعد پہلی مرتبہ دھڑکا۔



زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا موڑ لازمی آتا ہے جب ہم اپنی نئی چاہتوں سے اکتا کر پرانی چاہتوں میں لوٹنا چاہتے ہیں۔“

وہ نرم لہجے میں پُر اعتماد طریقے سے بات کرتا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بہت صاف گو تھا، اتنا صاف گو کہ ایسا سچ بولتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتا تھا جس سے سامنے والا شرمندہ ہو جائے۔

نئی چاہتوں والا فقرہ افشاں کے دل میں تیرکی مانند چھاسا اس نے تڑپ کے سامنے کھڑے مرد کو پلکیں اٹھا کر اٹھ سالوں بعد دیکھا، وقت گزرنے کے ساتھ وہ اور زیادہ عجیب ہو گیا تھا۔

نیلی ٹی شرٹ اور سفید جینز میں ملبوس کھڑا یہ شخص اس کے دل کے قریب تر تھا۔ خوب صورت گندی صاف رنگت اور چہرے پر چمکتی بادامی ذہن آنکھیں اس پر ٹکائے اپنی بات مکمل کر کے اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو، وہ اپرا اس کے سامنے موجود تھی، جس کی واپسی کی اس نے نہ جانے کتنی دعائیں مانگی تھیں۔

”محبت ایک ہی سے ہوتی ہے، باقی سب لوگ مجبوری بن جاتے ہیں جن کے ساتھ رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بالکل ان مسافروں کی طرح جو وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کا سہارا بن جاتے ہیں، اور منزل قریب آنے پر خوشی سے الگ بھی ہو جاتے ہیں۔“

افشاں نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی اور اس کی نگاہ سے کھبرا کے ایک بار پھر سے نظر گلاس وندو سے جھلکتے کھلے آسمان پر ڈالنی چاہی لیکن بارش کے قطروں نے کھڑکی کے شیشے کو اپنی پیٹ میں لے رکھا تھا جس سے کھڑکی کے پار کا منظر دھندلا گیا تھا۔ بارش اب بھی پوری رفتار سے جاری تھی۔

”کیا ہوتا اگر تم ہمیشہ قائم رہنے والی محبت کا ہاتھ قائم لیں اور وقت گزاری نہ کرتیں۔“ وہ دل ہی دل میں افشاں سے مخاطب ہوا اور غور سے اسے

دیکھنے لگا۔

آفتاب عباسی کو افشاں کا کافی افسردہ ہی لگی کیونکہ وہی تھا جو اس کا اندر کا حال جان لیتا تھا، اس نے ماحول پر چھائی اداسی ختم کرنی چاہی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے خوش گوار انداز میں کہا۔

”تمہیں چائے بہت پسند تھی نا؟ میں ابھی تمہارے لیے چائے منگوانے ہوں۔“

وہ انٹرکام دبا کر چائے منگوانے لگا۔ وہ مسکرا کے ست قدموں سے چلتی ہوئی کرسی پر آ بیٹھی۔ درمیان میں میز اور اس کے عین سامنے کرسی پر بیٹھا اسے دیکھی سے دیکھتا آفتاب عباسی جبکہ میز کے ایک کونے پر موجود کمرشل گلدان میں ہمیشہ کی طرح سبز تازہ گلاب مہک رہے تھے۔ جن کو دیکھ کے افشاں کے دماغ میں سوچ ابھری، آفتاب عباسی کی پسند آج تک نہیں بدلی، کتنا مستقل مزاج ہے نا، اور ایک میں ہوں کہ سر تا پا بدل گئی۔

آفتاب بھی اس پر سوچ لگاؤ ڈالے اسی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا کیا ہوا تھا کہ اس کو لوٹ کے آنا پڑا؟ وہ جاننے کے لیے تاب تھا، لیکن خاموش بیٹھا اس امید پر انتظار کر رہا تھا کہ شاید وہ خود ہی آنے کی وجہ بتا دے، کیونکہ فون پر افشاں نے صرف اتنا کہا تھا کہ تم سے ملنا چاہتی ہوں، کچھ بھی پوچھنے کے بجائے آفتاب نے اسے آفس کا ایڈریس لکھوا دیا تھا۔ اور حیران بھی تھا کہ ابھی تک افشاں نے اس کا نمبر محفوظ کر رکھا تھا۔

اب کسی نہ کسی کو تو خاموشی توڑنا تھی نا، بالآخر افشاں نے پہل کی جو کہ پہلے بھی نہیں کرتی تھی۔

”آپ نے میری تصویر ابھی تک وال پر لگا رکھی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ مجھے بھولے نہیں، آپ کے دل میں ابھی تک میں زندہ ہوں۔“

وہ بات مکمل کر کے مسکرائی اور ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ سجائے آفتاب کو دیکھا جو اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا یا شاید بھی نہ گیا تھا۔

آفتاب کی آنکھوں میں ماضی گھوم گیا۔ اسے آج تک وہ دن یاد تھا جب افشاں ملے کیلے کپڑے پہنے اور ممکن چہرہ لیے اس کے آفس آئی تھی۔

”سر پلیز مجھے یہاں کوئی کام دلا دیں، میری ماں بہت بیمار ہے اس کا علاج کروانا ہے۔“

آفتاب عباسی نے اس کی جانب دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا، اسے ہیرو کی پہچان تھی، ویسے بھی وہ ایک کمرشل کے لیے نئے چہرے کی تلاش میں تھا اور اسے دیکھنے کے بعد تلاش ختم ہوتی دکھائی دی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، تمہیں کام مل گیا ہے اور یہ لو کچھ پیسے ایڈوانس۔ اپنی امی کا علاج کرواؤ۔“ قدرے حیرانگی اور خوشی سے دیکھتی افشاں نے اس کے ہاتھ سے پیسے تھامے اور بچوں کے سے انداز میں بولی۔

”سچی سچی مجھے آپ نے کام دے دیا؟ یا اللہ! مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا۔“ خوشی اس کے انگ انگ سے فک رہی تھی۔

آفتاب کا وہ کمرشل جس میں افشاں نے ماڈلنگ کی تھی ٹاپ لسٹ میں آیا تھا، اچھے لباس اور کام کی وجہ سے افشاں پر ٹوٹ کے نکلا کر آنے لگا۔ اسی دوران اس کی ماں کی وفات ہوئی تو آفتاب ہی اسے سنبھالنے والا تھا۔

”میں اکیلی نہیں جی سکتی آفتاب! مجھے ڈر لگتا ہے۔“ ماں کی وفات کے غم میں ڈوبی افشاں نے روتے ہوئے ہوئے کہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ آفتاب کو اپنے دل میں اس کے لیے محبت محسوس ہوئی۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ آفتاب کی بات سن کر وہ اسے دیکھنے لگی اور انکار کر دیا۔

”میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں، آگے بڑھنا چاہتی ہوں، آپ کو صرف دوست سمجھتی ہوں اور کچھ نہیں۔“ آفتاب اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔

پھر افشاں کو ہر جگہ کام ملنے لگا، اس کے کئی اسکینڈل بنے۔ آفتاب نے سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھی، اس کے لیے تو عزت سے بڑھ کر پیسہ اہم تھا، تب

آفتاب دکھ سے ٹوٹ گیا جب افشاں نے بنا اسے بتائے ایک بوڑھے بزنس مین سے شادی کر لی جو کہ عیاش مشہور تھا۔

”تمہیں جب بھی ضرورت پڑے تو لوٹ کے میرے پاس آنا، میرے دل کے دروازے کھل رہے ہیں گے۔“ افشاں سے آخری بات کہتے ہوئے وہ پلٹ آیا تھا، لیکن اسے کبھی بھلا نہ سکا۔

”میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ افشاں کی آواز ساعتوں سے گمراہی تو وہ ماضی سے نکل کے حال میں آیا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

”تمہاری تصویر آج تک وال پر اس لیے لگا رکھی ہے کہ دل میں بسنے والے کی نسبت چھوڑ کے جانے والے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، جب وہ ہمیں دکھائی نہیں دے اور ان کی تصویر ذہن میں دھندلی پڑنے لگے تو مجبوری کے طور پر ان کی تصویر دیوار پر ٹانگ دیتے ہیں۔“

وہ شکوہ بھری نگاہ اس پر ڈالے چائے کے گھونٹ لینے لگا۔

وہ شرمندگی سے سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی، سچ ہی تو کہہ رہا ہے آفتاب، میں چھوڑ ہی تو گئی تھی، وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

”چائے پیو، ٹھنڈی ہو رہی ہے اور تمہارا شوہر کیسا ہے؟ بچے ہوئے کہ نہیں؟“

اس کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے آفتاب نے پوچھا تو اس کے چہرے پر یہ دکھ کا سایا سا لہر لیا جس کو آفتاب نے محسوس بھی کر لیا۔

وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ممکن لہجے میں بولی۔

”وہ شوہر کم اور زندہ زیادہ تھا، شکی طبیعت کی بنا پر مجھ پر پابندیاں لگا دیں۔ بس اس نے مرتے وقت ایک احسان کیا مجھ پر کہ اپنی جائداد میں کچھ حصہ میرے نام کر گیا اور مجھے پھر سے آزادی مل گئی، لیکن میں تنہا نہیں رہ سکتی، مجھے اب احساس ہو گیا ہے کہ تم واقعی محبت کرتے تھے مجھ سے لیکن میں ہی رہی تھی۔“

آنسو قطرہ قطرہ افشاں کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ بارش اب رک چکی تھی لیکن افشاں کی آنکھوں سے برسی



شمینہ فوجان

## کچھ اقباب کی کہانیاں

سے اخبار چھٹتے ہوئے میں نے مزید تصدیق چاہی۔  
”جاؤ، اماں سے خود پوچھ لو بلکہ یہ اخبار مجھے دو  
اور جا کے اماں کا شکریہ ادا کرو۔“  
”میں اب اس میں شکریہ ادا کرنے والی کون سی  
بات ہے۔“ میں حیرت سے بولی۔  
”بھئی اماں خوش ہو جائیں گی۔“ انہوں نے  
جیسے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

”سنو میں نے اماں سے وہ جاب والی بات  
کر لی۔“ اخبار کو فولڈ کر کے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے  
ہوئے اصرار نے مجھے مخاطب کیا۔  
میں جو چائے کے خالی برتن سینے کمرے میں  
آئی تھی اور ٹرے میں کپ گلاس اور شکر دان رکھتے  
ہوئے یہاں وہاں کی چیزیں بھی سمیٹ رہی تھی۔  
سب کچھ وہیں پہ چھوڑ چھاڑ کے بیڈ کے قریب پڑی  
کر سی پتنگ لگی۔  
”کب کی آپ نے اماں سے بات؟ صبح سے تو  
آپ اخبار میں سر دیے بیٹھے ہیں۔“ اپنی حد درجہ بے  
چینی کے باوجود بھی میں طنز کرنا نہ بھولی تھی۔ ”اور کہا  
کیا اماں نے؟“

میری بے تالی کے جواب میں انہوں نے اپنا  
چشمہ بھی اتار کے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور اپنے  
ناک کے اوپری حصے پہ چشمہ سے بننے والے نشان گو  
عادتاں سہلاتے ہوئے کہنے لگے۔  
”کہہ رہی تھیں کہ تمہیں ضرورت تو نہیں ہے  
نو کری کی اور ویسے بھی شایان ابھی بہت چھوٹا ہے۔“  
”دیکھا؟“ میں جھٹ سے بولی۔ ”اپنی بیٹی کو تو  
ڈاکٹر بتا رہی ہیں اور میں کسی اسکول میں ٹیچر تک کی  
نو کری نہیں کر سکتی۔“

”بھئی ایک تو تم پوری بات سنتی ہو نہیں اور  
شروع ہو جاتی ہو۔“ اصرار نے جھلاتے ہوئے مجھے  
چپ کرایا پھر ایک لمبے کوٹھڑ کر بولے ”جب میں نے  
اماں کو بتایا کہ تمہیں عالیان بی کے اسکول میں نو کری  
ملی ہے اور گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد شایان کا بھی  
وہیں انٹرنیشن ہو جائے گا تو وہ بھی تمہارے ساتھ ہی  
چلا جایا کرے گا تو انہوں نے کہا کہ جیسے تم لوگوں کی  
مرضی.....“

”تو اماں کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے  
بے یقینی سے اصرار کو دیکھا۔  
”ہاں ظاہر ہے۔“ ڈھلے ڈھالے انداز میں  
کہتے ہوئے انہوں نے دوبارہ اخبار اٹھانا چاہا۔  
”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ ان کے ہاتھ

اس کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔  
”تمہارے چھوڑ جانے کے بعد میں ٹوٹ سا  
گیا تھا، میرا بزنس فلاپ ہونے لگا۔ سارا دن بولا یا  
بولا یا پھرتا رہتا۔ میری خالہ زاد کزن زویا میری  
راز دار تھی، تب اس نے مجھے سہارا دیا اور بتایا کہ میں  
تم سے محبت کرتی ہوں تب میں نے اسے اپنا لیا  
کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا جو دکھ تم نے مجھے دیا تھا وہ  
میں اس کو دوں، اس کے ساتھ بھی وہی ہو جو میرے  
ساتھ ہوا اور آج تک اس نے مجھے تمہارے حوالے  
سے کوئی طعنہ نہیں دیا، بہت بڑے دل کی ہے وہ۔“  
اس کا ذکر کرتے ہوئے آفتاب کے لہجے میں  
محبت در آئی۔

”میرا کیا ہوگا؟“ روتی ہوئی آفتاب نے پھر  
سے سوال کیا۔  
”میرے دل میں تمہارے لیے محبت کے  
بجائے عزت موجود ہے۔ بہتر یہ ہی ہے کہ تم کوئی اچھا  
سا انسان ڈھونڈ کے پھر سے شادی کر لو۔“ یہ کہہ کر وہ  
موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھائے اٹھ کھڑا ہوا۔  
وہ بھی واپس جانے کے لیے خاموشی سے آفس  
سے باہر نکل گئی مزید کوئی بھی بات یا سوال کیے اور وہ  
اسے جاتا دیکھتا رہا۔  
زندگی کے اس سفر میں آفتاب کے ہاتھ کچھ نہیں  
آیا تھا، خالی گھر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ویران درختے  
اس کی راہ تک رہے تھے، وہ خزاں رسیدہ پتے کی  
مانند اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔  
ایک خاموشی تھی جس نے اسے اپنی پلیٹ میں  
لے رکھا تھا۔

جبکہ آفتاب تنہا نہیں تھا، ایک اچھے فیصلے نے اس  
کی زندگی خوشیوں سے بھر دی تھی لیکن اندر سے وہ بھی  
آفتاب کے لیے افسردہ تھا۔ سچی وہ بھی تو اس کے دل میں  
بستی تھی، اس نے دل سے آفتاب کے لیے خوشیوں  
کی دعا مانگی اور گھر کی جانب جانے والی سڑک پہ گاڑی  
موڑ لی جہاں پہ اس کی وفا شعار بیوی اور بیٹی کھانے پہ  
اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ☆☆

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، اس کی حالت  
جان کے آفتاب عباسی بھی بے چین ہو گیا اور ایک  
ہمدرد اور نرم نگاہ اس پہ پڑی۔  
”بہت دکھ ہوا جان کے، میں نے تمہیں سمجھایا  
تھا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔“  
وہ بے چینی سے آفتاب کی جانب دیکھتے ہوئے  
بولا اور چائے کا آدھا کپ بنا پے ہی چھوڑ دیا۔  
”یاد ہے آپ نے کہا تھا کہ میرے دل کے  
دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے تم جب چاہو.....“ آفتاب  
کی بات ممل ہونے سے پہلے ہی آفتاب کا موبائل بج اٹھا،  
اسکرین پہ چمکتے نمبر کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ مسکراہٹ  
اُبھر آئی، اس نے جلدی سے کال لی۔  
”جی جناب، خیریت؟“ آفتاب نے غور کیا کہ  
آفتاب کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا، جیسے وہ کسی  
خاص کی کال ہو،  
کچھ دیر آفتاب مسکرا کے فون کرنے والی کی  
بات سنتا رہا پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔  
”کیوں پریشان ہوتی ہو؟ بس آ رہا ہوں، پھر  
مل کر ہی کھانا کھاتے ہیں۔“  
یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور قدرے خوش  
گوار انداز میں آفتاب کی جانب دیکھا جو شاکی  
نظریں اسی پہ نکلے بیٹھی تھی۔  
”ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟“ وہ اس کی جانب  
متوجہ ہوا۔  
”کال کس کی تھی؟“ آفتاب نے ڈرتے ڈرتے  
پوچھا۔  
میری بیوی کی تھی، شادی کر لی ہے میں نے۔  
ماشاء اللہ سے ایک بیٹی کا باپ بھی ہوں۔“ آفتاب  
نے اس پہ ہم چھوڑا۔  
آفتاب کی حالت ایسی تھی کہ کال تو بدن میں لہو  
نہیں۔ وہ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے  
ٹوٹے لہجے میں بولی۔  
”لیکن آ..... آفتاب..... تم..... تم نے تو کہا تھا  
کہ میں ہمیشہ تمہارا انتظار کروں گا..... پھر اب.....“

”ہاں تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ جیسے میں ان کے حکم کی غلام ہوں۔“ میں فٹ سے بولی۔  
”ارے تو ہفتہ بھر سے جان کیوں انہی ہوئی تھی تمہاری.....؟“ میرے خیالات پر انہیں تعجب ہوا۔  
”وہ تو ویسے ہی۔“ میں نے چائے کے خالی برتن ٹرے میں اکٹھے کیے۔ ”اماں انکار کر دیتیں تو مسئلہ ہو جاتا نا!“

”چلو خیر، اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے نا؟“ انہوں نے ہنسنے ہوئے پوچھا اور میرے چہرے پر پھوٹی طمانیت ان کو جواب دے گئی۔  
”آپ کو کچھ اور تو نہیں چاہیے؟“ میں نے کمرے سے نکلنے ہوئے پوچھا۔

”آں نہیں..... پر اماں سے پوچھ لینا۔ وہ اس وقت دوبارہ چائے پیتی ہیں..... اور دیکھ لینا انہوں نے بلڈ پریشر کی دوائی لے لی ہے..... کل بھی بھول گئی تھیں۔“

”جی وہ میں دیکھ لیتی ہوں۔“ میں سرورسی کمرے سے نکل آئی۔

رات کو فون پر ساری رواد میں نے اپنی چھوٹی بہن ندا کو سنائی۔ وہ لاہور میں رہتی تھی لیکن موبائل فون کے نیٹ سے ٹیکسٹر کی وجہ سے تقریباً روز ہی بات ہو جایا کرتی تھی۔

”ویسے تمہاری ساس ہیں اچھی۔ میری مہی جی، تو کبھی اتنے آرام سے نوکری کرنے کی اجازت نہ دیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں خوشی سے چبکی۔ ”ویسے احمد تو کہہ رہے تھے کہ مجھے اماں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے شکریہ دکر یہ کرنے کی۔“ ندا ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”ارے کوئی جائیداد کیا تمہارے نام کر دی ہے انہوں نے جو تم شکریہ ادا کرنے چلی ہو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اتنا سر پہ چڑھانے کی۔“

”وہی تو!“ میں جھٹ سے بولی۔ ”میں نے تو

احمر سے کہہ دیا۔ کیا میں ان کے حکم کی غلام ہوں.....“  
”بہت اچھا کیا۔“ ندا نے داد دی۔ ”سسرال والوں کو ویسے بھی ذرا فاصلے پر ہی رکھنا چاہیے..... اور سنو عائشہ وہ جو تمہاری ساس صلابہ تمہیں مشورہ دے رہی ہیں تاکہ تم اپنی بڑی تندہ کی شادی سے پہلے کے کپڑوں کو اپنے سائز کے مطابق کر لو اسکول پہننے کے کام آئیں گے اس پر نہ کہیں عمل کر لینا!“

”کیوں یار؟“ میں نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ”اچھے سوٹ ہیں کچھ تو بالکل نئے ہیں۔ ابھی تین مہینے ہی تو ہوئے ہیں اس کی شادی کو اور چھوٹی تندہ باہن کا تو تمہیں پتا ہے۔ اسے تو اپنی پڑھائی کے علاوہ کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ اس نے تو کسی ایک سوٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور ویسے بھی اسے تو بہت ڈھیلے ہوں گے۔“

”دیکھو..... وہ ان کی چھوٹی بیٹی پہننے یا وہ کسی ماسی کو دیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے..... تمہیں کیا کسی بے کپڑوں کی۔ ارے ایک سے ایک برائڈ کے کپڑے مل رہے ہیں بازار میں اور اب جبکہ تم خود کماؤ گی تو اپنے اوپر دل کھول کے لگاؤ بھی..... آٹھ دس لان کے نئے خوب صورت سے سوٹ بناؤ تمہیں کیا ضرورت ہے کسی کی اترن پہننے کی۔“

ندا نے روانی سے مقورے سے نوازا اور فون بند کرنے تک لان کے خوب صورت رنگوں سے مزین دلفریب پڑائوں سے آراستہ خوب صورت نئے جوڑے آنکھوں کے آگے منڈلاتے دل کو قائل کر چکے تھے۔

چوٹی اور پانچویں جماعت کو اردو پڑھانا کوئی خاص مشکل کام نہ تھا اور مجھ سے زیادہ تو عالیان خوش تھا کہ اس کی تو کلاس ٹیچر بھی میں ہی تھی! اسکول کا اسٹاف میری امیدوں سے بڑھ کر پر خلوص اور ملنسار ثابت ہوا۔ چند ہی دنوں میں سب ٹیچرز سے میں مکمل مل گئی خاص طور پر شازیہ سے تو میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ وہ پانچویں کلاس کی اسلامیات کی ٹیچر تھیں اور اسے اپنے سنجیدگی پر عبور حاصل تھا وہ اکثر ہی

موبائل پر قرآن پاک کی تفسیر کے لیکچر سننے کی نظر آتی بلکہ مجھے بھی فارورڈ کر دیا کرتی، دل تو میرا بھی کرتا تھا کہ میں بھی باقاعدگی سے قرآن کی تفسیر کی کلاس لوں پر گھر کے کاموں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی بس بھی کتبہ شازیہ کا موبائل پر پیجا ہوا کوئی لیکچر سن لیا کرتی۔

آج پچھنی کا دن تھا..... ناشتہ نہ پھوڑا اہتمام کیا تھا تو سینے سینے دیر ہو گئی تھی، میں برتن دھوتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ عالیان کو ہوم ورک کروا کے ندا کو فون کروں گی۔ جب سے اسکول جو ان کیا تھا ان دو فحاشی مہینوں میں مصروفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ندا سے کہیں لگانے کا نام ہی نہ ملتا تھا۔ جلدی جلدی عالیان کو ہوم ورک کا سمجھا کے میں نے ندا کو فون ملا یا، آج بہت دنوں بعد ندا سے بات ہو رہی تھی۔

”تو تمہاری ساس نے کھانا پکانے والی کو کیوں نکال دیا؟ اب دیکھو نا..... کھانا پکانے کی ساری ذمہ داری تمہارے کندھوں پر آن پڑی..... ان کو کیا تکلیف تھی اس سے بس چاہتی ہوں گی کہ تم اسکول سے کھانسی ہاری آؤ اور آتے ہی گھر کے کاموں میں جُت جاؤ۔“

”نہیں یار!“ میں بیڈ پر آرام دہ پوزیشن میں بیٹھے ہوئے بولی۔ ”دوپہر کا سناں تو اماں ہی پکاتی ہیں جو اکثر رات میں بھی کام آجاتا ہے۔ میں تو بس رات کا ہی کھانا بناتی ہوں وہ بھی اکثر اماں ہی سبزی کاٹ دیتی ہیں۔“

”بس رہنے ہی دو، یہ سب ان ساسوں کے بہوؤں کو تنگ کرنے کے طریقے ہیں تاکہ میاں تو کبھی تمہاری قدر ہی نہ کر سکے بلکہ اپنی اماں کا ہی ہمدرد بنا رہے کہ اس عمر میں سارا گھر خود سنبھالا ہوا ہے۔ بیوی تو صبح سویرے گھر سے نکل جاتی ہے..... وہ کھانا پکانے والی جیسا تیسرا کا تو رہی تھی نا..... کام تو چل رہا تھا نا تمہارا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی اماں جان کا احسان لینے کی۔“ ندا نے جل کے کہا۔

”ویسے انہوں نے بھی احسان جتایا تو نہیں۔“ میں نے خیالوں میں اپنی ساس کا کوئی طنزیہ جملہ

ڈھونڈنے کی کوشش کی۔  
”تم تو ہو ہی بدھو۔“ موبائل سے آتی ندا کی جلی کئی آواز میرا دل ہی جلا گئی۔

آپ سے چار سال چھوٹی بہن جب آپ کے منہ پر آپ کو بدھو کہتے تو دل پہ کیا گزرتی ہے یہ تو وہ ہی جان سکتا ہے جس کی چھوٹی بہن ندا کی طرح پٹا خدہ ہو یا وہ میری طرح بدھو ہو۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ میرے کچھ نہ بولنے پہ ندا کی آواز آئی۔  
”اُں ہاں کچھ نہیں!“ میرے منہ سے بس یہ ہی نکلا۔

”اور سنو عائشہ!“ ندا سا بھدہ جوش سے پھر شروع ہوئی ”کوئی ضرورت نہیں ہے مہینوں کو کپڑے سی کی کر دینے کی۔“ اس نے رعب جھاڑا۔  
”لو میں کب سی کی کر دے رہی ہوں۔“ میری مری مری سی آواز نکلی۔

”وہ تو وہی سوٹ ہیں نا جو شرمین کے شادی سے پہلے کے تھے۔ ان میں سے ایک سوٹ مہینوں کو کالج کے فنکشن میں پہننا تھا۔ درزی تو پورے سوٹ کی سلائی کے پیسے لے رہا تھا تو میں نے کہا کہ میں سلائیوں لگا کے اس کے سائز کے مطابق کر دوں گی۔“

”ہاں تم تو جیسے فارغ بیٹھی ہو نا!“ ندا کو جیسے غصہ آیا۔

”نہیں یار! پورا سوٹ تقریباً دو گھنٹے میں اس کے ٹاپ کے مطابق ہوا۔ دو دفعہ تو ج میں بجلی چلی گئی۔ گرمی نے الگ حشر کر دیا۔“ میں نے اپنی پٹا سنائی۔

”غضب خدا کا! یہ تمہارے سسرال والے بھی نا! اتنی مہنگی میڈیکل کی تعلیم دلا سکتے ہیں اپنی لاڈلی کو پردرزی کو پیسے دیتے ہوئے جان جاتی ہے ان کی۔“  
”اور کیا؟“ میں نے بھی منہ بنایا۔ ”میں کون سا فارغ بیٹھی ہوں..... ابھی تو مہینے دو اور فیصوں کا بھی کہا ہوا ہے کہ بھابھی ان کو کبھی میرے ٹاپ کے

مطابق کر دیں، ہند کب سے سوچ رہی ہوں کہ قرآن کی تفسیر کی کلاس لوں پر فرصت ملے تب نا.....“ ندا کی کال مجھے دل کے چھپو لے ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھوڑنے کا بھرپور موقع فراہم کیا کرتی۔

”سچ کہہ رہی ہو عاشری.....!“ ندا نے سرد آہ بھرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”بندہ فارغ ہو تو کوئی اللہ رسول کا بھی نام لے اب اس گرمی میں قمیض ٹائیٹ کر کر کے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا تمہیں۔“

”اچھا خیر، میری دیورانی کی سنو۔“ ندا کو جیسے کوئی اچانک بات یاد آئی اور ایسا اکثر ہی ہوتا تھا۔ ندا کی باتوں کی چٹاری میں ایک سے ایک پٹا خدہ کسی دلچسپ اور سنسنی خیز واقعہ کی صورت میں موجود رہتا۔ ”ہمارے محلے میں ایک بیوی پارل کھلا ہے۔“ ندا نے مزہ لینے ہوئے سنا شروع کیا۔ ”ان محترمہ کو بھی شوق چرایا کہ وہ بھی طبع آزادی کریں، فرمانے لگیں۔“ ندا دیورانی کی نقل اتارتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بھابھی..... اگر آپ سعد کو سنبھال لیں تو میں بھی بیوی پارل کر کورس کر لوں..... اور سنو کوئی ایک نہ دو پورے تین مہینے کا کورس..... بھلا بتاؤ..... کوئی آسان ہے دو سال کے بچے کو سنبھالنا!“

”تو تم نے صاف انکار کر دیا؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”میں کوئی تمہاری طرح پاگل ہوں.....“ ندا نے مجھے جتاا۔

”تو پھر.....؟“ مجھے تعجب ہوا۔

”بھئی..... میں نے طریقے سے بات

بنائی..... میں نے کہا کہ تمہیں کیا ضرورت ہے کورس کرنے کی، تمہیں کون سا اپنا پارل چلا نا ہے الٹا خاندان کی برتقربیب میں ساری خواتین تمہارے ہی سر ہو جایا کریں گی کہ ہمارا میک اپ کر دو..... بیوی پارل کا کورس تو خیر کیا ہی کرنا ہے..... میں نے تو ایسا خوفناک نقشہ کھینچا کہ وہ الٹا میری ہی ممنون ہوئی کہ بھابھی آپ نے سچ وقت پہنچ مشورہ دے دیا۔“

”ہیں.....!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”تو اور کیا.....!“ ندا اتر کے بولی۔ ”کسی بات کو منع کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے کوئی لٹھ مار کے تو نہیں کسی کو انکار کیا جاتا اور جب کام ٹھکانے کے نکل رہا ہو تو کڑوا بننے کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی ہمارے دل میں تو نہیں چھپا بیٹھا کہ جان لے کہ یہ بات کس لیے کی جا رہی ہے۔“

”چاہے کسی کا نقصان ہی ہو جائے۔“ میں کہے بغیر بندہ نکلی۔

”ہاں، تمہیں تو جیسے بڑا فائدہ ہو گیا..... اب اگر تم اپنی ہند کو پیار سے سمجھاتیں کہ چند ہی تہاری آئی کے کپڑے تو پرانے فیشن کے ہیں۔ تم اپنے کالج فنکشن کے لیے کوئی اچھا سا سوٹ لے لو کسی بوتیک سے..... تو تمہیں تو گرمی میں خوار نہیں ہو پاؤ گے۔“

کہاں کی بات ندا کہاں ملا رہی تھی اور میری سوئی ابھی تک اس کی دیورانی پہ ہی لگی ہوئی تھی۔ ندا کے دیور کی اتنی اچھی آمدنی والی نوکری نہ تھی..... ایسے میں شاید وہ اپنے گھر کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کچھ کرنا چاہ رہی ہو، میں سوچنے لگی۔

”چلو، تم اس کا بچہ نہ سنبھالتیں۔ پر اسے کورس تو کرنے دیتیں۔“ مجھے ندا کی چالاکی ایک آنکھ نہ بھائی۔

”جی نہیں! خام خیالی ہے آپ کی، وہ میرے ہی سر آ پٹکتا۔ بھئی میرے صبح ہزاروں کام دھندے ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا بچہ سنبھال کے کتنے نفلوں کا ثواب ملتا اور بھئی کچی بات ہے اتنا فارغ نام نہیں ہے کسی کے پاس۔“ ندا نے تو جیسے بات ہی ختم کر دی۔

عالیان کب سے اپنا ہوم ورک دکھانے کے لیے کھڑا تھا..... ”اچھا ندا! پھر بات ہوگی میں ذرا عالیان کا ہوم ورک چیک کر لوں۔“

فون بند کر کے میں عالیان کی طرف متوجہ ہو گئی خدا کا شکر تھا کہ جب سے میں نے اسکول جوائن کیا تھا عالیان پہلے سے بھی اچھا پڑھنے لگا تھا۔ اس کو اور کام دے کے میں موبائل پہ شاز بہ کا بھیجا ہوا قرآن کی

تفسیر کا لیچر سننے لگی جس میں کوئی عالم دین قرآن کو سمجھنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کر رہے تھے۔ میں ہینڈ فری لگائے انہماک سے لیچر سن رہی تھی جب آخر نے مجھے ذکیہ چچی کی آمد کے بارے میں بتایا۔ ذکیہ چچی ہمارے ہی علاقے میں رہتی تھیں اور گھر قریب ہونے کی وجہ سے اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا!

میں چائے کی ٹرے لے کر رے کی طرف جا رہی تھی اماں کے کمرے کی کھڑکی باہر برآمدے میں کھلتی تھی میں ذرا دراک کر اپنا دوپٹا ٹھیک کرنے لگی تب ہی ذکیہ چچی کی آواز میرے کانوں سے نکل گئی۔

”تو تم عاشرہ سے کہو نا کہ اگر اتنا ہی نوکری کرنے کا شوق ہے تو صبح جلدی اٹھ کے کھانا پکا کے جایا کرے۔“

”لو، اب وہ صبح اٹھ کے کیا کیا کرے؟ بچوں کو تیار کرے۔ ناشتہ بنائے کہ دوپہر کا کھانا بنائے۔“

”یہ خوب کئی تم نے..... اس کو تو نوکرائی مل گئی مفت کی۔“

”ارے نہیں ذکیہ! اس نے تو کھانا پکانے کے لیے ملازمہ کا بندوبست کیا تھا پر وہ ایسا بد مزہ سالن بناتی تھی کہ کیا بتاؤں میں نے خود ہی کہا۔ اس سے اچھا تو میں پکالیا کروں گی۔“

”تو تم نے تو خود اپنے پیروں پہ کلباڑی مار لی اس کے تو عیش ہو گئے۔“ ذکیہ چچی کا طنزیہ جملہ میرا دل دکھا گیا۔

”ارے عاشری بے چاری بھی سارا دن لگی ہی رہتی ہے۔ دوپہر کے کھانے کے برتن دھونا، پکن کا پھیلنا واسمٹنا، ماسی سے صفائی کروانا، بچوں کو پڑھانا۔ رات کا کھانا بنانا اسے سکون کہاں ملتا ہے۔“

اماں کا سادہ سا..... ریاسے پاک، جھوٹ سے مبرا لہجہ جیسے دکھے دل پہ چھانے کی طرح محسوس ہوا..... ذکیہ چچی منہ پہ کتنا پیار جتاتی ہیں..... چہرے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ لہجہ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ میں سوچنے لگی۔

”تو اس سے کہو کہ نوکری چھوڑ کے اپنا گھر سنبھالے ادھر بھلا بھلا تمہیں اس عمر میں ہنڈیا روٹی کر کے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا۔“ ذکیہ چچی کہاں چپ رہنے والی تھیں۔

”شاید مل ہی جائے!“ اماں کی کسی گمان میں ڈوبی آواز مجھے سنائی دی اور نجانے یہ اور اک کا..... آگہی کا کون سا لہجہ تھا! میرے کانوں میں چند لمحوں پہلے سنے ہوئے لیچر کے الفاظ گونجنے جس میں عالم دین کسی ایک آیت کو سمجھنے کے ثواب کے بارے میں پتا رہے تھے..... اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے کام آنے، ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی جگہ تلقین کی ہے۔“

”بھابھی! اس میں میری بھی چائے ہے؟“

ماہین میرے سر پہ کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”آں..... نہیں۔“ میں جیسے ہوش میں آئی۔

”تم یہ بڑے اندر لے جاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں..... اور سنو ماہی! تم نے جو قمیض ٹھیک کرانی ہے وہ بھی نکال دینا۔ میں ٹھیک کر دوں گی۔“

”ٹھیک پو سوچ بھابھی..... وہ خوشی سے چبکی۔“ اچھا بھابھی! آپ یہ چائے اندر لے جایں۔ میں اسے اور آپ کے لیے بھی چائے بنا کر لائی ہوں سب مل کر پیئیں گے۔“

”یہ مجھے شامل کیے بغیر کون سی سادشیں ہو رہی ہیں؟“ آخر جو ابھی اجنبی اپنے کمرے سے نکلے تھے ہمارے قریب آتے ہوئے کہنے لگے۔

”بس یہ ہمارا سیکریٹ ہے آپ کو کیوں بتائیں۔“ ماہین پکن کی طرف جاتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی جس پہ آخر مصنوعی خشکی سے گھوڑنے لگے۔

”چلو ماہی! تم ان کی بھی چائے بنا دینا! کیا یاد کریں گے۔“

”بھابھی! میں دودھ اور پتی کی چائے بناتی ہوں۔ انسانوں کی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے ماہین جھپاک سے پکن میں گھس گئی..... اور اس کی بات پہ ہم دونوں بے اختیار ہنس دیے۔





اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسے میں جب ماہ نور کی شادی کا کارڈ ملے والوں کی طرح انہیں ملا تو وہ سب بھی ہسائیگی کا حق ادا کرنے شادی میں شرکت کے لیے آ گئے۔

نکاح ہو چکا تھا، ماہ نور کو اسٹیج پر لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ بے حد حسین تھی اور دلہن بن کر تو اس کی چھب ہی نہ لائی تھی۔ خود ثانیہ بہت پیاری لگ رہی تھیں، شیفون کی جاما اور بلو ساڑھی میں ادھر سے ادھر پھرتی وہ کہیں سے بھی جوان بیٹی کی ماں نہیں لگ رہی تھیں۔ بالآخر دولہا کو بھی اسٹیج تک لایا گیا تاکہ مودی اور تصاویر کا کوٹا بھی پورا کیا جائے۔ سب کی نظریں اسٹیج پر جان محفل یعنی دولہا اور دلہن پر اٹھی ہوئی تھیں تب ہی دولہا کی پھوپھو کو دولہا کے ابا اپنے بازوؤں کے

ہی بن چکی تھیں۔ مردانے کا الگ انتظام تھا اس لیے ابا مردانے میں ہی تھے۔

ان کے گھر کے عین سامنے ہی ماہ نور کی شادی تھی۔ ماہ نور اور اس کی ماں ثانیہ چند سال سے ان کے محلے میں مقیم تھیں۔ ثانیہ کسی آفس میں جاب کرتی تھیں، صبح کی کچی شام کو آتی تھیں۔ ماہ نور بھی کالج کے لیے نکلتی اور واپس آتی نظر آتی تھی، بلا ضرورت انہیں آتے جاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

چوں کہ ان کے گھر کوئی مرد نہیں تھا اس لیے محلے والے انہیں عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کا بھی محلے میں کسی سے میل ملاپ نہیں تھا۔ زبیدہ اور شہر بانو کی بھی ان پر گھر سامنے ہونے کی وجہ سے نظر پڑ جاتی تو بس ایک رکی سی مسکراہٹ کا تبادلہ ہوتا تھا

”زبیدہ! استری کے لیے کپڑے ہی دے دو، کب سے آواز دے رہی ہوں۔“ شہر بانو جب دور سے آوازیں دے دے کر تھک گئی تو قریب آ کر جھنجھلا کے بولی۔

”یار! میرا شادی میں جانے کا موڈ نہیں، تم ایسا کرنا کسی بچے کے ہاتھ جکے سے رہائی کی پلیٹ مجھے بھیج دینا۔ میں دروازہ کھلا رکھوں گی۔“ زبیدہ نے کمال لاپرواہی سے کہتے ہوئے نظریں اسکرین پر ہی جمائے رکھیں۔ وہ بہت انہماک سے ایل ای ڈی اسکرین پر پینٹل چوگرالک چیلن دیکھ رہی تھی۔

”میں اتنی فضول حرکت نہیں کروں گی، بہتر ہے کہ تم اٹھ کر مجھے کپڑے نکال کر دے دو جو تمہیں پہننے ہیں تاکہ میں استری کر دوں پھر لائٹ چلی گئی تو بیٹھی روٹی رہتا۔“ شہر بانو نے اسے ٹوڈ شیڈنگ کا ڈراوا دیا مگر اس کے انہماک میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

گدھوں کا چھند کسی مردار جانور پر پل پڑا تھا اور ان کی تعداد اتنی تھی کہ جانور چھپ سا گیا تھا۔ بس ان گدھوں کے گھنے سر اور مڑی ہوئی چونچیں نظر آ رہی تھیں جن میں مردار کی بوٹپاں نظر آ رہی تھی۔

”مستغفر اللہ! کیا فضولیات دیکھ رہی ہو، گھن نہیں آ رہی تمہیں؟“ شہر بانو نے منہ پر ہاتھ رکھ کر آتی ابلان کی کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گردن بھی گھمائی۔

”شہر بانو! یہ گدھ ابھی دنیا میں ہیں یا ڈانسوسار کی طرح تباہ ہو گئے؟“ شہر بانو کی باتوں سے قطع نظر اس نے سوال کیا





# Your Herbal Dentist

## English<sup>®</sup> Herbal

Enalapril Captopril Amlodipine Nifedipine

گی اور جانے ایسولینس کے لوگ کیسے ہوں۔“ وہ دکھیا ری، بارات لوٹنے کا تم، طلاق کا داغ فراموش کیے اپنی ماں کی سکھائی بات کا پاس کر رہی تھی۔

”اماں، ابا آپ دونوں جلے جائیں پلیز۔“ زبیر نے قریب آ کر کہا تو ماہ نور مشکور نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! تم چلو ہم آتے ہیں۔“ ابا نے کہا تو وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ اماں کے کہنے پر شہر بانو ان کی چادر لے آئی۔

انہیں گیٹ اچھی طرح بند کرنے کی ہدایت کرتے اماں ابا، ماہ نور کے ساتھ ایسولینس میں تانیہ کو اسپتال کی طرف لے جانے لگے تھے۔ محلے کی کھڑکیاں دروازے ایسولینس کے سائرن سے کھلنے لگے تھے۔

”گدھ نایاب نہیں ہوئے ہیں شہر بانو! بس ان کے گھنے سر اور مڑی ہوئی چونچیں بدل گئی ہیں۔ وہ ہمارے آس پاس ہی ہیں، ہم پر لپکتے ہیں، ہماری قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ جیسے آبا بیگم نے ماہ نور کے ماتھے پر طلاق لکھ دی، محلے والے جو اس انتظار میں ہیں کہ کب انہیں موقع ملے اور وہ ماہ نور اور تانیہ جیسی عورتوں کو ہڑپ کر جائیں..... گدھ نایاب نہیں ہوئے بس انہوں نے شکلیں بدل لی ہیں، ٹھکانا بدل لیا ہے..... وہ ہمارے بیچ میں ہی ہیں.....“

چادر کے اندر سے زبیر کی آواز آرہی تھی۔ شہر بانو نے اس کا ایک ایک لفظ بغور سنا تھا۔ زبیر کی سسکی پراس کے لبوں سے بھی ایک تنگی سانس آہ کی صورت نکلتی تھی۔

کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ رہا ہے؟“ محلے کی بی بی سی، تو یہ تو یہ کرنی اماں کے سامنے ساری کہانی کو پھر سے دہرا کر اماں کو تنبیہ کر رہی تھیں کہ ہمارا گھر سامنے ہے، ہم ان سے میل جول نہ رکھیں..... تب ہی ابا نے ہمیں گھر کی راہ لینے کا اشارہ کیا۔

”رب معاف کر دیتا ہے لیکن لوگ معاف نہیں کرتے۔“ ابا گھر کا تالا کھولتے ہوئے افسردہ تھے۔ ”صبح کبہ رہے ہیں، بہت افسوس ہوا، چند گھنٹوں میں بچی نے نکاح سے طلاق تک کا سفر کر لیا..... بہت زیادتی ہوئی بچی کے ساتھ۔“ اماں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

”کتنی پیاری ہے ماہ نور! لیکن نصیب دیکھو۔“ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتی شہر بانو دھکی تھی۔

زبیر اپنی جگہ خاموش تھی، جو کچھ دیکھا اور سنا وہ اسے دھکی کر گھٹا، نیند آگھوں سے کوسوں دور تھی۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا، جب اس کی آنکھ کھل گئی، شہر بانو بھی جاگ گئی تھی، دونوں اٹھ کر آئیں تب تک ابا اور اماں دروازہ کھول چکے تھے۔

عام سے لان کے سوٹ میں ماہ نور دھلے منہ سے دو پتھر سر پر لیے کھڑی تھی۔ ہاتھوں پیروں پر لگی مہندی کو دیکھ کر زبیر کا دل ایک بار پھر دکھ سے بھر گیا۔ ابا اور اماں بھی اتنی رات گئے اسے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

”مہربانی کر کے میری مدد کریں، امی کو ہارٹ ایٹک ہوا ہے..... انہیں اسپتال لے جانا ہے لیکن کوئی میری مدد نہیں کر رہا۔ میں نے محلے کے کئی دروازے کٹکٹے سنائے سب نے منع کر دیا..... پلیز آپ منع نہ کیجیے گا، میری امی کو کچھ ہو جائے گا۔“ وہ بری طرح رورہی تھی، اماں ابا نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”پلیز انکل آپ کی بھی بیٹیاں ہیں..... میں اکیلی ایسولینس میں امی کو لے کر گئی تو وہ ٹھیک ہونے کے بعد میری اس حرکت پر مجھ سے ناراض ہو جائیں

## ناؤلیٹ

شریا کے ہلکے خراٹوں نے اس کی بندھوئی  
پلکوں کو کھول دیا۔ اس نے کروٹ بدلے بنا گردن  
موڑ کر ماں کو دیکھا۔ وہ چارپائی پر چب پڑی گہری  
نیند میں جا چکی تھی بارش کے باعث ہلکی خنکی میں سب  
بچوں کو اس نے اوپر اوڑھنے کو چادریں دے دی  
تھیں۔ مگر خود ہر چیز سے بے نیاز تھی۔  
اب وہ بہن بھائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سب  
ایک دوسرے سے لپٹے پیچھے نہیں جاتے تھے کہ کس  
کی ٹانگ کون سی۔ اور کس کا ہاتھ کون سا۔ بس ایک  
اسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔  
صبح سے جاری بارش اب جا کے تھی تھی۔ فضا  
میں گہری خاموشی تھی۔ کبھی جھینگ بول پڑتے۔ پہلے  
بلب کے گرد پروانے چکر کاٹ رہے تھے اس نے کئی  
کوئل بھیں کر گرتے دیکھا۔ اس نے دوسری چارپائی  
پر نظر ڈالی۔  
پتا نہیں ماں کو اتنی پرسکون نیند کیسے آ جاتی ہے۔

## سانہ رضا





صبح کا نکلا شو ہر گھر نہیں لوٹا تھا۔

صبح سے خبروں میں بتایا جا رہا تھا۔ طوفانی بارش میں ہونے والی ملا تلوں و حادثات کے بارے میں۔ مکانوں کی چھتیں گر گئیں۔ دیواریں۔ درخت۔ بل بورڈ۔ مین کی چھتیں اڑ گئیں۔ کرنٹ لگ کر بھی کتنے لوگ مرے۔ اس کا دل دہلتا رہا۔ کتنے کھنبوں کے گرنے کی بھی خبر تھی۔ کھنبے کے نیچے ہی ابا ٹھہلا لگا تھا۔

اس نے پھولتی سانسوں کے ساتھ ماں کو بتایا کہ کھنبے گر رہے ہیں۔ وہ ابا کو فون کرے۔ ثریا نے چونک کر دیکھا۔ پھر اسے اس کی فکر کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سفر سے سر جھٹکا۔ اور اسے آنگن میں نیا لب رکھنے کا حکم دے کر خود وٹیاں پکانے لگی۔ ثریا کے انداز میں قطعیت، حکم اور عملیت کا ایسا امتزاج تھا کہ وہ اسے سارے خدشات دل ہی میں دبائے، آنگن میں آ گئی۔ پہلے ہی اسے ماں سے خوب ڈانٹ پڑ چکی تھی کہ اسے خود سے خیال کیوں نہیں آیا۔

ثریا نے یکدم بھونچال ہی برپا کر دیا۔ اس نے منٹ کے اندر ٹب، بالٹیاں، ہر چھوٹا بڑا برتن آنگن کے بیچ وچ رکھ دیا۔ اور اسے اور چھوٹے والے بیٹے کو حکم دیا کہ جیسے ہی برتن بارش کے پانی سے بھرتے جائیں وہ انہیں پلاسٹک کے خالی ڈبرموں میں ڈالتے جائیں۔ ساتھ ہی وہ مسلسل بول رہی تھی کہ گڑیا یعنی وہ ذرا سمجھ دار لڑکی ہوتی تو کب کا یہ کام ہو جاتا۔ پتا بھی ہے کہ ایک ایک گدھا گاڑی کتنے میں بڑنی ہے۔ وہ بھی گندرا ممکن پانی۔ (وہ گدھا گاڑی جسکے پیچھے پانی کی ٹنگی رکھ کر پانی سپلائی کیا جاتا ہے) ماں کی محنت کی کمائی کا خیال ہوتا تو اتنی محنت آتی ناں۔ مگر نہیں۔ سارے ہی بے حس بے درد ہیں۔

بہن بھائیوں کی تو موعج ہو گئی۔ یہ عین ان کی دلچسپی کا کام تھا۔ آیا دھاپی بچ لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈرم بھر گئے۔ ثریا کے حکم پر اس نے تمام برتن بھر کے

برآمدے میں رکھ دیے۔

ثریا نے چائے بنا کر پاپوں کے ساتھ بچوں کو پیش کر دی۔ اتنے دیر بھگتے رہے تھے بے چارے، بچوں کی تو گویا دعوت ہو گئی۔ مگر خود ثریا کو چین نہیں تھا۔ اس نے بچوں کے اتارے کپڑوں کو آنگن کے بیچ رکھ کر فرش پر ہی دھونا شروع کر دیا تھا۔ پھر برستی بارش ہی میں تاریں بھر دیں۔

طیبہ نے دیکھا۔ ثریا کپڑے بدل کر چائے کے دوکپ چڑھانے کے باوجود بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ اس برستی بارش سے اور کیا فائدے اٹھا سکتی ہے۔ مگر طیبہ جانتی تھی۔ کچھ بھی نہیں۔

چھٹی دو بارشوں میں وہ گھر کے سارے بستر، کبل حتیٰ کہ فرش پر بچھاوری نما کارپٹ تک دھو چکی تھی۔ وہ بہت جفاکش اور سخت جان تھی۔ اس کے ماتھے پر ابھری سلوٹیں بتاتی تھیں کہ کسی ایسی سوچ میں مبتلا ہے جو اس کے جسم و جان کو اس مشقت میں ڈال رہی ہے۔ جیسی مشقت کدال سے زمین کھودتے

مزدور کی ہڈیوں پر پڑتی ہے۔ کیا سوچ رہی تھی ماں۔ ”ابو نہیں آئے اب تک؟“ چھوٹے والے کو اچانک ہی یاد آ گیا۔

یہ سوال گڑیا دل میں بار بار کرجکتی تھی۔ سب کے ساتھ اس کی نظر سبھی ماں کی سمت اٹھیں۔ ماں نے چونک کر چھوٹے کو گھورا۔

اس نے سوال دہرایا۔ جواب میں ثریا نے ایسی سرد نگاہ کی مظاہرہ کیا کہ بچہ دب کر رہ گیا۔ ثریا کے چہرے پر ایسا تشویر اُٹا تھا۔ جس نے اسے چپ کر دیا۔

بعد میں کسی نے جرأت نہیں کی کہ وہ ابو کہاں ہے کے بارے میں سوچے بھی۔ لیکن وہ۔ یعنی گڑیا۔ اس کے دل میں ماں کے خلاف گلہ ایسے بڑھنا لگا جیسے آٹے میں خمیر بڑھتا ہے۔ پو پلاسا۔ کھاسا۔

بلبلے مارتا ہوا۔

ہاں ابا ایسا۔ ویسا اور کیسا تھا مگر۔ ایسی برستی خطرناک، بارش میں اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اور محال ہے جو ماں کو ذرا پرواہ ہو۔

کسی ماہر رنگ ریز نے آسمان کو سیاہ رنگ میں رنگ کر رکھی دوپٹے کی طرح پھیلا دیا تھا۔ جس میں سلوٹ کا شاہینک زندہ تھا۔

اور ایسے میں ابا۔ اس کا دل سکڑا۔ پھر پھیلا۔ ہاں پر کچھ بھی ہو۔ رات جتنی بھی بیت جائے۔ یا راتیں۔ دو یا چار مگر ابا لوٹ آتا تھا۔ وہ صبح اٹھتی تو ابا ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑے، منہ کھول کر خرائے لے رہا ہوتا۔ ثریا کی چڑچڑی غلت زدہ پکاریں۔ گرتے پڑتے برتن۔ لٹیریں جانے والوں کی دہائیاں۔

گڑیا کو پراٹھے تھوپنے کی آواز سے ثریا کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا وہ جیسے اپنے اندر کا سارا تلش پراشوں میں بھر دیتی۔

مگر ابا۔ اس کے کھلمنہ پر ہونے والی کھیوں کی یلغار بھی خواب غفلت کے بیچ حائل نہیں ہوتی تھی۔ بہت ہوا تو وہ فضا میں ہاتھ چلا دیتا۔ کروٹ بدل لیتا۔ یا پھر منہ پر تکیہ رکھ لیتا۔

مگر آج تو ہر جگہ بارش ہے۔ ابا جن تھڑوں پر بیٹھتا تھا وہ بھی ٹھیکے ہوں گے تو پھر کہاں ہوگا ابا۔ اس کا دھیان ایک بار دن بھر ہونے والے حادثات کی سمت چلا گیا۔ اس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ داوی کہتی تھیں کلمہ سے دل کی بے چینی کو فرار آتا ہے۔ اور تھوڑی دیر میں اسے سکون محسوس ہونے لگا۔

اس نے منہ پر دو پٹا رکھ لیا۔ نیند بس آنے کو تھی۔ آئی آئی۔ مگر ابا۔ ہاں ابا۔ ترترتے ہوں ہوں۔ اور ہلکی سی چیخاؤں میں یہ میٹھی کی آواز تھی۔

برسات کے موسم میں، تنہائی کے عالم میں۔ میں مگر سے نکل آیا، بوتل بھی اٹھا لیا۔ ابھی زندہ ہوں تو جی لینے دو۔ جی لینے دو۔

بھری برسات میں۔ آہا۔ بھری برسات میں۔ او ہو۔

بھری برسات میں جی لینے دو۔

ہاں ابا۔ یہ ابائی کی آواز تھی۔ گمان نہیں تھا۔ ابا نے اس وقت دروازہ نہیں بجا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اور بجا بھی لیتا تو ابا سمیت سارا محلہ جانتا تھا۔ ثریا نے کھولنا نہیں تھا۔

داوی بتاتی تھی۔ ایک بار ثریا نے کھولنا گرم پانی پھینک دیا تھا دروازہ کھولتے ہی ابا پر۔ وہ اس وقت بہت چھوٹی ہی ہوگی۔ مگر سوچتی ابا کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔

تو ابھی منٹ میں ابا دیوار ٹاپ کر اندر ہوگا۔ اس کے صبح سے بے چین دل کو فرار آنے لگا۔ اس کی چلیں ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔ اس کا لاشعور ابا کی آمد ہی کا منتظر تھا۔ اس نے ایک بار شعوری کوشش سے آنکھیں کھولی تھی۔ اسے ابا آنگن سے برآمدے کی طرف آتا دکھائی دیتا تھا مگر پھر۔ وہ سو گئی۔ ہاں۔

ندیاری نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ ابھی تو آنکھ لگی تھی۔ پھر کیسے حل گئی۔ وہ ساکت لیٹ حیرت سے سوچ رہی تھی۔ ہاں برتنوں کی اٹھا بیخ، ابا یقیناً کچھ کھانے کو ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اسے تسلی ہوئی۔ ماں نے بالخصوص روٹی نہیں بنائی تھی۔ مگر

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے  
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ گلیاں تھیں چوہارے

نارنگی انٹار

قیمت 400 روپے

ملکت عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:  
32735021

37، اردو بازار، کراچی

پاپوں سے پرہیز بھرے بچوں نے رات کے کھانے میں اتنی رغبت نہیں دکھائی۔

سوستر خوان میں دو ثابت روٹیاں اور بچوں کے چھوڑے آدھے ادھورے ٹکڑے موجود تھے۔ آلو کی بھجیا بھی ویسے کی ویسی تھی۔

اس پر پھر سے نیند طاری ہو گئی۔ ابا شکم سیری کے بعد اب پھر گنگنا رہا تھا۔

”تیرے بھیکے بدن کی خوشبو سے، لہریں بھی ہوئی مستانی سی۔“

ابا کی آواز اچھی تھی۔ اسے ہزاروں گانے یاد تھے۔

ابا کا گانا جیسے لوری کا کام کرنے لگا۔ میٹھی میٹھی بہت میٹھی نیند۔

اس نے ابا کو ماں کی چارپائی کی جانب آتا دیکھا۔ ابانے پائنتی پر بیٹھ کر ماں کے پیڑ تھامے۔

وہ جیسے اب خواب دیکھ رہی تھی۔ ابا کا مسکراتا چہرہ بھی نمایاں تھا۔ ابا کی گنگنا نہیں۔ برسی رات۔

ٹپ ٹپ گرتے پیٹنگے۔ بارش کی سلین زدہ مہک اور گلتنے سڑتے پتھر کی بدبو۔

سب نے مل کر کیا ساں باندھ دیا تھا۔ اسے اپنے اندر سرشاری سی اتنی محسوس ہوئی۔ مگر یہ کیا۔

یہ کیا ہوا۔ ماں نے پائنتی پر ذرا سی جگہ بنا کر بیٹھے ابا جن کے ہاتھ میں ان کے پیروں تھے۔ انہی پیروں سے ایسی طاقت کا دھکا مارا تھا کہ ابا کو لمبے کے بل دور جا کر۔ خود ماں اچھل کر بیٹھی تھی اور خون خوار نظروں سے ابا کو گھور رہی تھی جیسے کچا چاچا جائے گی۔

ابانے اپنی حیران آنکھوں میں شیش بھرنا چاہا۔ مگر ماں کو ذرا ڈرنے لگا تو۔ آ۔ آ۔ میں سناتی ہوں گانا۔

وہ پہلوان لگنے لگی جو مقابل کو جان سے مار دینے کے لیے لڑنے کی دعوت دیتا ہے۔

ابا دونوں ہاتھوں کے سہارے کھڑا ہوا اب ہاتھ جھاڑ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں میچ لیں۔ جڑے بھنچ لیے اب کیا ابا ماں کو مارے گا۔

یا۔ یا ماں ابا کو۔

اس کا دل بولا۔ اگر ایسی مارم بیٹی (مارکنائی) شروع ہو جاتی تو خدا کی قسم ماں ابا کو دھول چٹا دیتی۔“

ابا کھڑا تو جارحانہ تیور لیے ہوئے تھا۔ مگر ماں کی آنکھوں میں اترے خون نے اسے سہمسا کر دیا۔ مگر تب ہی سب سے چھوٹی والی کسمائی اور رونے لگی۔

اس نے ماں کی آنکھوں کو سوجا ہوا درخ دیکھا۔ دیر تک سونے والا اب بھی آج صبح ہی جاگ چکا تھا۔

اور پچھتے خان بنا مسلسل شریا کو گھورتا جاتا تھا۔

ماں باپ کے تیز دھچکے سب سہم سے گئے گلی سے کسی بچے نے آواز لگائی۔ ”آج اسکول کی چھٹی ہے۔ سارے اسکول میں یانی بھرا ہے۔“ ساتھ

والے گھر سے دادی نے بھی ہانک لگائی۔ متوجہ کرنے کے لیے وہ درمیانی دیوار پر ہاتھ بھی مارتی جاتی تھی۔

”ارے شریا خبروں میں بتا رہے ہیں۔ سب اسکولوں کی چھٹی ہے۔ یہ کارڈ پرائیویٹ سب۔“

دادی کی آواز میں بھی خوشی تھی۔

بچوں نے تو خوشی سے چھلا کلیں لگائیں۔ مگر اس نے ماں کی آنکھوں میں جھکن اتارنی دیکھی۔

”ناشتہ ملے گا کہ ایسے ہی بھوکا نکل جاؤں۔“

ابا کا بولنا ناگزیر تھا۔ کچھ دیر پہلے تک تو اس کا خیال تھا کہ سب گھر سے نکل جائیں گے تو وہ خود آرام سے ناشتہ کرے گا۔ مگر اب تو شریا کو گھر میں رہنا تھا۔ تو

اب بھوکا بیٹھے سے بہتر ہے وہ رعب سے مانگ لے۔ وہ مستعدی سے کھڑی ہوئی۔ اس نے چنگیر پکڑی، مگر شریا نے جھپٹ لی۔

”نہیں۔“ اس نے ابا کو ناشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ گڑیا کا دل ڈوب گیا۔ رات کو تھم جانے والی لڑائی اب شروع ہوتی تو رات تک جاری رہتی۔

آج تو شریا گھر بھی نہ آئی۔ اور لڑنے کے لیے ابا چھٹی بھی کر لیا کرتا تھا۔

خبر ابانے کبھی مارا تو نہیں۔ یاں ماں ہی چٹا، چوکی، چکلا، یا جو ہاتھ لگتا مارا کرتی تھی۔

اس نے سہم کر ابا کو دیکھا جو سخت جارحانہ عزائم

لیے کھڑا ہوا تھا۔ شریا نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ تو لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

چند منٹ ہی گزرے ہوں گے۔ جب دادی کی گھبراہٹی آواز ابھری۔ ”شریا۔ اے شریا۔ اور ریاض۔“

لڑ رہے ہو؟ اوما لک۔“

وہ ساتھ ساتھ دیوار پر پہلے ہلکے پھر زور زور کے ہاتھ مارنے لگیں۔ اس کی توجہ کے عین مطابق۔

اگلے منٹوں میں وہ سخت پریشانی کے عالم میں ان کے آنگن میں موجود تھیں۔

بغیر لے سنے انہیں منصف کا رتبہ بھی فوراً مل گیا۔ شریا اور ریاض اب ان کی طرف منہ کر کے ٹھکڑے شکایات کر رہے تھے۔

گڑیا جانتی تھی۔ دادی دل سے، ضمیر سے، عقل و ہوش سے ماں کی طرف دار نہیں مگر ریاض نکلا، ٹکھنوں، ہڈ

حرام بے ہدایت سب کچھ ہے۔ دادی نے یہ بات پوت کے پاؤں پالنے کے زمانے ہی سے بھانپ لی تھی۔

جو ان ہونے پر جیسے خوبوں پر چار چاند لگ گئے یعنی بہت زیادہ نکلا۔ بے حد ٹکھنوں بے ہدایت بے پناہ اور ہڈ حرام (شریا نے بعد میں نمک حرام کا اضافہ کر دیا)

مگر وہی ہر ماں کی طرح دادی کو یقین بلکہ کامل ایمان تھا کہ شادی کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک

اچھی لڑکی اسے بدل دے گی۔

اور شریا واقعی بہت اچھی لڑکی تھی۔ سلیمہ بیگم کی سب سے بڑی ہونہار سلیمہ شاعر صابر دھیمی اور اس جیسی ساری مثالوں کے ساتھ شریا۔

پیاری شریا۔ بے چاری شریا۔ پیاری تو وہ اب رہی نہیں تھی۔

تو شادی نے پیاری شریا کو کچھ نہیں دیا۔ ہاں باغ بچے۔ ایک پرائیویٹ اسکول میں دو ششوں کی ماسی گیری، آیا گیری، اور مصائب و آلام کا ایک

پہاڑ۔ جہاں وہ خود کی دست گیر خود ہی تھی۔

اور ریاض؟؟؟

رشتہ طے ہونے کے زمانے میں اس نے اتفاقاً

شریا کی صورت دیکھ لی۔ دادی نے ریاض کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی اور حیرت بھانپ لی۔

”ایسے ہی نہیں دیں گے اگلے اپنی لڑکی۔ جہان پھلک کر دائیں گے۔ لڑکا کیا کھاتا کھاتا ہے۔“

ان کی بیٹی کو عزت سے گھر بٹھا کر کھلا سکے گا یا نہیں۔ تسلی ہوئی تو رشتہ ملے گا۔“

”کر تو رہا ہوں نوکری۔“ ریاض نے نروٹھے پن سے کہا۔

”چھوڑنی کب ہے؟؟“ دادی نے جھٹکتے لہجے میں کہا۔

”کیوں چھوڑوں گا۔ ابھی تو سیٹ ہوا ہوں۔“ دراصل ریاض کی ہڈی میں ٹک کر بیٹھنا نہیں

تھا۔ وہ جلد اکتا جاتا تھا۔

کون سا شعبہ ہوگا جس میں اس نے ہاتھ نہ مارے ہوں۔ بات کر دو تو اس سے زیادہ تجربہ کار اور عقل مند دوسرا کوئی نہیں۔ مگر عملی طور پر نہیں؟

تو شریا کی پیاری صورت اور دادی کے جھوٹ رنج ریاض کو مجبور کر رہی دیا کہ وہ ذرا سنجیدگی سے کام کرے، شادی سے پہلے کے آٹھ نو مہینے اور بعد کے پورے نو مہینے وہ تن دیں سے کام کرتا رہا۔

دادی کا ٹکا فٹ بیٹھ گیا تھا۔ شادی کے بعد لڑکے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا بھی تو ٹھیک ہو گیا ناں۔

تو جب شادی کے نو مہینے بعد اس نے ملازمت چھوڑ کر آنے کا بتایا تو دادی سمیت سب نے یقین کر لیا۔ مالکان ہی غیبت ہوں گے۔ ریاض نے اس بار ایمان داری سے کام کیا تھا۔

صبح نو بجے نکلتا۔ دوپہر کو کھانا کھانے آتا۔ اور پھر رات کو ریاض کی آمد سے چاہیں تو گھڑی کا وقت سیٹ کر لیں۔

سارے دوستوں کو جنہیں وہ جانی کہتا تھا۔ شریا کی قربت میں انہیں بھی بھلا چکا تھا۔ ایسا لگتا اسے شریا کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

شریا کے چہرے کی طمانیت اس کی جھکی پلکیں۔

بالوں میں لگے گجرے۔ اور ریاض کے لئے رس نکلے۔ گرم گلاب جاسن کی پھلی۔ تلی پھلی کے بیجے کھجے کاٹنے اور کٹنے کا پکنا کونے کی خوشبودار اخبار۔ ریاض کی ماں۔ کا دل بار بار ہوتا۔

وہ تصویر کی آنکھ سے منظر کشی کرتی۔ وہ آگن ہی میں چار پائی ڈال کر پڑی ہوتی تھیں۔ جب ریاض گھر لوٹا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی ہوتے تھے۔ یعنی وہ کھانے کی چیزیں یا گجرے ماں سے چھپائے ہوئے ہوتا۔ چیکٹ کے اندر، یا پھر کہاں۔ پھر وہ سوچتیں۔ اس نے کس رازداری سے دروازہ بھیڑ کر ثریا کے بالوں میں گجرے لگائے ہوں گے۔ یا گرم گلاب جاسن اپنے ہاتھوں سے کھلائے ہوں گے۔ بوڑھی۔ ہونے کے باوجود ریاض کی ماں کو لگدگی ہونے کا حساس ہوتا۔ وہ آنکھیں موند کر سرشار سا ہو کر بار بار منظر کو دیکھ کر دیکھتیں جیسے ”تم خوش ہونا؟؟ وہ ثریا کو ٹوٹتیں۔“

”جی۔“ ثریا کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ مگر انہیں لگتا جیسے یہ اثبات باز گفت بن کر سارے جہاں میں پھیل گیا۔ آسمان کو چھو کر لوٹا ہوا۔ ”جی۔“ ثریا ملازمت کے ختم ہونے کی گھمبیرتا کو سمجھ نہیں پارتی تھی۔ اللہ خبر دو بار مل جاتی تو کری۔ لیکن فی الوقت تو ریاض اٹھارہ ماہ کی ملازمت کی تھکان اتار رہا تھا۔

اور ریاض کی تھکان پہلا بچہ پیدا کرنے کے بعد دعوت کی کمر میں رہ جانے والے اس تھکان اور درد کی طرح تھی۔ جو آخری سانس تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔

جب تک ثریا صحیح صورت حال کو سمجھتی وہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ریاض کی ماں بے حد مشفق اور دردمند عورت تھی۔ وہ ثریا کو گلے لگاتے روئی اور معافی مانگتی کہ اس نے تو بھلائی سوچا تھا۔ ثریا کو ساس کی صاف دلی اور غم زدہ ہونے اور شرم سار ہونے پر یقین آ گیا۔

ریاض کو سمجھاتے ڈانٹتے اور کوستے دیکھ کر کوئی

یقین نہ کرتا کہ وہ اس کی ماں ہے۔ وہ ثریا ہی کی ماں لگتی تھی۔

مگر اس اخلاقی سہارے سے پیٹ تو نہیں بھرتا تھا۔ ریاض محنت سے جی چراتا تھا۔ من پسند نوکری ملتی نہیں تھی۔ ملتی تو نکلتا نہیں تھا اور تک جاتا تو دوستوں کی منڈلی میں کھینچ لیتی۔ مرد کماتا ہو تو عورت کڑھتی ہے مرد کماتا ہی نہ ہوتا۔؟؟

ریاض کو ملا کر ساس کے تین بیٹے تھے۔ ساس کا گھر کھلے آنکھ کے سامنے بنے۔ کسی اسکول کا منظر پیش کرتے تین کمروں پر مشتمل تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ۔ ریاض تو کما کر لاتا نہیں تھا۔ مشترکہ باورچی خانے کی ہانڈی پر ثریا بھی بیچے سمیٹ کر بیٹھ جاتی۔ پہلے جینٹیلوں نے منہ بنایا پھر جینٹیلوں نے بھی بچوں کو دسترخوان پر شور۔ بچانے اور غیرت نہ دکھانے پر ٹوکنا شروع کر دیا۔ سب کا۔ خیال تھا۔ ثریا کے بیچے روئی کو نمدیے پن سے دیکھتے ہیں اور کھانے پر پل پڑتے ہیں جیسے۔۔۔۔۔

بعض جملے قصداً اُدھورے چھوڑے جاتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ زیادہ پر اثر ثابت ہوتے ہیں۔ شروع میں ساس نے سب کو شرم دلانے کی کوشش کی۔ کہ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سیکھتے ہیں اور ابھی وہ زعمہ ہے۔ اور وہی سانس ورتانی (تقسیم کرنا) ہے۔ اور گھر اس کا ہے۔ خیر دار۔ ”سب دیک گئے۔ واقعی گھر کی مالک تو وہی تھی۔ مگر ایک روز دونوں جینٹیلوں نے ایک کر لیا۔ گھر بھلے سے ساس کی ملکیت ہے اور وہی ہانڈی ورتانی ہے۔ مگر کما کر تو ان کے شو ہر لاتے ہیں۔ ریاض بھی لائے اور حق سے بیٹھے۔ ساس کے لیے یہ جملہ چشم کشا تھا۔

اگلی صبح تین کمروں کی سیدھ میں دیواریں کھینچ گئیں۔ تین بھائیوں کے تین گھر، ایک ایک حصے میں مانو پچاس پچاس گز جگہ آئی۔ مگر امن ہو گیا۔ ہاں ٹھیک ہے اپنا کماؤ اپنا کھاؤ۔

ساس نے اپنے لیے درمیان والے گھر کے صحن میں چار پائی ڈال لی۔ جہاں سے وہ باقی دو کی خبر

گیری کرتی۔ ساتھ ہی حفظ ماتقدم کے طور پر پوچھ لیا۔ کہ وہ تو کچھ کمائی نہیں ہے۔ تو کیا اپنے لیے چولہا بھی چار پائی کے ساتھ رکھ لے۔ دونوں بڑے بیٹے اور بہنیں پیروں پر جھک آئے۔

”اماں کیسی باپس کرتی ہیں۔ اس روز کے سخت جملے تو صرف ایک کوشش تھی کہ ریاض عقل پکڑے اور کمائے۔ میرا گھر تو آپ ہی نے چلانا ہے۔ میں جو پیسے آپ کو دیتا ہوں راتوں کے ویسے ہی دوں گا۔“ اس کی بیوی نے بھی زور شور سے سر ہلایا۔ یہ تو سراسر فائدے کا سودا تھا۔ ساس کے سر بھی ساری ذمہ داری۔ وہ سستا اور اچھا سامان ڈھونڈنے صبح سویرے ہی نکل جاتی۔ اس مہنگائی کے زمانے میں پیسے بچا کر بھی لانی تھی۔

ساس کا دل بڑا ہوا۔ مگر وہ جو سوچ بیٹھی تھی۔ اس سے اب پیچھے ہٹنے کو نہ تھی۔ اس نے اپنی وصیت بھی لکھوائی اس کے مرنے کے بعد مکان تینوں بیٹوں کا ہوگا۔ ہاں مگر ریاض کا حصہ ثریا کے نام لگا دیا۔ جس نے سنا دانتوں میں انگلیاں داب میں۔

”ہائے مائی غیر لڑکی پر بھروسہ کر لیا۔ اپنے گئے بیٹے کو ہاتھ دکھا گئی۔ وہ جو سب لے کر بھاگ گئی؟“

خود ثریا بھی ہکا بکا تھی۔ ساس نے سب کے اعتراضات کل سے نئے لبوں پر ڈھکی مسکراہٹ درآئی۔ آنکھ میں نمی نے بھی چمک ماری۔ ”غیر نہیں ہے۔ بہو ہے، میرے پوتے پوتیوں کی ماں۔“

اور ریاض کی فکر ہے۔ محبت ہے۔ اسی لیے تو یہ قدم اٹھایا ہے۔

اور وہی ثریا۔ وہ بھانجے والی بیٹھ دکھانے والی ہے ہی نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ”سب ہکا بکا ہو گئے۔ سب کا دل ساس کے یقین پر ایمان لے آیا۔ ثریا کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ سب کے ہر اثبات میں ہلنے لگے تھے۔ اس کے جینٹیل نے سب سے پہلے بڑھ کر ماں کے اقدام کو سراہا اور ثریا کے سر

پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو۔ ثریا کا سر جھک گیا۔ اسی جینٹیل نے اس کے بچوں کو نمدید کہا تھا۔ جینٹیل ہی ہم خیال فوراً ہو جاتی تھی۔ ہاں ہاں کرتی اس کے ساتھ چمک کر بیٹھتی۔ ڈھارس کے طور پر اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔ ”ان ہی ہاتھوں سے اس نے آٹا گوندھتی ثریا کے ہاتھ سے پراٹ جینٹیل تھی۔

دوسرے جینٹیل جھٹائی نے فقط سر کو ہلانے پر اکتفا کیا۔ جاں چھوٹی لاکھوں پائے ثریا کے حصے میں اب ایک بڑا کمرہ۔ آگے بڑا کمرہ۔

دروازے کے ساتھ غسل خانہ وغیرہ۔ باروچی خانہ برآمدے کے ایک جانب بنادیا گیا۔ اور ثریا اسی باروچی خانے میں کھڑی خالی برتنوں اور ٹھنڈے چولہے کو دیکھتی رہی۔ اتنے بڑے بڑے فیصلوں کے باوجود اس کا باروچی خانہ خالی تھا۔ ٹھنڈا چولہا۔

ایک جینٹیل نے ٹرے بھر کے چنوں کا پلاؤ بھیج د۔ دوسرے نے کبھی قیمہ کی پلاٹ راستے کے ہمراہ۔ چار روٹیاں بھی دسترخوان میں پکی تھیں۔

ادھر دعوت منائی جارہی تھی اور ادھر۔ صبح سے نئے گھر کو سجاتے اس کے چھوٹے چھوٹے بیچے واقعی کھانے پر پل پڑے ویسے ہی۔

جیسے ابھی تو بتایا تھا بعض جملوں کو ادھورا چھوڑنا زیادہ بامعنی ہوتا ہے۔

ثریا نے بھی لگا ہیں چڑالیں۔ کل۔ یہ دو حرف سوالیہ نشان تھے۔ کل۔ کل کیا ہوگا؟“

ریاض تو ماں کی اس نا انصافی و ظلم پر احتجاجاً جا گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ ساس درمیانی گھر سے دو کپ چائے لیے آئیں۔

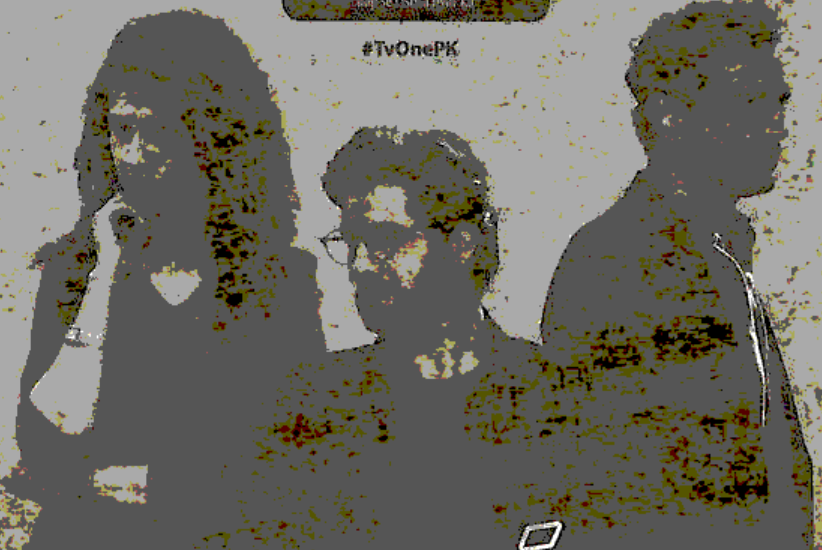
اسے اپنے سامنے بٹھا کر لپٹی بغیر کہنا شروع ہو گئیں۔

ان کی تمام تر گفتگو جس میں دکھ۔ معذرت شرمندگی اور درد کا عکس تھا۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ اب اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے

TV ONE

www.tvonepk.com

#TvOnePK



# تو جو نہی

TU JO NAHI

کاسٹ: اذنیال راجیل، عام محمود، سحر افضل، حارث وحید، فتالہ اولیس، عذرا محی الدین،  
نعیم طاہر، تارہ محمود، اورنگ زیب لغاری، بینا چوہدری اور خالد بن شاہین

تحریر: جہاں زیب قمر کنیت، عید ظلیل اللہ فاروقی ڈائریکٹر: اعظم مرزا  
پروڈیوسر: گولڈ برج میڈیا ایگزیکٹو: ڈی اے سر، سیمہ طاہر خان

## قربتوں کو فاصلوں میں بدلتی محبت کی کہانی

کراچی، وہاں میں اس کا حصہ اس کے حوالے کیا جائے رہی خواہش تھا کہ ماموں کو ساری ساری ہے۔ ان کی بیوی اور بیا سیر تھا، دنک دیر پہنچا لے کے سخت چاہت ہیں۔ سیر کی شاہ سے پہلی ملاقات ایک ناخوشگوار حادثے کی صورت میں ہوئی ہے جہاں شاہ سیر کی بد نظمی اور اکثر اس کی بری طرح سے عزتی کر رہی ہے۔ سیر کی سیر اسے اپنی نا کامیابیوں کے بارے میں شاہ کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا تیرہ کر کے سادھوں کے چال بنے لگتا ہے۔ کہانی میں اس وقت اہم موڑ آتا ہے جب اس نے شاہ کا بیٹے، والدین کی شکوہ لیا ہے جس میں اس کے والد جلال احمد اپنی بیوی عیسیٰ سے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ شاہ کی شادی اس سے ہوگی کیونکہ اس کے لیے بڑیوں کی نہیں صرف شاہ ہی اس کی بچپن کی ساتھی ہے، اسے ابھی طرح کھینچ رہا ہے اور اس کا ہے حد تک لیا جاتی ہے۔ اس موقع پر بیوی کے احتجاج کو وہ بالکل خاطر میں نہیں لیتے۔ اس جو خود کو اس کی معذوری کا دہرا دہرا کرتا ہے، یہ جاننے کے بعد کہ اس نے شاہ سے محبت کرتا ہے اور اسے اپنی دین جانے کا خواب دیکھ رہا ہے اس پر کچھ ہنس جاتا ہے وہ بھائی کی خاطر قربانی دینے کا فیصلہ کرتا ہے اور شاہ کو بدمعاش کرنے کے لیے بیرون ملک سے آئی ہوئی اس کی سوتیلی ماں کی طرف دیکھ کر ہنس لگتا ہے جو پہلی نظر میں اس پر مڑتی ہے۔ اس کا بھائی شاہ کے بیرون ملک سے آئی بھیاں گرتی ہیں۔ اس کی سبب وفائی، بے رخی اور پھر یہ خبر کہ اسے جس سے ہے باندھنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ یہ صورت حال شاہ کے دل پر طوفان برپا کر رہی ہے اور پھر غم کی طرح نرم و لطیف شاہ شعلہ بن جاتی ہے اور وہ جس سے پہلی ایک سوتیلی بھائی کی طرف بدلتی ہے۔

شاہ کے فیصلے میں کون کھڑا ہے۔۔۔ اس کی بیا سیر؟

یہ کہانی بنیادی طور پر شاہ کے گرد گھومتی ہے۔ شاہ کی والدہ کے انتقال کے بعد اس کے والد کے دوست کی شادی کر لی اور اپنی بیوی کے ساتھ شاہ کو لے کر بیرون ملک جانے لگے تو پہلی شادی میں اپنی اور شاہ کے مناسب کچھ کہ سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے بچپن کو اپنے پاس رکھ کر سیر سے اس کی پرورش کریں۔ شاہ کے خود پسند اور لاپرواہ آپ اور سوتیلی ماں نے شاہ کی یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ شاہ اور شاہ کے دو بیٹے آسن اور آسن ہیں جو شاہ سے بڑے ہیں۔ بیٹوں بچپن کے ساتھی ہیں ایک دن چھت پریشیل کے دوران شاہ کی گریا دلچسپ لگوانے کے لیے آسن جس سے بچپن بھی کرتا ہے اور اس کے دیکھنے سے آسن چھت سے گھر معذور ہو جاتا ہے۔ اب اس کی زندگی بقیہ بچپن کی طرح ہے۔ بیٹوں جوان ہوئے ہیں۔ شاہ اپنی ماں کی مصیبت اور بنیادی باتوں کی وجہ سے گھر پر کی جاتی ہے۔ وہ آسن کا سبب حد تک لیا جاتی ہے۔ شاہ بچن کر ساتھ رہتی ہے۔ آسن استقامتی زندگی کی سب سے بڑی خوشی، اچھے مستقبل کی امید اور اپنے وجود کا لازمی حصہ دیکھ لگتا ہے۔ وہ ایک طرف طور پر شاہ سے محبت کرتا ہے مگر کبھی کبھار شاہ کو کرتا اور شاہ کی سبب اپنے دل کی کیفیت کا اندازہ پر منتقل کرتا رہتا ہے۔ شاہ آسن کو اپنا بڑا ترین دوست سمجھتی ہے۔ آسن اور شاہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر گھریلو ماحول کی وجہ سے یہ محبت خراب ہے۔ آسن سے بچہ ہے جبکہ صرف شاہ اس ہارے میں چاہتی ہیں۔ اس موقع پر کبھی شاہ ایک بچہ کو دیکھ کر کا افسانہ ہوتا ہے جو شاہ کا ناموں زور ہے مگر وہیں ایک دوسرے کے صورت آشنا بھی ہیں۔ شاہ کے بچپن، والدین کے اس کے والد سے شہر یہ ملاقات تھے جو ترک تعلق کا موجب بنے شاہ کے تانا تے چھوڑنے ہونے اس کے ماں کو شہریت کی کراہی تو اس کی فدا ہو کر

#TvOnePK

Monday 8:00 pm



ثریا کو کمرسنی ہوگی۔

ثریا کو مگر کہا۔ اور کیسے؟؟

وہ بھونچکی رہ گئی۔ ساس کی چندھی نظریں غیر مرئی نقطوں پر جمی تھیں۔ اس نے جو کہا تھا بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔

☆☆☆

اپنی خود ساختہ ناراضی یا لاتعلقی ختم کر کے ریاض نے ڈیڑھ ماہ بعد گھر میں قدم رکھا۔ تو سارے آگن میں آلو کے پرائٹوں کی خوشبو چکرا رہی تھی۔ باورچی خانے سے اچھی دھوپ کی لکیر پر سورج کی روشنی تھی۔ ایسے لگتا تھا جسے مرنے والے اڑ رہے ہوں۔ ریاض نے لمبا سانس بھر۔ بھوک جاگ اٹھی۔

”مجھے دہی میں چٹنی ڈال دیں ائی چھوٹے والا کہہ رہا تھا۔“

”اچھا بیٹا۔“ ثریا کی آواز میں طمانیت اور شیرینی تھی۔

”آلو کے پرائٹے اور دہی۔ کیا میرے پیچھے بڑے لگا ہے۔“

اس کی آواز بیک بیک گھر میں پھیل گئی۔ دیوار کے اس پار بیٹھی ماں بھی اپنی جگہ پر سُن رہ گئی۔ ثریا بھی۔ پرائٹے کے سارے سنہری پھول جل کر سیاہ ہو گئے۔ وہ باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔

دونوں ہاتھ سر سے اوپر کر کے چوکھٹ میں دھرے تھے۔ اور خمار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یا پھر۔ اول ل ل۔ ہاں لو فرانہ نظروں سے۔ یہ ٹھیک تشبیہ ہے۔

”تو پھر اس نے آگے بڑھ کر جلتے پرائٹے کو تو سے اتار دیا۔ اور ہاتھ جھٹکنے لگا۔ اتنا گرم وہ پوروں پر پھونکیں مار رہا تھا۔“

پھر اس نے جلتے آلو کے پرائٹے کو چٹکی سے پکڑ کر درمیان سے بھاڑ دیا۔ جلتے حلقے کو چھوڑ کر دوسری پرت کو دونوں میں ختم کر دیا۔

”اتنے دن دو ہی چیزیں یاد رہیں۔“ تو اس

نے اس کے شانے پر بازو پھیلا دیا۔ اور تیرے ہاتھ کے پرائٹے۔“

وہ یاد کی کک مٹانے کو عملی کوشش کرنے کو جھکا۔ مگر ثریا کے ہاتھ جھٹکنے سے پہلے تینوں بچے دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

وہ بدگ کر پیچھے ہٹا۔ اور چھوٹے والے کو گود میں اٹھا کر بے تحاشا چوسنے لگا۔

دونے ناگوں سے لپٹے تھے۔ ثریا کے وجود کی تپتی ہوئی ڈوریوں ڈھیلی ہو گئی۔ اس کے چہرے کا تغیر کھینچنے لگا۔ جیسے تو بے رحمی پھٹتا ہے۔

دنیا کی ہر عورت کی طرح شوہر کو بچوں سے لاڈ کرتا دیکھا اسے خود پر فخر ہونے لگا۔ جیسے بچے ہی اس کا اصل کارنامہ رہے ہوں۔

تو اس کی ناراضی ختم ہو گئی (وہی جو مکان ثریا کے نام لگا ہوا تھا۔ اور جو ریاض کی ماں صرف ثریا کی ماں لگتی تھی۔ شکوہ) وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی کہ ماں تو وہ ریاض ہی کی ہیں۔ اور یہ کہ وہ غصہ ٹھوک دے (تھکا ہوا لگتا تھا)۔

وہ اسے لے کر بیٹھنا چاہتی تھی کہنا سننا چاہتی تھی۔

مگر وقت نہیں تھا۔ ساڑھے اٹھ بجنے کو تھے۔ بس آیا چاہتی تھی اسے گارمنٹ فیکٹری میں لے جانے کے لیے۔

”میری بیوی اور فیکٹری میں کام۔“ ریاض کے اٹھائے طوفان نے سارے محاسلوں کو اس کے آگن میں پھینکا دیا۔

وہ ثریا کا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا۔ جس نے اس کی عزت کا جنازہ چوک پر رکھ دیا۔ وہ اچھل اچھل کر ثریا کو مارنے دوڑتا تھا۔ ثریا بے چین بننا پانی کہ یہ تو ساس کا فیصلہ تھا۔ بلکہ اس نے ملازمت ڈھونڈی۔ بات کروائی۔

ریاض نے اعلان کیا کہ وہ ماں کی بچھلی ساری خطائیں تو معاف کر سکتا ہے۔ مگر یہ والی۔ وہ باؤلے کتنے کی طرح سردائیں بائیں مار رہا تھا۔ تماشا دیکھنے

کے شائق بھی اکتا گئے۔ محلے کے ایک بزرگ تعلیمت سے کھڑے ہوئے۔

”ٹھیک ہے۔ تمہاری غیر حاضری میں دو عورتوں کی عقل نے جو بہتر سمجھا وہ کیا۔ اب تم آگے ہونا۔ کماؤ گھر بٹھا کر کھلاؤ بیوی کو۔“

کون یا گل عورت ہوگی جس کی روٹی پوری ہوتی ہو تو وہ صبح سے شام تک فیکٹری میں خود کو رگڑے۔ شوقیہ کرنے والی نوکریاں اور ہوتی ہیں میاں۔

”کیوں بھی ثریا۔ یہ کہا کر لائے گا تو تم پھر بھی جاؤ گی فیکٹری؟“ بزرگ آر پار والا مزاج رکھتے تھے۔

ثریا نے سب کی طرف نظر کی۔ وہ ابھی تک فیکٹری جانے والی سیاہ چادر اور بند جوتی میں آگن کے بیچ چار پائی پر بیٹھی اسے جرم سن رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سستا پرس بھی تھا۔

ریاض کے انداز کی حیرت اور عملیت نے اسے موقع ہی نہ دیا تھا۔ کہ وہ یہ سب اتار کر رکھ دیتی۔ ”امی فیکٹری جاتی ہیں ناں کام پر۔“ انہیں لینے بس آتی ہے۔“

بیچ کا جملہ ہی تو باعث طوفان تھا۔ بزرگ سمیت سب کی نگاہیں ثریا پر جمیں۔ ثریا نے ساس کو دیکھا جو گر بیان میں منہ ڈالے بیٹھی تھیں۔ ثریا نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ سیاہ چادر اتار دی۔ جوتی بھی اور پرس بھی۔ فیصلہ ہو گیا۔ وہ واقعی شوقیہ نوکری نہیں تھی۔

اس بار ملازمت فوراً مل گئی۔ سب کو لگا ریاض مددگار گیا ہے۔ مگر جتنی فوری ملازمت مل گئی۔ اتنی ہی فوری چھوٹ بھی گئی۔ جیسے ہاتھ سے دھکی کی گھلی گھونٹ جاتی ہے۔

ثریا کی فیکٹری سے کمائے پیسوں کا راشن اس نے ڈیڑھ ماہ تک بچھ کر ریکارڈ قائم کر لیا۔ (مگر ایسے فیکٹریک والے بے خبر رہے)

فیکٹری جانے کا تو سوال نہیں تھا۔ ساس نے

کہیں سے تھیلے۔ سلائی کرنے کا کام لا دیا۔ سیدھی سیدھی سلائیاں۔ مگر اتنی محنت کے بعد اتنا کم معاوضہ۔ ریاض نے سراہا۔ ہاں یہ کام ٹھیک ہے۔

ثریا کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ وہ چوتھا بچہ پیدا کرنے جا رہی تھی۔ ریاض کو خود ہی احساس ہو گیا اس نے بتایا کہ عدالت کے باہر جائے کے کھوکھے کا کام بہت چلتا ہے۔ ثریا نے اگلی بیچ کر کھوکھا دلایا۔ اور چائے بنانے کے لیے گھر کے تیلے برتن فراہم کر دیے۔

اب آگے اللہ جانے کیا ہوا۔ تیسرے روز عدالت تو وہیں کی وہیں تھی مگر کھوکھا تدارد۔۔۔ کے ایم سی والے اٹھالے گئے تھے یا پہلے سے موجود چائے والوں نے رات ورات کھوکھا اٹھا لیا تھا۔

یا پھر۔ ریاض نے خود ہی مال ٹھکانے لگا دیا تھا۔ کیونکہ وہ شغل شغل میں بازی بھی لگاتا تھا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں رہی کہ کبھی بکھار لگائی جانے والی بازی وہ اکثر و بیشتر ہار جاتا تھا۔

اور گھر میں ثریا لڑے نہیں۔ فساد نہ ہو کوئی بھی اس کی قسم کا الزام نہ رکھے۔ انوائی کھٹائی لے کر پڑ گیا۔ دونوں لوگ پُرسدینے آتے رہے۔

بڑے جینھ نے راشن ڈلوادیا۔ چھوٹے نے ریاض کی جیب میں پیسے۔ مگر ان دونوں چیزوں کی سب سے بڑی غامی یہ ہے۔

بہی راشن اور پیسے۔ جتنی بھی احتیاط سے استعمال کرو کم بخت ختم ہو جاتے ہیں۔

ریاض سگریٹ بھی پیتا تھا۔ نشہ پورا نہ ہوا تو جسم ٹوٹنے لگا۔ ثریا کے پاس ٹھیلوں کی سلائی آئی تو ڈبیا منگوا کر دینا پڑی۔ پہلا شش بھرتے ہی ریاض کے جنٹیل کی پرواز شاہین کو مات دینے لگی۔ وہ ثریا کو خواب دکھانے لگا۔

اس بار وہ پلمبری کے لیے جائے گا۔ اس کے کسی دوست نے بلڈنگ میں ٹھیکہ لیا ہے۔ جاگتی آنکھوں کے خواب پلاسٹک کی جھیلی کی طرح ہوتے ہیں۔ اڑتے ہیں اور اڑتے اڑتے کسی جھبے سے



نکرا کر ٹھس ہو جاتے ہیں۔ مگر جب تک اڑ رہے ہوں تو بڑا مزہ دیتے ہیں۔ ثریا کو بھی مزہ آنے لگا۔

☆☆☆

زندگی کا سب سے مایوس کن لمحہ وہ ہوتا ہے جب انسان امید چھوڑ دیتا ہے۔

ثریاء نے بھی چھوڑ دی۔ ریاض کے سدھر جانے کی امید۔ اس خیال کو خیال بد کی طرح جھٹک دیا۔

دادی نے ثریا کے لیے ملازمت کا فیصلہ اس کے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا تھا۔ اس سے

سب زیادہ فلاح اگر کسی نے پائی تو وہ دادی کا بچہ ریاض تھا۔

تھیلوں کی سلامتی سے ہونے والی آمدنی اونٹ کے منہ میں زیرے کے مصداق تھی۔ سو ریاض کی

فیاضانہ اجازت کے بعد ثریا نے اسکول میں ملازمت شروع کر دی جو ایک شفٹ سے شروع ہو کر دوسری شفٹ کے اختتام پر جا کر کی۔

اور ساتھ ریاض کی ملازمت ڈھونڈنے یا کرنے کی جھوٹی سچی کوشش یا خواہش کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے کندھے سے گھر چلانے کا بوجھ اتر گیا۔

ثریاء کا یہی ہے ناں۔ دو شفٹوں کی تنخواہ کیا کم ہوتی۔ سلیقے سے خرچ کیا کرے۔ وہ بستر پر سو یا ہوتا

جب ثریا منہ اندھرے گھر سے نکلتی۔ اسے اسکول لگنے سے آدھا گھنٹہ پہلے پہنچنا ہوتا تھا۔

اور پھر دن بھر اسکول کی منزلوں کے چکر۔ ثریا مگن نہ پانی کر وہ کتنی بار اوپر چڑھتی اترتی تھی۔

اس کی تنخواہ اچھی تھی۔

دو اسکول نیچر زاپے شیر خوار بچوں کو سنبھالنے کے الگ سے پیسے بھی دیتیں۔ راشن کے ڈبے

بھرنے لگے۔ ثریا کا وزن گھٹنے لگا۔ اس کا خیال تھا۔ معاشی آسودگی اس کے دلی قرار و سکون کا باعث

ہوگی۔ جب بچے پیٹ بھر کے سویں گے اور پیٹ بھر کے ناشدہ کریں گے۔ تو زندگی کے سارے دکھوں کو وہ

فراموش کر دے گی۔

مگر پیٹ بھرنے کی فکر سے ذرا تسلی ہوئی۔ تو اپنی زندگی پر غور کرنے کا موقع مل گیا۔ دن بھر کا تھکا

بدن وہ بستر پر ایسے ڈالتی تھی۔

جیسے گندم کے دانوں کی بھری پوری کا منہ کھل جائے تو دانے اٹھان سے ڈھلوان کی طرف پھیل

سے جاتے ہیں۔

کیا ملازمتی سے۔ کیا ملازمتیہ رچا کر۔ ایسے میں اسے عزیز جان بچوں کی شکلیں بھول جاتیں وہ خود

ترسی کا شکار ہو کر غنڈے سانس بھرتی۔

چچ تو یہ تھا کہ اس کے برسر روزگار ہونے نے ریاض کے دل در در کر دیے تھے۔ اس کی رہی سہی۔

پردہ بھی جانی رہی۔ وہ ثریا کے کماے تر والوں کو اس حق سے کھاتا جیسے نان نفقے کی ذمہ داری نکاح تا سے

پر ثریا کے فرائض کے خانے میں درج کی گئی ہو۔

اس پر ڈھٹائی کا عالم ثریا کے ہاتھ کے ذائقے کی تعریف کرتا پھر یہاں تک آ گیا۔ کہ بہت دن

ہو گئے تھیرے ہاتھ کی نہاری کھائے ہوئے۔ یا شامی کباب کھائے، یا باریانی، یا۔۔۔

”کاش قسمت بھی انسان کے لیے اتنے سارے آپشن رکھ دیتی“

شروع میں ثریا فوری فرمائش پوری کر دیتی تھی۔ لیکن آخر تک۔ ایک دن وہ چیخ پڑی۔

”اب سے بات کر۔ شوہر ہوں تیرا۔“

”کوئی نہیں ہے تو میرا شوہر۔“ وہ حلق کے بل چلائی۔ ساتھ ہی اس نے اسے سینے پر ہاتھ کے دباؤ

سے پیچھے دھکیلا اور خود مسلسل آگے بڑھتی اسے برآمدے سے آگن میں لے آئی۔

”میں ہوں۔“ اس نے انکشت شہادت اپنے سینے میں ٹھونکی۔ ”میں ہوں اس کا گھر کا شوہر۔ اور بیوی تو ہے ریاض۔ وہ بھی مذہباً حرام تک حرام بیوی۔ مجھ سے ادب سے بات کیا کر۔ بلکہ نظریں جھکا کر۔ کر نظریں نہیں تو۔“ اس نے ریاض کے پیٹ میں گھونسا

دے مارا۔ ریاض نے نظر تو کیا نیچے کرنا تھی۔ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ پر ثریا نے اس پر بس نہ کیا

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیلتی دروازے سے باہر چھوڑ آئی۔

”دوبارہ ادھر کارخ کیا تو نا نگلیں توڑ دوں گی۔“

گلی میں تماشا کھڑا ہو گیا۔ ریاض پھرے ساڈ کی طرح ثریا پر بل پڑنے والا تھا۔ مگر ثریا آج آپے

میں نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ ریاض اس کے نزدیک پہنچ پاتا۔ ثریا نے لکڑی۔ پائپ کا ٹکڑا، چھاڑو پیر کی

جوتی۔ جو جو چیز ہاتھ کی اس پر دے باری۔

وہ اپنی ذات میں ایسا تیل جیسی تھی۔ اس نے ننگر مار مار کے ریاض جیسے ہاتھ کی جان لے لینے کی قسم

کھائی تھی۔

اسے کسی کے بھی دیکھنے دکھانے کی پردہ نہ رہی تھی۔ مرنے کی یا مار دے گی۔ مگر تب ہی اس کی نگاہ

اپنے بچوں پر پڑی جو ایک دوسرے سے چپکے حیران پریشان روتے ہوئے کپکپاتے ہوئے باپ کو دیکھ

رہے تھے۔ جو ماں کی چپکلی ہوئی چیزوں (ہتھیاروں) سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ثریاء بچوں کو دیکھنے کے بعد سکت رہ گئی تھی۔ اسٹیل کا گلاس جو وہ ریاض کی ناک پر مارنے کے

ارادے سے اٹھائے ہوئے تھی۔ وہ ہاتھ سے زمین پر جا گرا، اس کا بازو پہلو میں یوں گر اٹھا۔ جیسے کسی نے

تکوار کے وار سے شانے سے الگ کر دیا ہو۔

ثریاء نے پسپائی اختیار کر لی۔ شاید اسی لیے پہلے قصوں میں جنگ کے محاذ پر بچوں کا جانا ممنوع قرار

دیا گیا ہوگا۔ شاید۔

ادھر ریاض آستین الٹ کر بساط بھر کھنی کو موڑ کر اس زخم کو دیکھنے کی سعی کرتے ہوئے معصومیت لاطمی

سے بتا رہا تھا۔ ”کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے بس یہی کہا تھا بہت دونوں سے پائے نہیں کھائے۔ بہت دل چاہ رہا تھا ثریا اپنے ہاتھوں سے“

سب کے سب ہکا بکا رہ گئے۔ پھر سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”بے غیریت“ ریاض خوش ہونا چاہتا تھا۔ ثریا اسی خطاب کی سختی تھی مگر اگلے جملے نے اسے بتایا

کہ یہ اسے کہا گیا تھا۔

”اس نے اپنے ہاتھوں سے ہی کھلائے ہیں۔“

مگر بکرے کے نہیں اپنے پائے۔ ٹھنڈے مار کے گئی ہے وہ اسے۔ زبان سے لوگ کچھ بھی کہہ رہے

ہوں۔ مگر دل کا کونہ جو چائنی کی میزبان رکھتا تھا۔ ثریا کو صحیح سمجھتا تھا۔ کہ یہ تو ہونا ہی تھا۔

مگر آٹھ جماعت پاس ثریا سر پکڑے بیٹھی تھی۔ اس سب کا اس کے بچوں کی نفسیات پر بہت برا اثر پڑا

تھا۔ اور اسے بچوں سے بے پناہ محبت تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ دنیا کی واحد ماں ہے جسے اپنے بچوں سے

اتنی شدید محبت ہے۔ اور ماؤں کو بھی ہوگی مگر اس کی محبت سے کم۔

بچوں کی وجہی سے تو وہ ریاض کے ساتھ تھی۔ بچوں ہی کی وجہ سے تو اس نے آج تک ریاض کے صحیح

ہو جانے کی امید کو نہیں چھوڑا تھا۔

ثریاء کو لاکھ دوست سمجھا جائے مگر یہ طے ہو گیا کہ ان دونوں کے بیچ رشتے کا احترام ادب لحاظ آج

ختم ہو گیا تھا۔ اور اب باقی کی ساری زندگی انہیں ایسے ہی گزارنی تھی۔

دوسری طرف ریاض نے اسے پکا کاغذ دینے کا اعلان کر دیا۔

یہ جو شیا بہانہ تھا۔ ہوش بلیتے ہی اسے یاد آ گیا۔ ایسے تو وہ در بدر ہو جاتا۔ گھر ثریا کے نام تھا۔

دنیا کی ہمدردیاں ثریا کے ساتھ تھیں۔ اس نے ثریا سے معافی مانگ لی۔ اس کے الفاظ و انداز ایسے دل

موہ لینے والے تھے کہ ثریا نے بھی معافی کے بدلے معافی طلب کی۔

منٹ کے اندر دونوں نے ایک دوسرے کو معاف کر دیا۔ زبانی کلامی۔ صحیح تو یہ تھا نہ ریاض نے

دل سے معافی مانگی تھی۔ نہ ثریا نے معاف کیا تھا نہ معافی مانگی تھی۔ مگر وہی گھر گرجی ڈیتا۔

ثریاء نے خود سے عہد کیا۔ وہ دوبارہ ایسا نہیں کرے گی جس سے تماشا اٹھے۔

ریاض نے بھی دوبارہ بھی شکایت نہ ہو گی کا

دعویٰ وعدہ کیا۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ پہلا قدم بہر حال ریاض کو اٹھانا تھا۔

دوسرا ثریا کو۔ اور ریاض نے یہ زحمت اسے کبھی دی ہی نہیں۔ جو ثریا کے ہمدرد تھے وہ ثریا کے رد عمل کو اس کے صبر کے دامن کو چھوٹ جانا کہتے تھے۔ اور دوسرے ثریا نے اوقات دکھادی۔ چار پیسے کیا کمانے لگی مجازی خدا پر ہاتھ اٹھالیا۔ کوئی ٹوکتا۔ ایسی نہیں تھی ثریا۔ باادب خاموش طبع صبر والی تھی۔

”وی نو۔ پیسے کمانے والی عورت کی آنکھ سے شرم اتر جاتی ہے۔ شوہر کو تو پھر کچھ بھتی نہیں۔ جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں۔“

تیسرے کرنے والے کاش ثریا کے دل میں جھانک سکتے۔

ثریا نے عام عورتوں کی طرح کبھی چار عورتوں کی بیٹھیک سجا کر خود کو مظلوم ظاہر کرنے کو کہاں نہیں گھڑی تھیں۔ اس کی مصروف اور تھکی ہوئی زندگی میں اس عیاشی کی گنجائش بھی ہی نہیں۔

”اس کی زندگی کے تین مقاصد تھے۔ پہلا بچوں کو کھلانا۔ دوسرے بچوں کو کھلانا۔ تیسرا بھی بچوں کو کھلانا۔“

ہاں۔ آگے وہ انہیں پڑھانا اور معاشرے کا کامیاب فرد بنانا چاہتی تھی۔ ہڈ حرام اور دوسرے بہت سارے حرام کے ساتھ ریاض اب زیادہ ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ پہلے پہل وہ اسے پہلا بھلا کر اس سے پیسے لیا کرتا تھا۔ جھوٹ بچ بول کر۔

پھر اس نے اس کے رکھے پیسوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی۔ ثریا نے جو کس دکھائی تب تھلا کر۔ وہ سلائی مشین لے کر فرو چکر ہو گیا۔ پیسے ختم ہوئے تو گھر لوٹ آیا۔ ”میں کبھی نہ کرتا یہ سب۔ مجھ پر قرضہ ہو گیا تھا ثریا۔“

”کیسا قرضہ۔ گھر کے لیے تو تم کبھی کسی سے نمک کی تھیلی بھی ادھا نہیں لائے۔“ وہ چلائی۔

کھانسیوں کر پٹیں ہیں۔ کرتا ریاض بھڑک اٹھا۔ اس سے زیادہ بلند آواز سے چیخا۔

”سو کام ہوتے ہیں مردوں کے باہر۔ لیکن دین چلتے ہیں اب گھر کی عورت کو کیا کیا ہواؤں۔“

”میں گھر میں رہنے والی عورت نہیں ہوں ریاض۔“ ثریا نے صرف چلائی تھی۔ بلکہ اس نے چھری اس کی سمت اچھال دی۔ ماتھے کے ٹانگے اس اپنی داغ کی یادگار تھے۔

سارے محلے میں خبر گرم تھی۔ ثریا اکلوتے کمرے اور باروچی خانے کو تالا لگا کر جانے لگی ہے۔

برآمدے میں بڑا ریاض پانی کو ترس جاتا ہے۔ ثریا بے وقوف تھی۔ برآمدے آنگن اور غسل خانے میں سیکڑوں چیزیں تھیں۔ جو ریاض نے غصے میں آگ بکولا ہو کر ٹھکانے لگا دیں اور پیسے کھرے کر کے چلا بنا۔

اس نے ہانٹی ٹب چوکی، پانی رکھنے کے کین کے ساتھ ساتھ جو چیزیں کپڑاؤں کو دے سکتا تھا دیں اور دو مہینے کے لیے غائب ہو گیا۔

ثریا ایسے محل میں بیٹھی لوگوں کے تیسرے سن رہی تھی۔ جیسے بیس برس سے فوج زدہ خاوند کے مرنے پر بیوہ خوشی غم کی ملی جلی کیفیت میں ہوتی ہے۔

اسے بخوبی اندازہ تھا وہ یہ سب چیزیں خریدنے بازار جاتی تو بڑھ بھر کے پیسے لے جانے پڑتے۔ مگر کپڑاؤں کی تو کپڑاؤں کے مول ہی خریدی تھیں۔ یعنی یہ نقصان ثریا کو معاشی جھکا دینے کے بجائے ذہنی جھکا دینے کی کوشش تھا۔ جس میں وہ یقیناً کامیاب رہا تھا۔ لوٹا تک نہیں تھا۔

ایسے لگتا تھا وہ بھی نہ واپس آنے کے لیے گیا ہے۔

”اچھا۔“ ثریا صدمے سے ابھر گئی وہی ہانٹی لوٹنے کا صدمہ، اس نے ایسے ہاتھ جھاڑے جیسے کٹی ہو۔ خس کم جہاں پاک۔

مگر وہ اس وقت لوٹ آیا جب بچوں نے ابا پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دونوں کندھے تھیلوں کے بوجھ سے جھکے جاتے تھے۔ چھل مٹھائی کھلونے اور

کپڑے ثریا کبھی اسے کبھی سامان کے ڈھیر کو دیکھتی۔ ”تیرے لیے لال جوڑا لایا ہوں۔ قسم سے۔“

شانے کے گرد بازو پھیلا لیا۔

ان کے رشتے سے یہ قربت یہ لمحے یہ التفات کب معدوم ہوئے پتا ہی نہ چلا۔

بچے چپک رہے تھے۔ ثریا فرمائش پوری کرتے لال جوڑا چڑھا کر بھی آگئی۔ ریاض کی ماں بھی آگئی۔ ریاض انہیں اپنے نئے کاروبار کے بارے میں بتانے لگا۔ جو بس آسمان کو چھونے والا تھا۔

کاروبار کو زمین پر واپس لوٹنے میں تین مہینے لگے۔ بات پھر وہیں آگئی۔

ایک بار پھر ثریا کے طعنے تھے۔ وہ اسے کوئی تھی۔ گھر سے باہر دھکیلتی تھی۔ ایسے میں اس کے اندر حیوانی طاقت آ جاتی تھی جیسے۔۔۔ اندر سے کٹدی چڑھا لیتی۔ ریاض خود سے ہی دو چار دن بعد غصے کے اتر جانے کا اندازہ کر کے لوٹ آتا۔ بچے تو پاپ کی آواز سنتے ہی لپک کر دروازہ کھول دیتے۔ اگر ثریا سامنے ہوتی تو وہ نظروں ہی نظروں میں بچوں کو تنبیہ کر دیتی۔ ”دروازہ نہیں کھولنا ایک آدھ بار ریاض نے گلی میں احتجاجا شور مچانا شروع کر دیا۔ حسب معمول لوگوں کے دروازے ٹھنکے لگے۔ مگر خیال ہے ثریا کے کان پر جوں رینگتی ہو۔ وہ اسٹیل کی تار سے پٹیلے مابھتی رہی۔“

ریاض کی ماں نے ریاض کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس نے جھک دیے۔

”ہٹ جا۔ میری ماں تو ہے ہی نہیں۔ تیرے کانڈ (کام) کی وجہ سے اس (گالی) کی ہمت اتنی بڑھی ہے۔ کہ مجھے گھر سے نکالتی ہے۔ تو نے لگا دیا اس کے نام مکان۔ ورنہ ابھی کاغذ پکڑا دیتا۔“

کیا کر لیتی سالی۔ وہ اونچا اونچا بول رہا تھا تاکہ ثریا سن لے۔ اور ثریا نے سن لیا۔ ریاض حاضرین کی رائے انکشی کر رہا تھا۔ ”مجھ کہتا ہوں ناں۔ کیا کر لیتی سالی (گالی)“

ریاض کی گالی ادھوری رہ گئی۔ گھر کا دروازہ کھلنے اور مانتھتے پٹیلے کا سارا سیاہ جھاگ دار پانی ”سالی“ نے ریاض کے اوپر اچھال دیا۔ ریاض کا بدن آف ہو گیا۔ پانی نے آنکھوں میں سرچسپیں بھری تھیں۔ ریاض منٹ کے اندر بھیگی ملی اوہ معاف کیجیے بھگیا بلابن گیا۔ گلی کی عورتوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ بچوں کا جم غفیر البتہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

سنجیدہ مزاج مردوں نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔ جبکہ باقیوں کو مزہ آ گیا۔

ریاض نے کلائی چہرے پر رگڑی اور مغلظات بکنا لگی چھوڑ گیا۔ مجمع چھٹ گیا۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ بچوں نے صبح باپ کو برآمدے میں سو یاد کیا تو حیران رہ گئے۔ ثریا بھی ریاض دیوار پھاند کر آیا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا۔ اسے بخار ہو گیا تھا۔ ثریا سے چائے مانگتا تو صبح طوفان اٹھ جاتا۔ چکراتے سر کے ساتھ خود ہی باروچی خانے میں آ گیا۔ نظروں ہی نظروں میں چائے کی پٹیلی ڈھونڈی۔ پانی ہی بھرا تھا کہ ثریا نے چیل کی طرح لپک کر پٹیلی بچھٹ لی۔

”دودھ پتی مفت میں نہیں آتی۔ کہ حرام خوروں کے لیے چھوڑ دوں نکلومیرے باروچی خانے سے۔“ اس نے نا صرف کہا بلکہ نکال کر دم لیا۔ ریاض میں مزاحمت کی ہمت بھی نہیں تھی۔ دبی زبان میں ناسازی طبع کا پتہ چلا۔

”تو؟ ثریا نے۔۔۔ جھکا دے کر سوال کیا؟ تو؟؟ یعنی وہ کیا کرے اگر طبیعت خراب ہے تو۔۔۔“

ثریا کا نرم سرگوشی جیسا دھیمہ لہجہ نجانے کب پاٹ دار ہو گیا تھا۔ جیسے کرارے پاپڑ بیچنے والے کی آواز بھی کراری ہو جاتی ہے۔

درمیانی گھر میں ثریا کی دیوار کے ساتھ ڈیرہ جھائے بیٹھی دادی کو ساری صورت حال سمجھ میں آ گئی۔ ماں تھیں۔ لپک کر آئیں اور ریاض کو ہمراہ لے گئیں۔ درمیانی بیٹے اور بہو کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ ریاض کو چائے بنا کر دی۔ گولی دی اور اپنی چار پائی پر ڈال

کر رضائی اوڑھادی۔

دادی کو ثریا سے دلی ہمدردی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کا مجرم بھی سمجھتی تھیں۔ ضمیر کی عدالت نے ہمیشہ ثریا کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ پھسلے سے اس نے کچھ بھی ناحق کر دیا ہو۔

مگر اس کے باوجود دادی کی حیرت جاتی نہیں تھی۔

کر ثریا۔ دراصل بکری کی کھال میں چھپی شیرنی ثابت ہوئی تھی۔ ایسی شیرنی جس کے بچے یا دانتوں سے زیادہ خطرناک اس کی نظر ہوتی ہے۔ جس کو دیکھ لیا پتا پانی کر دیا۔

ساس سے ثریا کے تعلقات بحال تھے۔ سب حیرت کا اظہار کرتے جب وہ ساس کے لیے ثریا کا عزت و احترام دیکھتے۔ وہ انہیں آتا دیکھ کر آج بھی مؤدبانہ انداز سے جگہ چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ دو ہاتھوں سے پانی کا گلاس پیش کرتی۔ چائے ناشتہ پوچھتی۔ یہاں دادی کا کردار والفاظ بھی دنیا کی انگلیاں منہ میں دے دیتے۔

دادی نے ثریا کے گھر کے کھانے پینے (پانی نکال کر) کو خود پر حرام قرار دیا تھا۔ ”پنٹا کما کر لاتا تو وہ دھڑلے سے بیٹھ کر کھاتی۔ بہو کی کمائی پر کیسے حق جتاؤں۔ اس پر تو صرف اس کے پانچ بچوں کا حق ہے اور اس بیان و فیصلے سے دادی آج بھر سرکنے کو تیار نہ ہوتی تھیں۔

وہ حرام خور اور ہڈ حرام بیٹے کو پیدا کرنے کی مجرم ضرور ہیں مگر خود حرام خور نہیں۔ بس۔ بات ختم۔

☆☆☆

دادی ناکام ثالث کا کردار ادا کر کے رخصت ہو گئیں۔ تو اما کے لیے ناشتے کی امید ختم ہو گئی۔ وہ راستے میں آتی چیزوں کو کھو کھاتا گھر سے نکل گیا۔

گڑیا کا دل چڑ کر رہ گیا۔ ابا بھوکا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی چائے اور پرائے کی چنگیر کو اٹھا کر بارود پتی خانے میں رکھ دیا۔

ثریا چڑے بچنے پھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر سنگ مرمر سی خنجر تھی۔ بیٹی نے ناشتے کو چھوٹا تک نہیں تھا۔

اس کی سوالیہ کرخت نگاہیں بیٹی کے چہرے سے جا ملیں۔

”ایسے ہی دل نہیں چاہ رہا۔ بھوک نہیں گئی۔“

اس نے لہجے کو مقدور بھر سرسری کر لیا۔ ثریا نے اس کا بازو دبوچ لیا۔ ”سب جانتی ہوں دل کو کیا ہوا ہے۔

مفت کی نہیں آتی چینی پتی، جودل نہ چاہنے پر چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ صبح سے شام تک محنت کرتی ہوں تو آنے کا کنستہ بھرتا ہے۔ میرے جیسی ماں کے بچوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔ تم کون سے دل کی کہانی لے کر کھڑی ہو گئیں۔ میرے جیسی ماں کے بچوں کے پاس صرف پیٹ ہوتا ہے۔ جسے بھرنے کے لیے وہ اپنی ہڈیاں گھساتی ہے۔ پھر بھی نہیں بھر سکتی۔“

”میں تھوڑی دیر بعد۔“ اس کی کھسکی بندھ گئی۔

”اچھی طرح جانتی ہوں۔ تھوڑی دیر کو میں۔“ ثریا نے ایسے جھٹکے سے بازو چھوڑا کہ وہ دیوار سے جا لگی۔ ”اپنے اس حرام خور باپ کے لیے سنبھال کر رکھا ہے ناں۔۔۔ پر آج میں بھی ادھر ہی بیٹھی ہوں۔ رکھے تو قدم ڈراوہ۔۔۔“

ثریا کی زبان گالیاں اگلنے لگی۔ وہ ہر چیز کو کوس رہی تھی۔ ریاض کو۔ اپنے ماں باپ کو۔ دادی تک کو۔ پانچوں بچوں کو اور اپنے نصیب کو۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ ثریا نے تو زمانوں پہلے رونا چھوڑ دیا تھا۔

اور اس وقت بھی وہ باقاعدہ نہیں رو رہی تھی۔ بولتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا نار بندھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ بچکی بندھ گئی۔

گڑیا ساکت رہ گئی۔

وہ باپ کی وجہ سے ماں کے لیے دل میں عناد رکھتی تھی۔

وہ اتنے لوگوں کو جانتی تھی۔ محلے بڑی سہیلوں کے گھر۔ دونوں بچا تاتا کے گھر۔ نہیں ایسی مٹی پلید نہیں ہوتی تھی جیسی اس کے باپ کی اس کی ماں کرتی تھی۔

”امی۔“ وہ پھسکا مار کے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی ماں کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس نے اس کے منہ کو چھوا۔ یہ کسی میٹھا کے دست شفقت جیسا ٹھہراؤ بھرا لمس تھا۔ ثریا نے چونک کر بھری نظریں اٹھا کر دیکھا وہ جانتی تھی گڑیا دل سے باپ کی طرف دار ہے۔

مگر ایسا ڈھارس دلاتا کس۔ نہ تو ثریا کی یاں کا تھانہ دادی کا۔ دنیا میں کسی نے ایسی تسلی نہیں دی تھی۔ جیسی اس چھوٹے سے ہاتھ نے دی۔ ثریا کی حیران نظریں تک گئیں۔ لوگ بیٹی کو درد شناس کہتے ہیں۔ تو کیا اس کی بیٹی نے آج اس کے درد کو ماپ لیا تھا۔

ثریا کے دل میں عجیب سی خواہش ابھری کہ اس کی بیٹی اسے خود سے لپٹائے۔ تو وہ اونچی اونچی آواز سے رونے کی برسوں پرانی خواہش پوری کر لے۔ اتنا روئے۔ اتنا روئے کہ شہر میں سیلاب آجائے۔

اور پلک جھپکنے کی دیر ہی تھی۔ اس نے سوچا وہ خود بیٹی سے لپٹ جاتی ہے۔ پہلے دوچ کا کیا مطلب۔ مگر اس سے پہلے بیٹی کے جملے نے اس پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔

”تو ابا معافی مانگ تو رہا تھا ناں۔ کر دیتیں معاف۔“

”معافی۔“ ثریا نے زیر لب دہرایا۔ ”معافی کب۔“

”رات کو جب ابا دیوار پھاند کر آیا تھا۔ پاؤں پکڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔ آپ نے پیروں سے ہی دھکا دے کر زمین پر گر دیا۔“

ثریا کے آنسو ہی نہیں جسم کا سارا پانی خشک ہو گیا۔ بیٹی کی سوالیہ خاجیران نگاہیں بدستور تھیں۔ ثریا نے ایسا سانس لیا جیسے سن بھری پوری شانوں سے اتاری ہو۔

”وہ معافی نہیں مانگ رہا تھا گڑیا۔“ اس کی آواز کی شکستگی صدیوں کے ستر کا قصہ کہتی تھی۔

”نہیں مانگ رہا تھا میں نے خود دیکھا۔“ وہ دروازے پر کھڑی۔

کرب کی شدت سے ثریا نے منہ پھیر لیا ”معافی نہیں مانگ رہا تھا۔ وہ تو۔“ اس نے زہر لب کیا۔

ثریا نے بیٹی کی آنکھوں میں اپنے لیے انکار دیکھا، بے اعتنائی، بے یقینی اور غصہ۔

ثریا چکر کر رہ گئی۔ وہ تیرہ برس کی بیٹی کو کس طرح وضاحت دے سکتی تھی۔ کہ اس کا باپ معافی نہیں مانگ رہا تھا۔ وہ یہ وضاحت بھی نہیں دے سکتی تھی۔

ہاں ایک وقت آتا جب اسے خود معافی کا مطلب سمجھ میں آ جاتا لیکن ابھی کے لیے وہ کیا کرے۔

آج سے کئی سال پہلے۔ جہاں آج گڑیا کھڑی تھی۔ وہاں بھی وہ کھڑی تھی اور جہاں وہ بیٹھی تھی۔ وہاں ثریا کی اپنی کی ماں۔

معاملہ برعکس تھا۔ مگر غصہ، ہٹ دھرمی، بے یقینی سب ایسا ہی تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ سالوں پہلے اس نے بھی اپنی ماں کے آگے سوال رکھ دیا تھا۔ اعتراض، جڑ دیا تھا۔ سالوں پہلے۔

آج اس کی بیٹی اس سے تنفر تھی۔ کل وہ اپنی ماں سے تنفر تھی۔

دونوں کے درمیان وہ تنازعہ ایک ہی تھا۔ ابا، ایک وہ جو گڑیا کا ابا تھا اور دوسرا ثریا کا ابا۔

آج گڑیا بیٹی تھی اور کل جب ثریا خود گڑیا تھی۔ تو یہ دو بیٹیوں کی کہانی ہو گئی۔ نہیں۔ یہ دو ماؤں کی کہانی بھی تھی۔ اور دو باپ بھی۔

جو ایک دوسرے کا الٹ دکھائی دینے کے باوجود اندر سے ایک دوسرے کے جیسے تھے۔

آج گڑیا کو ماں کا رویہ، باپ کے لیے پسند نہیں تھا۔ کل ثریا کو بھی ماں کا رویہ اپنے باپ کے شایان شان نہیں لگتا تھا۔

وہ زیادہ کا حق تھا جبکہ اس کی ماں۔ وہ گالیاں ایسے سنتی تھی۔ جیسے وہ اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہا ہو۔ وہ جس جوتے کو اس کے

منہ پر اٹھا مارتا تھا۔ زمین پر گر کر اس کی ماں ہی کو وہ جوتا اٹھا کر واپس پیش کرنا پڑتا تھا۔ کہ اگر وہ ایک مارنا چاہے تو دل نہ بھرا ہوا ہوتا۔

بیوی بچوں پر گالم گلوچ کے بعد شراب نوشی۔ اور جسم ”نوٹی“ بلکہ بہت ساری نوشیاں۔ اس کی جانے والیاں تھیں۔

جب گرم ہوتی تو پہلو گرم کرنے کو کسی کے بھی در پر جا کر پڑ جاتا۔ جب خالی ہوتی تو بیوی کی صورت پر اکتفا کرنا پڑتا۔ یہ کڑوا کھوٹ پینے کے بعد وہ بیوی کو دھن کر رکھ دیتا۔ ”تو ہے ہی منحوس عورت، مال میں برکت نہیں رہنے دی۔ روتی صورت۔“

کما تا وہ خوب تھا۔ اڑاتا بھی خوب۔ کوئی اسے بتاتا کہ جس مال کی رونمائی کو خوش چوہاروں کی دہلیز پر کی جائے اس میں برکت کیسے ہو سکتی ہے۔ بچے بچے پیسے بیوی کے منہ پر مار دیتا۔ کہ وہ گھر کا خرچ چلائے اور اس پر اسے روٹی سوٹی کی عادت بھی نہیں تھی۔ ماں تپتے شورے میں روٹیاں بھگو کر بچوں کو کھلائی اور بھنے مسالے کے گوشت کو نگلنے کے بعد کچارہ جانے کی شکایت پر بیوی کی چوٹی کس دیتا۔

اسے رتیا کی ماں سے بڑی شکایتیں تھیں۔ ایک تو وہ کم صورت اور پر سے روٹی۔ سوئے پر سہا کہ اپنے جیسے منحوسوں کی لائن لگا کر کھڑی تھی۔ اسے بچے زہر لگتے۔ جب وہ کھانا کھاتا تھا۔ ندیدوں کی طرح دیکھتے تھے۔

”ماں نے تیر نہیں سکھائی۔“

باپ کے بہن، بھائی بھی اس کی بے سکون زندگی کی وجہ ماں اور ماں کے پیدا کیے بچوں کو گردانتے تھے۔ سسرال میں بھی وہ جونی کی نوک پر دھری تھی۔

رتیا نے سنا، ماں کا پیچھا کمزور تھا۔ اسی لیے باپ اتنا شیر ہو گیا تھا۔ رتیا سوچنے لگی۔ اگر ماں خود کو مضبوط کرے۔ وہ مارتے کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ لیتی۔ آخر وہ کیوں جیتی ہے۔

تھپڑ کے نشانوں والے گالوں کو دوپٹے سے ڈھکے وہ باپ کے کپڑے استری کرتی۔ جونی کو پالش کرتی، بلکہ پیروں کے باس بھی لاکر دیتی۔

اور بدلے میں ایک ٹھوک بھی پڑ سکتی ہے، یہ اس کے مزاج پر منحصر تھا۔ اچھا یا خراب.....

رتیا کو جو بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کم گو تھی۔ مگر جب بھی بولتی.....

”آپ نے پہلے دن ہاتھ روکا ہوتا تو.....“

”آپ معاف کرنی کیوں ہیں۔ رات کو پٹنی ہیں اور صبح اٹھ کر خدمت پر جت جاتی ہیں۔“

ماں کا سر جھک جاتا۔ وہ بیٹی سے کیسے کہتی کہ وہ اپنی غلط فہمی دور کرے۔ باپ نے معافی مانگی کب..... باپ کو مانگنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جھین لینا جانتا تھا۔

”اگر اس کے ساتھ ایسا کبھی ہوا تو وہ تو ہاتھ توڑ کر دوسرے ہاتھ میں دے دے۔“ ماں نے رتیا کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”اللہ نہ کرے۔“ اس کا چہرہ وحشت زدہ اور آنکھیں اٹل پڑی تھیں۔ ”جو رتیا کا نصیب ماں جیسا نکلتے۔“

رتیا شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن شادی ہی واحد جائے فرار تھی۔ وہ اس گھر سے نکل کر ہی باپ سے چھٹکارا حاصل کر سکتی تھی۔ سو اس نے شادی کر لی۔ ریاض اس کے باپ سے بالکل الٹ تھا۔ تو یہ اتنا محبت بھرا رشتہ ہے۔ لاڈ پیار، ناز و داد، روشنا مٹاتا..... جب وہ جھوٹ میوٹ روٹھ جاتی۔ اور جب ریاض اسے سچ سچ مناتا، کبھی سلجھنے کے بجائے اسے سوڑا کر بری طرح اچھڑاتی۔

مگر شادی کے نو سال بعد رتیا کو پتا لگا۔ ضروری نہیں مارتا دھاڑتا، گالم گلوچ کرتا، مرد ہی برا ہو۔ ناقابل برداشت ہو۔ بالوں میں گہرے لگا کر دونوں ہاتھوں سے معافیاں مانگنے والا مرد بھی بہت برا ہو سکتا ہے۔

رتیا کو یہ بھی پتا لگا کہ عورت معاف کر دینے پر

اپنی مجبور کیسے ہو جاتی ہے۔ وہ ریاض کو معاف کر دیتی تھی۔ کیا کرے بے چارہ نوکری ڈھونڈتا تو ہے۔ اپنی مشکل سے ملتی ہے۔ ریاض کہتا کسی نے بندش کر وادی ہے۔ لگی لگائی چھوٹ جاتی ہے۔ تو دلچسپی اور پریشان ہوتا تھا وہ.....

رتیا چاروں قل پڑھ کر پھونکتی۔ کھانے سے جی اچاٹ کر کے بیٹھے ریاض کے منہ میں نوالے بھی ڈالے اس نے..... اسے ساتھ کا یقین دلایا۔ مستقبل کے اچھے خوابوں کی اڑائی پتنگ کی ڈور کو ڈھیل دینے ریاض کے پیچھے کھڑی رہتی اور ہر بار معاف کر دیتی۔

”مرد کی حیلہ بازی سے عورت نہیں جیت سکتی۔“ کچھ تیرے باپ سے ہوتے ہیں۔ ڈکے کی چوٹ پر عورت کو ذلیل کرنے والے..... اور کچھ ریاض سے ہوتے ہیں رتیا..... چوہے، جڑیں کاٹنے والے وہ تجھے اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے اور دکھ اس چیز کا ہے۔ تجھے پتا نہیں چلتا۔ عورت کا مسئلہ یہ ہی ہے، اسے پتا نہیں چلتا۔ اب تو یہ سوال نہیں کرے گی تاکہ ماں تو باپ سے پتی کیوں ہے۔ یا یہ کہ ہاتھ پکڑ کر توڑ کیوں نہیں دیتی۔ ہاتھ توڑنا اتنا آسان ہوتا تو..... اب تک تو ریاض کے شیاخی کارڈ پر پڑنے ہاتھ کی علامت لگ جانی چاہیے تھی۔ اس کا نام بھی بدل جانا چاہیے تھا۔ ریاض شذا.....؟“

ماں نے طعنے نہیں مارے تھے، جتایا بھی نہیں تھا اور اکسایا بھی نہیں تھا۔ مگر رتیا کو وہ رتیا یاد آتی۔ جس کے ہوجانے کا وہ دعا کیا کرتی تھی کہ اگر کبھی ایسی صورت حال آئی تو وہ کیا کرے گی؟

تو پھر رتیا وہ رتیا بن گئی۔ جس سے اس کی گرتیا متھر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

رتیا من من کے قدم اٹھائے گرتیا کے نزدیک آ بیٹھی۔ گرتیا کی آنکھوں میں حیرت کے بعد شہوہ اور آغیر میں الجھنی تاثر آ کر ٹھہر گیا۔ وہ ماں کو نظر انداز کر کے بستر پیٹنے لگی۔

رتیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گرتیا نے ایک پل کی

حیرت کے بعد اپنا ہاتھ جھڑپا چاہا۔ مگر رتیا نے اسے اپنے سامنے بیٹھے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھی اپنی ماں سے ایسے ہی خفا رہا کرتی تھی۔ وہ کیوں معاف کر دیتی ہے اس کے باپ کو..... آج اس کی بیٹی کہہ رہی تھی۔ وہ کیوں معاف نہیں کرتی اس کے باپ کو..... دونوں سوال ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے۔ مگر کہانی کا پس منظر اور کردار ایک سے تھے۔ بے حس مرد..... اور بے بس عورت.....

”تمہیں برا لگتا ہے..... جو میں کرتی ہوں تمہارے باپ کے ساتھ؟“ وہ کہنا تو نہ جانے کیا چاہتی تھی، منہ سے یہ ہی نکلا۔ گرتیا نے چونک کر ماں کو دیکھا اور نظر جھکا لی۔

”تمہیں میں غلط لگتی ہوں نا؟“

اس بار گرتیا نے نظر اٹھائی تھی اور سر کو اشارت میں ہلایا تھا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں لمبے لمبے ہو گئی تھیں۔ رتیا نے تھوک لگا اور بیٹی کو سینے سے پیچ لیا۔ وہ اس کے بالوں کے بے آواز بوسے لے رہی تھی۔

”میں آج کے بعد اپنے لیے دعائیں کروں گی گرتیا۔ صرف تیرے لیے..... اللہ کرے تجھے زندگی میں بھی ایسے سوانحے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تیرا نصیب، تیری ماں اور نانی سے بالکل الگ ہو گرتیا..... بالکل الگ۔“

رتیا کی دعا خود کلامی میں ڈھل گئی اور اس کی ہانہوں کے شکنجے میں کسی گرتیا کسمانے لگی۔

ایسے ماں سے ان دعاؤں کی نہیں، اس تلی کی ضرورت تھی کہ وہ ابا کو معاف کر دے گی اور دوبارہ کبھی ابا کو بے عزت نہیں کرے گی۔

اس سوال کی فطرت بھی ہنور تھی کہ رات جب ابا معافی مانگ رہا تھا تو ماں نے معاف کیوں نہ کی۔

بلکہ انا ماں صاف مگر گئی کہ وہ کوئی معافی نہیں تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کتنے پیار سے ابا گنگنا رہا تھا اور ماں نے.....

☆☆☆

تیرہ برس کی گڑیا آج تینیس برس کی بھرپور جوان عورت تھی۔ بیٹے کو کو لے پر نکالے بیٹی کی انگلی پکڑے گزرنے والی ہر آنکھ کو اپنی سمت متوجہ کرتی وہ بہت دیکھ بھال کر سڑک پار کر کے پارکنگ میں کھڑی اپنی کار کا لاک کھول رہی تھی۔ ہلکی نیلی جینز پر سیاہ کرتا دوپٹا اوڑھے..... آنکھوں پر لگے گاگلز نے تاثرات اور مرکز نگاہ کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود لا شعوری طور پر اس کے کان اپنے شوہر کی آواز سننے کے منتظر تھے۔ آواز تو نہ آئی، وہ سامنے سے آتا دکھائی دے گیا۔ چابی کو اچھالتا، خود کو لاپرواہا کر کے لیے ہونٹ سیڑھے وہ سیٹی پر کوئی دھن چھیڑے ہوئے تھا۔

وہ ایسا نہ بھی کرتا تو وہ جانتی تھی، اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ جب ہی تو آج ایسا دن طلوع ہوا۔ جس میں وہ دونوں الگ الگ گاڑی کے سوار ہو کر اپنی نئی منزل کی طرف چلے تھے۔

لیکن نہیں مرد کے لیے نئی منزلیں ہو سکتی ہیں۔ عورت کے لیے وقت ٹھہر جاتا، دو بچوں کے ساتھ اس کی زندگی نے پڑاؤ ڈال دیا تھا۔

وہ دوست کی بات سنتے سنتے غم زدہ سا دکھائی دینے لگا۔ وہ دونوں اسے اور اس کے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔ دوست اپنے تئیں اسے صبر کرنے باہمت رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ فاصلہ بہت زیادہ تھا، اس کے باوجود وہ جانتی تھی۔

اسے کوئی ایسا غم نہیں پڑا کہ جس کے لیے کندھا دیا جائے۔

اس کی تو مانو جان چھوٹی..... بیوی سے..... اور اس کے پیدا کیے بچوں سے، ثریا کی بیٹی کے حق میں کی گئی دعا میں قبول نہیں ہوتی تھیں۔

گڑیا کا شوہر گڑیا کے نانا اور باپ دونوں کی خصوصیات رکھتا تھا۔ بلکہ دیکھا جائے اس کی شخصیت زیادہ متشوش تھی۔ گڑیا مردوں کی دقتوں سے واقف تھی اور اسی سے پناہ مانگتی تھی۔ خدا دکن کو بھی

بجائے۔ بے وقوف دشمن کی فکر پالنے کے بجائے اپنی پاتی تو شاید بچاؤ ہو جاتا۔

ثریا جیسی ماسی کے بچوں کے لیے اس کے ہائی فائی اسکول میں جگہ نہیں تھی۔ مگر ثریا کی محنت شرافت اور محنت سماج سے پرہیز نے گڑیا سمیت اس کے دو بیٹوں کو کلاس کی آخری نشستوں پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

اور ایک سال بعد رزلٹ کے روز اسی پر پہل نے گڑیا کو تمام کیسپس میں پوزیشن لینے کا میڈل پہنایا تھا۔ گڑیا کے دو بھائیوں نے بھی پرہیز سمیت سب کو حیران کر دیا۔ غریب جھانکس ماں کے خیرات پر پڑھنے والے بچوں کو اعزاز سے نوازا جا رہا تھا۔

میسٹرک میں گڑیا نے پوزیشن لینے کے حکومت کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اس کا آگے کا تعلیمی خرچا اٹھانے کا اعلان کر دیا جائے۔

دس پانچ پیسے کے جیب خرچ کو جمع کرنے والی گڑیا، بٹنگر بن گئی۔ زمانہ کلاٹ بن کر آیا تھا۔ وہ بلا کا پرکشش تھا۔ اوپر سے جامد زہبی پر چرب زبانی کا تزکرہ.....

گڑیا نے شادی کا فیصلہ فوراً نہیں کیا۔ اس نے اپنے حساب سے خوب جانچا، پرکھا، پھر اس کے بعد.....

اور دراصل بعد ہی تو مسائل کی جڑ ہوتا ہے۔ بعد ہی کا تو پتا نہیں ہوتا۔ بعد کا پتا ہو تو زندگی میں کچھ غلط ہو ہی نا..... زمانہ سونے کی طرح چمکتا تھا۔ یہ طبع اترنے میں کچھ وقت لگا۔ مگر تب تک گڑیا کے قدموں کی زنجیر اس کی اپنی گڑیا بن چکی تھی۔

زمانہ کی اناؤزرا ذرا سی بات سے ہرٹ ہو جاتی تھی۔ اس لیے ملازمت کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ تو وہ اس مشکل سے جان چھڑانے میں دیر نہ کرتا۔ گڑیا، ماں جیسی بے وقوف نہیں تھی۔ اسے خوب تجربہ تھا مردوں کے بہانوں کا..... شروع میں زمانہ بھی اس کی آمدنی سے یوں لالچ رہتا تھا۔ جیسے مٹی کا محرم عورت سے..... لیکن گڑیا کیا کرتی،

جب مہینہ پورا ہونے پر فلیٹ کا کرایہ اور دیگر تمام بزنس کے ساتھ بچن کے تمام خالی ڈبے سر پر آ پڑے۔

اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس مصیبت سے نکل سکتی تھی۔ مہیاں، بیوی سا مچی ہیں۔ مشکل میں وہ کام نہیں آئے گی تو اور کون..... زمانہ اس کا احسان مند تھا۔ وہ جلد ملازمت تلاش کرے گا۔ گڑیا کا دل ڈوب کر ابھرا، ابا بھی ایسے ہی کرتا تھا۔

لیکن خیر..... زمانہ کو ملازمت مل گئی۔ اگلے مہینے سب چیزیں زمانہ نے بحسن و خوبی پوری کر دیں۔ (تو زمانہ ابا سا نہیں تھا۔) لیکن اگلے ماہ اس کے پاس اے ٹی ایم کے اندر ڈاکوؤں کے آجانے کا دل خراش واقعہ تھا۔ گھر کا خرچ گڑیا کو چلانا بڑا، بلکہ زمانہ کا غم غلط کرنے کے لیے اس نے اسے اچھی خاصی رقم بھی دی۔

زمانہ چرب زبان تھا۔ اس کے دوستوں کی وسیع تعداد تھی۔ جن پر وہ خرچ کرتا تھا۔ دوستوں میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی کثیر تعداد میں تھیں اور کچھ بہت خاص بھی.....

گڑیا کو نانا یاد آئے۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ پہلے عورتوں سے دوستی کو بے راہ روی کہا جاتا تھا۔ نئے زمانے میں یہ ماڈرن ازم تھا۔ ورکنگ ریلیشن شپ..... تو کام تو پھر وہ بھی کرتی تھی۔

زمانہ اپنی ذات پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اس نے گڑیا سے کہا کہ وہ تو خود کماتی ہے۔ اسے بھلا اس کے پیسوں کی کیا ضرورت.....

”لیکن میرے نان نفقہ کی ذمہ داری تمہاری ہے۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”نان نفقہ..... نان تو آئی تمہیں دس روپے کا ملتا ہے اور یہ نفقہ کیا ہے؟“ انگلش میڈیم کا پڑھا زمانہ اچھ کر دیکھ رہا تھا۔

”اُس میں کہ میری ہر ضرورت کو پورا کرنا تمہارا فرض ہے۔“ وہ چاچا کر بولی۔

”اوہ..... تو میں نے کب انکار کیا۔ مگر ڈیر تم.....“

دیکھو میں ہاتھ صاف رکھتا ہوں۔ ہا ہا.....“

”شادی کرنے کے بعد بھی اگر مجھے خود کما کر خود پر خرچ کرنا تھا، تو مجھے شادی کا ٹھنڈا پالنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ وہ حلق کے بل چلاتی تھی۔ بال سنواریا زمانہ ساکت ہو گیا۔ وہ آئینے سے اس کا لالہ بھسوکا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یک دم گھوما اس نے گڑیا کی ٹھوڑی دبوچ لی۔

”آواز نیچے.....“

”چھوڑو نیچے.....“ وہ مچھلی کی طرح تڑپی۔

”مجھے چھوڑو زمانہ۔“ وہ اسے پیچھے دھکیل دینا چاہتی تھی۔ مگر زمانہ نے اسے بیڈ پر دھکا دے دیا۔ وہ تیزی سے اٹھنا چاہتی تھی۔ مگر زمانہ ایک ٹانگ بیڈ کے اوپر رکھ کر اس پر جھک آیا۔ جو کہنیوں کے بل سر اٹھائے ہوئے تھے۔

”میں نے کہا نا آواز نیچے۔“

”نہیں ہوگی آواز نیچے۔“ وہ کرنٹ کھائے انداز سے اچھلی اور نکل جانا چاہا، مگر زمانہ نے اس کا ہاتھ پیچھے سے جکڑ لیا۔

☆☆☆

اگلے روز.....

”مجھے معاف کر دو.....“ وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور وہ ایک گھٹنا موڑے اس کے سامنے زمین پر ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔ وہ اتنا شرم سار تھا کہ گڑیا کو اپنی نظریں جھکا کر دیکھ رہی تھی۔

”پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“

”میں آؤں کیسے جاؤں گی زمانہ..... میرے گال پر نیل ہے۔“

”اف یہ عورت..... نیل کے پیچھے دھکن بھی تو ہوتی ہے۔“ (آؤ عورت کو اتنی قوت برداشت کیوں دی گئی۔)

”اوہ میری جان!“ زمانہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”آئی ایم سوری۔“ اس نے اس کی پیشانی کا بوسا لیا۔ ”میں تمہاری لیو دے آتا



ہوں۔ کہہ دوں گا۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔  
بے بی کو بخار ہے۔ اس لیے تم غیر حاضر ہو۔  
ہاں۔۔۔۔۔ وہ اس کی رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا  
چاہتا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز سے ہاں  
میں ہاں ملانے لگی۔  
اسے اس وقت بالکل یاد نہ آیا کہ نانی۔۔۔۔۔ نانا کو  
معاف کر دیا کرتی تھیں۔

☆☆☆

اگلی بار اس کے اے بی ایم سے رقم اڑائی گئی۔  
ایسے یہ جاننے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ کس کی کارستانی  
تھی۔

زمان پہلے مانا نہیں۔۔۔۔۔ پھر اس نے اپنی بے  
پناہ مجبوری بتائی۔  
”تم مانگ لیتے۔“ وہ اصول کی بات کرتی  
تھی۔

”ہنہ۔۔۔۔۔“ وہ پیرٹ کر کھڑا ہوا۔ ”مانگ لیتے  
جیسے تم دے دیتیں۔“

”تو تم نے سوچا چوری کر لوں۔“  
”ڈنٹ کالی کی چور۔“ وہ چلا یا۔  
”چور کو چور نہیں کہوں تو کیا سعد کہوں۔۔۔۔۔“  
آواز اسے بھی بلند کرنا آتی تھی۔  
”سعد۔۔۔۔۔ وہ جو تمہارا آفس کو لیک ہے۔“ وہ  
غزایا۔

”میں نے محاورہ بولا ہے۔“ وہ پھٹک کر بولی۔  
”اوہ ہو۔۔۔۔۔ محاورہ بھی سعد والا کیا۔“  
”تم اپنی لمٹس کر اس کر رہے ہو زمان۔۔۔۔۔“

اس کی رگوں میں شریا کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس نے بنا  
سوچے سمجھے ایک زور کا ہاتھ اس کے شانے پر مارا۔ وہ  
اسے دھکیل دینا چاہتی تھی۔ مگر وہ تو ازان برقرار نہ رکھ  
سکا۔ دیوار سے لگا اور اگلے بل وہ اسے جانوروں کی  
طرح پیٹ رہا تھا۔

”شوہر پر ہاتھ اٹھاتی ہے سالی۔“  
گڑیا کو یاد آیا۔۔۔۔۔ ابا پٹنا خاموشی سے تھا۔

”اف مزد۔۔۔۔۔ اور مزدوں کی قسمیں۔۔۔۔۔ اور  
قسمیں۔۔۔۔۔ اسے دھتک کر رکھ دینے کے بعد وہ گھر  
سے چلا گیا۔

نیچے پارکنگ میں دو ٹین اینج لڑکیاں کھڑی  
تھیں۔ بیوی کو مارنے کو نئے کے عمل میں اس کے  
جیل سے جے ہال بکھر کر ماتھے پر پڑے تھے۔  
لڑکیوں نے تسلیم کیا۔ وہ اس بے ترتیب جیلے  
میں بھی بہت پینڈم لگ رہا تھا۔ (زمان نے ان  
لڑکیوں کو دیکھ کر مسکراہٹ بھی اچھالی۔) اور اندر  
گڑیا۔

اسے ماں کے ہاتھوں باپ کی یہ بے ادبی کھلتی  
تھی۔ اپنے شوہر کے ہاتھوں اپنی بے ادبی نے اسے  
گنگ کر دیا تھا۔ اس نے کات میں قفا قریاں ماریں  
اپنی گڑیا کو دیکھا۔

”کل کو اس کی بیٹی کس کا ساتھ دے گی۔ ماں کا  
بابا۔۔۔۔۔“ اپنی دھتکتی ہڈیوں پر گھور کرتے ہوئے اس  
نے عہد کیا۔ وہ برداشت کرے گی۔ وہ اپنی بیٹی کو  
ایسے سوالات میں الجھنے نہیں دے گی۔  
وہ گھر کے ماحول کو بہتر بنائے گی۔ کیسے بھی  
کرے۔۔۔۔۔

اور چونکہ زمان اس پر لعنت بھیج کر گیا تھا، تو گڑیا  
کو کوئی آئینہ یا بھی نہ سوجھ سکا کہ وہ آفس سے چھٹی کا  
بہانا کرے تو کیا۔

سو اس روز تمام کو لیک حیران رہے کہ میم نے  
اتنا تیز میک اپ کیوں کر رکھا ہے اور وہ بلاوجہ مسکرا  
کیوں رہی ہیں۔

☆☆☆

اگر زمان گھر کی بلنگ کو پورا کر دیتا تو بچوں کے  
مہنگے دودھ کے ڈبوں میں ڈنڈی مار جاتا۔۔۔۔۔ احتجاج  
پر اس کے جواب سے گڑیا کا تن بدن پھٹنے لگا۔ وہ  
بچی تو کماتی ہے۔ بچے اس کے بھی تو ہیں۔ خرید  
لائے دودھ اور مہینہ، اس میں بظاہر حرج نہیں تھا۔  
اسے بچے جان سے پیارے تھے۔ مگر پھر باپ  
کا کردار کیا ہوا۔ بس وہ پیدا کرنے کا حصہ دار تھا۔

بلکہ پیدا کرنے کی بھی خوب رہی۔ مرد کو اگر بچہ  
باقاعدہ پیدا کرنا پڑ جاتا تو دنیا سے نسل انسانی کب کی  
معدوم ہو چکی ہوتی۔

ایک بڑھا لکھا، خوش شکل، خوش گفتار شوہر، گڑیا  
کی جان کا آزار تھا۔ گزرے وقت نے اسے اس کے  
تمام سوالوں کے جواب دے دیے تھے۔ اس کی سمجھ  
میں آ گیا تھا۔ ابا اس رات معافی نہیں مانگ رہا تھا۔  
ایسی بہت سی معافیاں زمان اس سے ہزاروں بار  
مانگ چکا تھا۔ بعض میں اس نے معاف کر دیا اور  
جب نہیں کرنا چاہا تو زمان کو معافی بھی زبردست لینا  
آتی تھی۔ اس کی یہ بجال کہ وہ معاف نہ کرے۔

کیسی دو ٹوٹی زندگی جی رہی تھی وہ۔۔۔۔۔  
کیوں۔۔۔۔۔ وہ نانی کی طرح بری طرح پٹ کر کالم  
گلوچ سن کر بھی تابعدار بیوی کا کردار نہیں نبھا سکتی  
تھی۔ یہ بہت مشکل تھا۔

لیکن وہ اپنی ماں جیسی بھی نہیں بن پائی تھی کہ  
حادی ہو جاتی۔ ایسی کوشش کو تو زمان نے پہلے ہی وار  
میں ناکام کر دی تھی۔

یا پھر صبر و ضبط کر کے زمان کے اچھا ہونے کی  
دعا میں کرے، وہ وظیفہ۔۔۔۔۔

زمان نے نہیں سدھ رہا تھا۔ اس نے اس کی  
کمائی بھی کھانا بھی اور آنکھیں بھی دکھانا نہیں۔  
تو اتنا پڑھ لکھنے کے بعد ایک اعلا عہدے پر  
ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی ماں اور نانی جیسی مظلوم و  
بے بس عورت بن رہی۔

نانی نے خاموش رہ کر۔۔۔۔۔ اور ماں نے آواز و  
ہاتھ اٹھا کر دراصل اپنی بھائی کی جنگ لڑی تھی۔ دونوں  
خود کو اپنے اپنے انداز کی کامیاب عورتیں سمجھتی تھیں۔  
مگر وہ خود کو کہاں کھڑا کرے، کیا نانی کی طرح  
بچی رہے۔ یا ماں کے جیسی بن جائے۔ تیسرا کوئی  
راستہ۔۔۔۔۔

☆☆☆

دونوں ایک ہی گھر کے الگ الگ کمروں میں  
رہ رہے تھے۔ وہ بینک جانے کے لیے تیار ہو رہی

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہل آگاتا ہے۔
- بالوں کو منہ موٹا اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- کیسا مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت 1500 روپے

سوہنی ہیر آئل 12 بڑی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری  
کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ خصوصی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں  
یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدنا جاسکتا ہے، ایک  
بوتل کی قیمت صرف 950 روپے ہے، دوسرے شہروں سے بھی آرڈر بھیج  
کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے کسی آؤٹ اس  
حساب سے بھیجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 3600 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 6000 روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 10000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر 7، ایف 4، جناح روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان چمکوں  
سے حاصل کریں  
بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر 7، ایف 4، جناح روڈ، کراچی  
کلیئر عمران ڈائجسٹ، 37- اورنگزب مارکیٹ، کراچی۔  
فون نمبر: 32735021

افزیت کی کوئی شکل ہوتی تو وہ بھینا مہر لٹا ہوتی۔ بال زندگی کی مانند اجڑے سے تھے، پہلے کسی نے اس کے دامن میں خوشیوں کے سندیے لائی تھی، نہ ہی آج معمول کے برخلاف کچھ ہوا تھا۔ پہلے بھی مہمانی کے اکٹھا ہٹ بھرے لچھے سے

## ماہوش طالب

آپنی گلی کے بعد



تھی۔ اسے بیٹی کو اسکول..... اور بیٹے کو ڈے کیر سینٹر چھوڑنا تھا۔ جب بیل کی آواز پر زمان گیا، لوٹا تو اس کے ہاتھ میں لٹا ہوا تھا، گڑیا کے اعصاب تن گئے۔ یہ خلع کا ٹوش تھا۔

”تم..... تم نے..... تمہاری اتنی بچال.....“

”مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میں نے تھانے میں درخواست بھی جمع کروا رکھی ہے کہ میری جان کو تم سے خطرہ ہے۔ یا یہ کہ مجھے کسی بھی قسم کا نقصان پہنچے تو پولیس سیدھا تمہیں گرفتار کر لے۔ میرے پاس دن فائیو پر کال کا آپشن بھی ہے۔“ وہ پرسکون تھی۔

”میرے گھر میں رہ کر تم مجھے آنکھیں دکھاتی ہو۔“ اسے اٹھا کر مارنے کے لیے زمان کو کوئی چیز موزوں نہیں لگ رہی تھی۔

”گھر کا کرایہ میں دیتی ہوں۔ ایڈوانس بھی میں نے بھرا تھا۔“ اس نے اس کے پیش کے غبارے میں حقیقت کی سوئی چھو دی۔

”مجھے معاف کر دو۔“ اگلے منٹ میں وہ اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ مگر اس نے اپنے پیر سمیٹ لیے۔ اس کا سر قہقہے سے نفی میں مل رہا تھا۔

☆☆☆

فیصلہ اس کے حق میں ہونے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوئی اور آج وہ دونوں بچوں کو لیے اس گھر میں جا رہی تھی، جس کا کرایہ وہ بھرنی تھی۔

اپنا گھر بچانے کے لیے خاموشی اور تابعداری سے پٹناتانی کی حکمت عملی (اسٹریجی) رہی۔

جاریت ثریا کی حکمت عملی تھی۔ ثریا کی گڑیا کے لیے یہ دونوں راستے قابل قبول نہیں تھے۔

وہ نئے زمانے کی پڑھی لکھی عورت تھی۔ اس نے سب سے محفوظ راستہ استعمال کیا۔

تانی کے زمانے میں کامیاب عورت کی یہ ہی نشانی تھی کہ وہ ہر ظلم و جبر کو نصیب کا لکھا سمجھ کر برداشت کرے۔

ثریا اپنے طرز کی واحد عورت تھی۔

گڑیا کو ان دونوں جیسا نہیں بننا تھا۔ اس نے

وہ راستہ اپنایا جو اسے شریعت نے عطا کیا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں سے مارنے والے تانا آخری دو برس فاق کے زیر اثر بستر پر جا پڑے۔ منہ بھی میڑھا ہو گیا۔ تانی بوڑھے لرزے ہاتھوں سے خدمت کرتی تھیں۔ موتی زبان سے معافی مانگتے..... پھر اس کے بعد ساری رات افیت سے سر بچتے..... کیوں کہ تانی ہر بار معاف کر دیتی تھیں۔ ان کے بندھے ہاتھوں کو اپنے ماتھے سے جوڑ کر دل کی گہرائیوں سے یقین دلاتیں..... کہ ان کے دل میں کوئی شکلی ہے ہی نہیں..... تو وہ کس بات کی معافی مانگتے ہیں۔ انہوں نے کیا، کیا ہے؟

تانا آخری لپکی تک نہیں بتا پائے کہ تانی کا معافی کا اعلان ایسی افیت دیتا ہے کہ حد نہیں..... اگر وہ یہ کہہ دیں کہ جاؤ نہیں کیا تو شاید کچھ سکون ہو۔

تو تانی نے معاف کر کے بدل لے لیا۔

اور ثریا کی گڑیا کو وہ بھیجی برستی رات یاد آتی ہے۔ جب ابا..... ماں کے چہرہ چھو کر معافی مانگ رہا تھا اور ماں نے معاف نہیں کیا تھا۔ پیروں کو ایسے چٹا کر ابا کو لوہوں کے بل زمین پر جا گرا۔

ثریا کی گڑیا نے خلع لے کر اپنے شوہر کو ایسے ہی ٹھوکر مار کے خود سے دور کیا تھا۔

تین ادوار کی تین عورتوں نے ایک جیسی صورت حال کو اپنے اپنے حساب سے بھینا۔

تابعداری و درگزر سے..... برداشت و ہمت سے.....

نفرت و بے زاری سے..... دھتکار کر مار کر..... اور چھوڑ کر..... راستہ بدل کر.....

یہ فیصلہ اب آپ خود کیجیے کہ کس کا طریقہ درست تھا۔ ثریا کی ماں..... ثریا کا..... یا پھر ثریا کی گڑیا کا.....

بس ایک لمحے کو خود کو ان تینوں کی جگہ پر رکھ کر دیکھنا ہوگا۔



اس کی صبح ہوئی تھی۔ آج بھی طنز و طعنے کے نشتر اس کے نیم جاں وجود پر چاٹک چاٹک رہے تھے۔ غلطی بھی تو اس کی تھی۔ اس کی ممانی کو لگتا تھا کہ یہ یتیم و سیر ہونے کے ساتھ بدلہ بھی ہے۔ اس کے حالات سے بے زار ہو کر تو آفتاب نے بھی اپنی کرنیں اس پر نچھاور کرنا چھوڑ دی تھیں۔ یہاں تو پھر وہ انسان بنے تھے۔ جو کہنے کو اس کے اپنے تھے اور اسے ان حالات تک پہنچانے کے کسی حد تک ذمہ دار بھی۔ مگر کم ظہری گھٹی میں شاید ایسی بڑی تھی کہ اس کے زیر اثر ہر احساس دب کر رہ گیا تھا۔

”چل اٹھ جا پستی! پہلے کیا کم زندگی اجیرن تھی، جواب یہ عذاب مسلط ہو گیا۔“ نازیہ دھاڑے دروازہ کھول کر اسٹور روم کمرے میں داخل ہوئیں۔ ”کہاں چھپا رکھی ہے وہ سوغات۔“ انداز میں سمندری لہروں کی سی بے چینی تھی۔ کہیں کا غصہ کہیں نکل رہا تھا، بلکہ غصہ چپاں کا بھی ہو، ممانی کی توپوں کا مرکز ہمیشہ وہی ٹھہرتی تھی۔

مہرالنسا جانتی تھی، اس بے چینی و غضب کا محرک، مگر لب سے دہمکتی رہتی، اس کی سوئی ہوئی حیات پوری طرح جاگ گئی تھیں۔ نیچے کے نیچے سے موبائل نکال کر ان کو تھمایا اور خود فرشی بستر سے نکل کر لباس درست کرنے لگی، جواباً نازیہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

”آئندہ تیرے پاس نہ دیکھوں اسے۔“ دھاڑ سے ہی دروازہ بند ہوا۔ ماہین مشکوک ہوتے ہوئے بھی یہ ”آفت“ اپنے پاس رکھنے کی حق دار تھی، چپ کہ وہ بے قصور ہو کر کچھ سزاوار ٹھہرائی جاتی تھی۔ حسب معمول اپنی کم مائیگی کے احساس نے اسے کرلانے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

وہ جب پیدا ہوئی تو سونے کا چچو تو دور کی بات، پیتل کا چچو بھی آس پاس نہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی ساتویں اولاد تھی۔ پہلی دو،

دو سائیں ہی لے سکی تھیں، باقی چار سے عمر کا اتنا فاصلہ تھا کہ بیچ میں ان کے جوان ہوتے ہیچ آتے تھے۔ بھی جو وہ کوشش کرتی بھی ختم کرنے کی تو بڑی آپا اپنے سنے آنے والے سنے کی فکر میں غلطیاں ہوئیں یا بڑے بھائی کو بیٹے کی آئین پہ ہونے والے خرابے نے پریشانی میں مبتلا کیا ہوتا۔ ایسے میں کوئی کیونکر اس پر دھیان دے پاتا۔ اس پر مستزاد کہ پانچواں برس لگتے ہی اس کی گملائی ہوئی ماں عدم کو سدھار لگیں۔ اب وہ بھی اور اس کی تنہائی۔

باپ تھا، مگر یہ طے کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں سے کس کے لیے کسی حیثیت آئے میں نمک کی مانند ہے۔ وہ ساری مصروفیات سے فارغ تھا۔ (اسے لگتا تھا) تو سوچا کیوں نہ کوئی مصروفیت پال لی جائے، چار مرلے کے گھر میں سوگی داڑھی ٹھہراتے اور دھوئی سنہالے وہ ادھر سے ادھر پھرتا تھا اور یہ کوئی قابل قدر کام نہ تھا۔ اسی لیے شاید کوئی ابائی ابائی کہہ کر اس کے آگے پیچھے پھرنے والا بھی نہ تھا۔ نہ بیٹے، نہ بہوئیں۔ تب ہی اس نے قابل ذکر کام کر ڈالا۔ اب ہر کوئی ابائی ابائی! کہتا تھا کہ آگے پیچھے پھرنے والی جو کوئی اور آگئی تھی۔ ستر کے بیٹے میں داخل ہوتے باپ نے شادی رچا کر بڑا کارنامہ انجام دیا۔

مہرالنسا سات سال کی ہوئی اور اسی سال یتیم بھی کہ باپ کا بھی بھار کا رکھا ہاتھ بھی ہمیشہ کے لیے اس کے سر سے اٹھ کر نئی بیوی کے ہاتھ سے جا ملا۔ اس دن مہرالنسا کا اپنے گھر میں (جو بھی اسے اپنا لگا ہی نہیں۔) آخری دن تھا۔ اس گھر میں اگر اسے کوئی خوشی میسر آئی تھی تو وہ یہ کہ اس نے اپنے پیچھے، پیچھے بچوں کے ساتھ مارے باندھے ہی کبھی، مگر نورانی قاعدہ مکمل کیا تھا۔

اگلی صبح دوسرے گاؤں سے چھوٹے ماموں آئے۔ چھوٹے ماموں، صرف چھوٹے نہیں بھولے بھی تھے۔ گاؤں میں چھوٹا مگر خوب چلتا ”بک ڈپ“ تھا۔ وہ بھی اولاد تھے اور روز، روز کی جی جی کے

باعث بیوی سے ان کی آن بن رہی تھی، بھنوی کی حرکت کا پتا چلا تو چھوٹی بھانجی کا خیال آیا۔ سوچا شاید رب نے اسی لیے اولاد نہیں دی کہ مرحوم بہن کی بیٹی کو اپنی اولاد بنانا پڑے گا، لہذا کسی کی پروا کیے بغیر مہرالنسا کو لے آئے۔ گھر والوں نے شکر کا کلمہ ادا کیا کہ نامہاد ذمہ داری سے جان چھوٹی۔

مہرالنسا اتنی بچھڑکتی تھی نہ ہمت کہ جانے سے انکار کر سکے۔

اب بیوی جانے اور بھانجی۔۔۔۔۔ چھوٹے ماموں کو اجازت نہ تھی بولنے کی۔

جب تک اپنی کوئی اولاد نہ ہوئی تھی، تو نازیہ پھر بھی جزو دریا بن گئی۔ بھار شوقیہ مہرالنسا سے دو چار باتیں کر لیں، مگر دو سال بعد ماہین اور ایک ایک سال کے وقفے سے معاذ اور نورین کی پیدائش سے مہرالنسا کی رہی سہی اہمیت بھی جاتی رہی۔ اس کا وجود کسی ان چاہے بوجھ سے کم نہ تھا۔ مگر شوہر نامہ دار نے آج تک بیوی سے شاید پہلی اور آخری بات یہ ہی منوائی تھی کہ بھانجی کو واپس بھیجنے کی بات بھی نہ ہوگی اور مہرالنسا جہاں بھی رہتی، زندگی تو ایک ہی طرز سے گزر رہی تھی، جگہ نہیں مختلف تھیں، مگر میزبان ایک سے تھے، بے بسی، تنہائی اور نفرت۔۔۔۔۔

☆☆☆

وہ سولہ سال کی ہوئی تو زندگی کے رنگ آپوں آپ ہی ذرا سے بدلے۔ ممانی کی زیادتیوں کے باوجود رات کو محن میں لگے آئینے کے سامنے ضرور جا کر کھڑی ہوئی، کچھ محوں کے لیے ہی کبھی، مگر اپنا جائزہ ضرور دیتی اور اپنے آپ کو کسی اور دیس کی باسی تصور

کرتی۔ حالانکہ کوئی بتانے والا تھا، نہ کھانے والا، نہ ہی کوئی سکھی سیکھی جس کے ساتھ مل کر شوخیاں ماری جاسکیں، ہاں۔۔۔۔۔ مگر بڑا مدے میں لگا کالے رنگ کا ٹی وی جس کا تو شاید اب ماڈل بھی دنیا سے ناپید ہو چکا تھا، مگر ہمسایوں کے توسط سے رنگ برنگے چینل خوب آتے تھے، تو وہی تو تھے اسے کھانے والے کہ اس عمر میں خیالات کیسے بدلے ہیں اور کوئی دھیان دینے والا نہ ہو تو کردار بھی۔۔۔۔۔

چھوٹی نورین تو معصوم تھی، جب ممانی آگے پیچھے ہوتیں تو اس سے اسکول کا سبق پڑھنا بھی سیکھ لیتی اور تربیت کتابوں اور عملی کرداروں سے ہی تو ہوتی ہے۔ مگر خالی خولی اپنی ہی شکل دیکھنے سے کیا ہوتا۔ لہذا جلد ہی طبیعت بے زار ہوئی، کاموں اور نفرتوں کے انبار تلے زندگی پھر سے دہلی دہلی محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

اٹھارہواں برس لگا تو لگا زندگی کو مقصد مل گیا ہے۔ سجاد اور اس کی محبت بھری باتیں، ان باتوں میں اتنا شیر اٹھا کر کیا کسی گلاب جاسن میں ہوگا، تو پھر مہرالنسا کا اس شیرے میں ڈوبنا لازم تھا۔ وہ اپنے سارے دکھ بھول گئی۔ وہ زندگی کو ”محسوس“ کرنے لگی، یہیں چھت پر ٹپکتے ہوئے بے دھیانی میں نظر بس چھت ایک بار، دوسری بار اور تیسرے دن تیسری بار کبھی چھت پر بیٹی محبت پکٹنے لگی، اب ممانی کی۔ باتیں تکلیف دیتی تھیں، نہ کام بوجھ محسوس ہوتے تھے، بس صبح ہوتے ہی شام کا انتظار ہوتا کہ کب وہ کپڑے دھوئے اور کب کھانے کے بھانے۔۔۔۔۔ چھت پر جائے۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ کوئی اس کی پروا کرنے والا ہے، نہ ممانی۔

مگر بھانے رے یہ کم بخت خوش نہی۔ تیسرہ سالہ ماہین نے مزاج میں چالاکی اور سختی اپنی ماں سے لگتی میں کی تھی اور ہی سہی کسر مان کے کھڑی ہوئی، کچھ محوں کے لیے ہی کبھی، مگر اپنا جائزہ ضرور دیتی اور اپنے آپ کو کسی اور دیس کی باسی تصور

نچاتے ہوئے مہر النساء سے پوچھا۔

”سجاد بھائی سے ملنے جا رہی ہوں، اس لیے آج وصلے ہوئے کپڑے دوبارہ دھو رہی ہوں۔“  
صاحبین سے جھاگ بنائی، بے وجہ مسکراتی وہ ٹھکی۔ ”ک..... کک، کیا مطلب؟“ تھوک نکلنے ہوئے بشکل اس نے کہا۔

”اپنی خیریت چاہتی ہوں تو اس کا خیال دل سے نکال دو، خود کو بڑی حسین شے سمجھتی ہو تم..... ہونہ۔“ کہہ کر وہ بٹٹی، مگر مہر النساء کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ بے دلی سے چھت پر گئی، جہاں وہ فارغ الوقت سجاد فرحت سے گفتگو تھا، مگر مہر النساء نے تو گویا آنکھیں بند کر لی تھیں۔

کالے۔۔۔ ہال، تاریکی میں کچھ بد رنگ چیز بننے سجاد کو اس بے اعتنائی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی، مگر وہ انتظار کرتا رہا کہ شاید کچھ جانتے وقت ایک نظر عنایت ہو ہی جائے، یوں بھی آج کے جدید دور میں مفت میں اپنا قیمتی وقت دینے والی اس جیسی اور کہاں ملتی۔ مگر مہر النساء نے پلٹنا تھا، نہ وہ بٹٹی۔ دل کو دھڑکا ہی لگا رہا کہ کہیں ماہین ممانی یا ماموں کو نہ بتا دے۔

مگر رات بلکہ اس سے اگلی رات بھی خیر ہی رہی۔ سجاد نے اگلے دن ”شش..... شش“ کر کے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر مہر النساء نے آج کان بھی بند کر لیے اور پھر تیسرے دن جب کپڑے دھو کر وہ اس شش و پنج میں مبتلا ہوئی کہ اوپر کسے جائے، ماہین نے اس کے ہاتھ سے کاسی رنگ کی بالٹی لے کر مشکل آسان کر دی، اس کی بھی اور اپنی بھی..... مہر النساء کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ ماہین اس کا یہ راز کسی کو نہیں بتائے گی، تو خوب سجاد کو یاد کرنے لگی۔ اسے یہ قفل تھا

کہ وہ اسے بے وفا سمجھتا ہوگا، اس کی یاد میں بے چین رہتا ہوگا۔ مگر وہ کرتی بھی تو کیا۔ اس لیے جو کرتا تھا، وہ ماہین نے کر دکھایا۔ اب روز چھت پر کپڑے پھیلانے کی ذمہ داری ماہین نے لے لی تھی۔ واپسی پر ایک تملاد دینے والی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ

کیے ہوئی، جسے وہ پہلے نہ سمجھ سکی، مگر نام نہاد محبت کی یہ نئی پینک چٹھاس اس نے بھی دیکھ لی۔

دل ماننے کو تیار نہ تھا کہ سجاد نے اپنا دل بلکہ دل کا ایک خانہ کرائے پر دے رکھا تھا اور جب مہر النساء کرائے کی رقم وقت پر ادا نہ کر سکی تو سجاد نے کرائے وارید لئے میں چنداں دیر نہ کی۔ غلطی بھی تو مہر النساء کی تھی جو دل لگی اور دل کی لگی میں فرق نہ سمجھ سکی۔ جو وقت گزاری کو مقصد حیات اور محبت تصور کرنے لگی تھی۔ تو زندگی پھر سے لاوارث ہو گئی۔ وہ جو ایک احساس تھا چاہے جانے کا، خوش فہمی ہی سہی، تھا تو..... ختم ہو کر رہ گیا۔

ماہین کی حرکتوں سے ممانی واقف تھیں یا نہیں، مگر مہر النساء کی اوقات نہیں تھی کہ اس سے جواب طلب کر سکے۔

☆☆☆

خزاں کے خشک دنوں اور اجازتوں میں اسے اپنی عمر دیاں پھر سے ستانے لگی تھیں۔ کرنے کو بہت کچھ تھا، مگر بے زار کر دینے والا دن تو کاموں میں جیسے تیسے گزرتا تھا، مگر رات کو برائے نام فرشی بستر پر لیٹتے ہی اسے آپ سے ہزاروں سوال کرتے لگتے۔

وہ اٹھارہ سال کی مہر النساء جس کا نام بھی اس کے ماں، باپ نے نہ جانے کیا سوچ کر اور کیسے ”مہر النساء“ رکھا تھا، ورنہ جیسی زندگی وہ گزرتی تھی، اس کا کوئی نام نہ بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ اسے یاد نہیں پڑتا کہ اس کی پیدائش کے وقت پہلی بار کسی کو اس کا نام بتانے کے علاوہ بھی کسی نے اسے اس کے پورے نام سمیت پکارنے کی زحمت گوارا کی ہو۔ ہاں..... البتہ کسی، چچی، گھوڑ ماری، پوتی، منخوس، میرد (جس کی نوبت بہت کم آتی۔) جیسے اس کے بے شمار نام تھے، جن سے جس کا جب دل چاہتا اسے پکارتا۔

ہاں..... تو وہ مہر النساء جاگ رہی تھی، وہ جو سوالوں کے جواب تلاشے لگی تھی، مگر کون تھا جو اسے مطمئن کر پاتا اور اس سے پہلے کہ وہ مایوس ہو کر سو جاتی۔ چھوٹے ماموں برآمدے میں لی وی کے سامنے بیٹھے

دکان کے حساب کتاب میں مشغول تھے، جس پر کوئی قاری قرآن کی سورۃ مع ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ نازیہ شوہر کے لیے دودھ پتی تیار کر رہی تھیں اور ماہین، مہر النساء کے سامنے ہی گدے پر سونے کی اداکاری کر رہی تھی۔

”اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل لے۔“ مہر النساء نے یہ آیت مع ترجمہ سن کر، وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ قرآن کے کس جیسے میں لکھی ہے، وہ اس آیت کا مفہوم بھی نہیں جانتی تھی، مگر یہ یقین تھا کہ یہ قرآن کے الفاظ ہیں۔ کچھ ایسا ہے ان لفظوں میں جو اسے اپنی طرف متوجہ کر گیا ہے، جو اسے اپنی زندگی سے بچاؤ محسوس ہو رہا ہے اور پھر ساری رات وہ سو نہ سکی۔ یہ سچی سچہ کے ہی نہیں دے رہی تھی کہ قوم اپنی حالت آپ کیسے بدل سکتی ہے، جب کہ سب اختیارات تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات اس کے لیے یہ تھی کہ کیا قرآن اردو میں بھی ہے؟ پھر دوسرے دن اور اس سے اگلے کئی روز وہ بے چین رہی کہ اپنے سوالوں کے جواب کیسے پائے؟

اس دن جب نورین نورانی قاعدے کی دہرائی کر رہی تھی اور وہ بظاہر اسے دیکھتی کسی غیر مرئی نقطے کو سوچ رہی تھی، تب ذہن میں ایک اور جھماکا ہوا۔ بعض اوقات سامنے کی چیز نظر نہیں آتی، آپ کے سوالوں کے جواب اتنی دور نہیں ہوتے، جتنا آپ انہیں سمجھ لیتے ہیں، اس کے معصوم مگر اہم سوالوں کے جواب اس گھر میں قاری صاحب کے علاوہ کون دے سکتا تھا، جو پانچ سال سے اس گھر میں وقفے وقفے سے آ رہے تھے اور مہر النساء کے لیے کسی کے گواہ بھی تھے۔

”یہی قرآن اللہ کی کتاب ہے، جسے اس نے ایک زبان عربی میں نازل کیا ہے، مگر تم دیکھو نا کی اپنی کائنات میں ہر طرح کی بولی، بولنے کے لیے ہیں تو ہر صاحب شوق اس کی فضیلت سے

مستفید ہو سکے، اس کے لیے مختلف ملکوں کے علما نے اسے اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور یہ کام اب نہیں، بلکہ چودہ سو سال پہلے اس کتاب کے نازل ہونے کے بعد ہی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یوں جب اردو زبان وجود میں آئی تو قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کرنا بھی ناگزیر ہوا۔“ قاری صاحب، معاذ اور نورین کو پڑھانے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر اسے سادہ انداز میں سمجھا رہے تھے۔

”اور یہی ہے جو آیت ہے نافرآن کی سورہ الرعد آیت 10 میں“ بڑی زبردست ہے۔ اسید دلائی، ہمت بندھائی اور بزدل اور دست لوگوں کو خوف دلاتی۔“ ”مگر قاری صاحب اس میں پوری قوم کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب ہے میں اکیلی جیسی ہوں، ویسی رہوں، اللہ مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔“ وہ الجھ گئی تھی۔ قاری صاحب مسکرائے۔ وہ سمجھ گئے کہ اس کے اندر بحس کا بیج پھوٹ پڑا ہے، شعور نے اگڑا لیا۔ یعنی شروع کر دی ہیں۔

”بیٹا! تو میں بھی تو فرد واحد سے مل کر وجود میں آئی ہیں۔ تم ظلم سہتی رہو گی۔ ہم تم (گوگئی بہری) بن کر اگر سب دیکھتی رہو گی تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے ان حالات کو اپنے لیے پسند کر لیا ہے۔ تمہیں فرق نہیں پڑتا تمہارے ساتھ اگر اس سے بھی برا ہو، تم خود کچھ بھی نہیں کرنا چاہتیں اپنے لیے اور یہی حال تو ہمیشہ سے کسی نہ کسی قوم کا رہا ہے، اللہ سے دوری ہی تو بے بسی اور مصیبتوں کا باعث بنتی ہے۔ سمجھ رہی ہو میری بات مہر النساء بیٹی؟“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”جی۔“ وہ فقط یہی کہہ سکی۔

کچھ دنوں بعد قاری صاحب نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی ممانی سے اجازت لے کر ان کی بہن کے پاس قرآنی تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔

ممانی سے پوچھا تو جواب آیا۔ ”جہاں مرضی جاؤ۔ یہاں بیٹھ کر کون سا اناج کھلا رہی ہو، مگر

دو گھنٹے سے ایک منٹ اوپر نہ چھوہیں وہاں۔“  
روز کے دو گھنٹے ایک ایسے گھر میں گزارنا جہاں کوئی کسی کو طعنہ نہ دے، غلطیوں پر ذلیل نہ کرے، آپ کی بات کو سنا جائے، اہمیت دی جائے، مہر التسا کے لیے غنیمت تھا۔

چالیس کے پیٹے میں داخل ہوتی فاطمہ باجی بظاہر جتنی سادہ اور برقرار لگتی تھیں، اندر سے بھی طبیعت میں ٹھہراؤ اور نرمی تھی۔ انہوں نے قرآنی تفسیر اور مفہوم احادیث کا کورس کر رکھا تھا۔ اس لیے محلے کے بچوں کو پڑھاتی تھیں اور ہڈی پیسے لیتی تھیں۔ قاری صاحب کے توسط سے وہ مہر التسا کے حالات کے بارے میں جانتی تھیں، اس لیے بھی اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ بالکل مفت پڑھ رہی ہے۔ یہ ان کی محنت اور مہر التسا کا شوق ہی تھا جو وہ پڑھ سال کے عرصے میں قرآن پاک کو عربی اور اردو میں سمجھ کر پڑھنا سیکھ گئی تھی اور اسی دلچسپی کے باعث اسے اچھا خاصا لکھنا بھی آ گیا۔ ذہن تھی، اس لیے معاذ وغیرہ کی اردو اور اسلامیات کی کتابوں کو شوق سے پڑھتی اور ان نکتوں کی بھی دہرائی میں مدد کر دیتی۔

ممائی نے جو یہ دیکھا تو منہ میں انگلیاں داب لیں۔ ”یہ اس کے پرکب اور کیسے نکلے۔“ پھر انہوں نے زبان کی پتلی تیزی اور سارے پرکاٹ دیے۔

اب ایک جتنے سے وہ فاطمہ باجی کے ہاں نہیں جا رہی تھی۔ صد شکر کہ سیکھنے کو اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ امور خانہ داری بھی۔ اب کچھ عمل کرنے کا وقت تھا۔ وہ جو سجاد کی یاد اور بے وفائی پر ہفتوں تڑپتی تھی۔ اب سوچتی تو اپنی حماقت پر مسکرا کر سر جھٹک کر دیتی۔ دل زیادہ اداں ہوتا تو شکر کرتی کہ کسی بڑے گناہ میں ملوث ہونے سے بچ گئی..... اور شاید دل بدلنا اسے ہی کہتے ہیں جیسے اس کا بدلا تھا۔

ممائی سے اجازت لے کر اس نے ان کی سلائی مشین سنبھال لی، ماہین اور نورین کے دو چار ان سلائی کپڑے ٹیٹ کے طور پر ممائی کو سی کر دکھائے اور

ممائی نے اس بار پانچوں انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔ مفت کی درزن تو ہاتھ لگی تھی، مگر بھانجی کی یہ علاقہ بندی ایک آنکھ نہیں بھاری تھی کہ نہ خود سلیقہ مند تھیں، نہ بیٹیاں۔ خیر محلے میں اطلاع دے دی کہ اب سب کے کپڑے مناسب داموں میں مہر التسا ہی سنا کرے گی۔ ممائی کے شیطانی دماغ نے یہ بھی سوچ لیا کہ بھانجی کی کمائی بھی کھالیں گے اور نام و نیک بھی ہوگی کہ یتیم کی کیسی اچھی تربیت کی ہے۔ سلائی کے پیروں سے جینز بھی تو اسی کا بنے گا..... مگر..... مہر التسا کی تو گویا کا باپ ہی بلٹ لگی تھی۔ شرط رکھی کہ کپڑے اس شرط پر ہے کی، اگر کل آمدن کا ستر فیصد اسے ملے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق ممائی کو باہی بھرنی پڑی کہ زبان دے چکی تھیں۔ اب بات عزت کی تھی۔

☆☆☆

وقت اپنی پوری رفتار سے گزرتا رہا، جہاں مہر التسا کے روز و شب بدلے تھے، وہیں ماہین کی چھب بھی نرالی نکلی۔ بمشکل بدل پاس کر کے اس نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا، جب کہ مہر التسا نے فاطمہ باجی کی مدد سے آٹھویں جماعت میں داخلہ لے لیا، اس بار بھی ممائی کچھ بولی نہ سکیں۔ مہر التسا نے دن رات کی محنت کی کمائی سے اس۔ مگر کا نقشہ بھی تو بدل کر رکھ دیا تھا۔ بدرنگ، گھسے اور ٹوٹے ہوئے برتنوں، گلدانوں اور موزوں کی بھی سی گئی۔ ممائی کو یقین تھا کہ وہ دو چار پیسے اور جمع ہوئے تو خود ہی پینک اور خستہ حال دیواروں کے بارے میں بھی سوچے گی اور یوں اچھے رشتے بھی آئے لگیں گے۔

بھئی اپنی ماہین کے لیے۔  
شکر تھا کہ باقی اخراجات ابھی ماموں کی آمدن سے ہی پورے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

مہر التسا اب قدرے مطمئن رہنے لگی تھی۔ وہ جو گم شدہ سی تھی، اس زبست کو عنوان مل رہا تھا۔ یوں ہی اپنی گزشتہ زندگی کا ورق ورق پلٹتے رات کے

بڑی پہر، جب وہ نیند کو سلام کرنے ہی والی تھی، کھالی کی بے وقت آمد نے اسے جگا دیا، مگر ان کے خیال میں وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ جب کہ ماہین حسب معمول سونے کی اداکاری..... آدھا خیال درست تھا..... آدھا خیال غلط بھی تھا۔

”مامی اٹھ جا، اچھی خبر نہیں ہے، اس منوس کا ہاپ مر گیا۔“ نازیہ نے اس کے اوپر سے چادر مہر کاٹے ہوئے سرگوشی کی۔

”کیا..... امی۔“  
”دشش..... دشش اس کو ہرگز خبر نہ ہو، چل اٹھ، شہیر (مہر التسا کا بھتیجا) نے فون کر کے بتایا ہے۔ ہمیں ابھی جانا ہے، اس بجٹ کی آنکھ کھلنے سے پہلے تیار ہو کر آ جا۔“

”اچھا اماں صبر کر لے۔“ وہ جو موبائل پر اہم ترین کام انجام دے رہی تھی، ماں کی بے وقت آمد سے خوب کوفت زدہ ہوئی۔

مہر التسا کو لگا شاید اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ کس بات کا یقین۔ کرے، باپ کی موت والی بات کا یا اسے باپ کی موت سے بے خبر رکھنے والی بات کا۔ مگر اسے تو ایک اور بات کا بھی یقین کرنا تھا۔

کچھ کی دیر بعد لوہے کا داخلی دروازہ وا کرتے ہوئے ماہین نے ماں سے پوچھا تھا۔ ”اماں! مہر التسا کو کیوں نہیں بتاتا۔“

”ارے تجھے نہیں پتا، بڑا کمینہ دوھیال ہے چہا، نہ جانے کیسے معلوم ہوا انہیں کہ یہ بڑی پڑھنے لکھنے والی سمجھ دار ہوئی ہے۔ قرآن کی باتوں کا پتا ہے اسے، تو ڈر گئے کہ کہیں باپ کا سنتے ہی وراثت میں حصہ مانگنے نہ آ جائے۔“

”ہاں دیے اماں! کچھ پتا بھی نہیں اس چلا کوکا..... کیا انہوں نے۔“ تاغید کرنے والی ماہین تھی۔

اور مہر التسا.....

نماز فجر کے لیے صدائیں بلند ہونے لگیں، مگر التسا تنگے سر، تنگے پاؤں اسٹور کی جانب گئی۔ یقین کرنا لازم تھا کہ سوائے اس کے کوئی

چارہ نہیں تھا اور اس کے یقین کرنے، نہ کرنے سے فرق کسی کو پڑتا تھا۔ خوش بھی اور محبت تو برسوں پہلے ہی ختم ہو چکی تھی..... مگر کوئی اتنی گھٹیا سوچ بھی رکھ سکتا ہے؟ اذیت کی کوئی شکل ہوئی تو وہ مہر التسا ہوئی۔

☆☆☆

اگلی صبح معاذ، نورین اور ماموں بھی چلے گئے اور شام تک واپس آئے۔ اس سے کچھ کہنے یا پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی گئی اور اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی فی الحال وہ سکت نہ رہی تھی۔ اب تو اپنوں کے دیے گئے دکھ زندگی کا ایک تحفہ تھے جو شاید عمر بھر اس کے ساتھ ہی رہتے۔ اندر ہی اندر آنسو بہائے، نہ جانے کتنے دن بیٹے۔

فاطمہ باجی آئیں تو ان کے گلے لگ کر خوب سسکی، جب کہ فاطمہ اسے تسلی دیتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ اپنے بھانجے کے لیے مہر التسا کا رشتہ اس کی ممائی سے مانگیں، تو کیسے مانگیں؟

”یہ فاطمہ سے تمہارا دوستانہ کچھ زیادہ نہیں ہو گیا؟ تمہاری ہم عمر ہے وہ، جو ہر وقت اس کے ساتھ لگی رہتی ہو۔“ ممائی فاطمہ کے جاتے ہی زہر اگلنے لگیں۔

”وہ خود ہی آ جاتی ہیں۔ میں ان کو منع تو نہیں کر سکتی۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا، جو ممائی کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

”تو بی بی! جب تم لوگوں پر یہ ظاہر کرو گی کہ تمہارے ممائی، ماموں تم پر ظلم کرتے ہیں تو وہ تو ہمدردی کو آئیں گے۔ تم سب پر یہی ظاہر کرنا چاہتی ہو تا کہ تمہارے ماموں، ممائی نے تم پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔“

مہر التسا کچھ نہ بولی تھی، مگر دل ممائی کی اس ہٹ دھرمی میں لپٹی صاف گونی پر کٹ کر رہ گیا۔

☆☆☆

زیادہ دن نہ گزرے تھے، مگر یہ صبح گزرے دنوں کی نسبت قدرے روشن اور پرسکون لگ رہی تھی۔ دوپہر ڈھلتے ہی فاطمہ باجی اپنی بڑی بہن کے





ساتھ آئی تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ماموں بھی گھر پر تھے۔ ممانی کا چونکنا لازمی تھا۔ فاطمہ نے ہتھپٹا بڑی سوچ و بچار کے بعد یہاں آنے کی ہمت کی تھی اور پھر ان کی بہن نے جب اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو ممانی کے تو چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔ ماموں البتہ سنبھلے ہوئے تھے۔

”سوچ کر جواب دیں گے۔“ کہہ کر انہیں رخصت کیا۔

طرز کے تیر چلاتی ماہین کے توسط سے بات مہرالنسا تک پہنچی، مگر وہ یقین کرنے سے قاصر تھی۔ کیوں کہ ماہین نے تو کچھ بعد نہ تھا کہ مہرالنسا کے سوال کرنے پر بات کا پتھڑ بنا کر ماموں، ممانی کے سامنے پیش کر دیتی۔ لہذا بے نیازی کا لہذا اوڑھنے میں ہی عافیت جانی۔ یہ الگ بات کہ ساری رات جگنوؤں اور پھولوں کی وادائی کی سپر کرتی رہی۔ اگلی صبح حسب معمول ممانی کی کل افشانیوں سے ہوئی۔

”ارے ہمیں کیا پتا تھا کہ تعلیم کے بہانے وہاں لڑکے پھنساتے جاتی ہے۔ فاطمہ سے سر جوڑے راز و نیاز کرتی تھی اور ان کے ابا کو دیکھو، ساری عقل دکان پر ہی چھوڑ آتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کی پروا نہیں۔ بھانجی مخوس کے لیے آئے رشتے کو ہاں کرنے چلے ہیں۔“

مہرالنسا اس الزام پر گھبرا گئی، وہ صفائی دینے کی خاطر ممانی کی طرف بڑھی مگر.....

”اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی نہ بدلے۔“

وہ بڑھے گئے تمام سبق کیسے بھول سکتی تھی۔ جو قدم قدم پر ممانی کرنے کو موجود تھے۔ ممانی تک پہنچتے پہنچتے اس کا ذہن بدل چکا تھا۔ اگر اس نے اپنے لب اب نہ کھولے تو ساری زندگی ذلت میں گزرے گی۔ دوسروں کے احسان تلے۔

”ممانی! اگر میں اتنی مخوس ہوں تو آپ اس رشتے کو ہاں کریں۔“ بہتر کی چادر ٹھیک کرتی ممانی چوٹیں۔

”بالکل! اور میں آپ کی لاڈلی کا مقابلہ کرنا بھی نہیں چاہتی۔ بس یہ التجا ہے کہ اگر آپ چاہتی ہیں کہ ماموں، ماہین کی حرکتوں کی وجہ سے آپ کی بیٹیوں کی شادی زبردستی نہیں نہ کر دیں تو فاطمہ باجی کو ہاں کر دیں۔“

وہ کہہ کر رکی نہیں، مگر کمرے میں جا کر اس کا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔ اتنی بے باکی کا انجام نہ جانے کیا ہو۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ خواہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ لیتی، تب بھی ممانی اس کی پاک بازی کا یقین کرنے والوں میں سے نہ تھیں۔ اسے آج نہیں تو کل اس گھر سے نکلنا ہی تھا۔ پھر کیا حرج تھا کہ وہ ذلت کے بجائے عزت سے اس گھر سے رخصت ہو جائے۔

ممانی کو یقین تھا کہ مہرالنسا نے جو کہا ہے وہ کر بھی سکتی ہے۔ ماہین کی بے راہ روی بڑھتی جا رہی تھی۔ بہتر یہ ہی ہے کہ مہرالنسا کے نام کی لفظی نکلوار سے جلد از جلد چھٹکارا پایا جائے۔ پھر ماہین میں اتنا سلیقہ و سمجھ داری نہ تھی کہ وہ اس کا بیباہ رجا دیتیں۔ انہیں اپنے سر پر خاک نہیں ڈلوانی تھی اور پھر بھانجی کی اتنی اچھی جگہ شادی کرنے پر ساری واہ واہ ان کے حے میں ہی آئی۔

رات سے صبح ہونے تک وہ اپنے آپ کو سمجھا چکی تھیں۔ لہذا دکان پر جانے سے پہلے شوہر کے کان میں ڈال دیا کہ لڑکے والوں کو ای جتنے بلا لیں۔

”بہت اچھا فیصلہ کیا۔ تیم کی ذمہ داری بھانا تو ویسے بھی بڑے ثواب کا کام ہے۔“ ناشتے کے لیے میز اپنی طرف کھکاتے ہوئے ماموں نے فرمایا اور ممانی مسکرا بھی نہ سکیں۔

سلوی سیف اللہیٹ



دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں، ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کہنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔ ریاض احمد کے دو بیٹے غیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ غیر بہت سلگھا ہوا نوجوان ہے، جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جب کہ عمر ایک بڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔ الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد ہتھیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسٹنٹ میں محذور ہوتا ہے اور اس کی بیوی مرجانی ہے، وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

مکمل ناول



انعم اور احسن ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا ٹیسٹ کر داتا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے، احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازیشیو آتی ہیں، وہ بالکل وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کسی اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنیادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا کھڑا رہتا ہے اور اپنے پیچھے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔

عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بہن بھائی دعا کو اس کی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بہن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھائی، وہ اسے ہر وقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کالاچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔ الیاس احمد عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتے ہیں، جسے ریاض احمد سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ عمران سے مزید برکت ہو جاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر ہمیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، کیوں کہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہوئی تو باپ، بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں گے۔

ریاض احمد، عمر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں، مگر رابعہ، دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آ جاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل کھیل میں آنے لگتا ہے۔ وہ عمر کو اسلام آباد راج کا جارج دے دیتے ہیں۔

عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دعا بھی ممائی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے، مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانہ نہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔

منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں، جہاں دعا، عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامنی پر یقین ہوتا ہے، وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔ ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں، جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہے۔ دعا اپنی پاک دامنی ثابت نہیں کر پاتی، اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصور وار نہیں مانتا۔ الیاس احمد، مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔

الیاس احمد اپنی چھپے دار باتوں سے مریم اور رابعہ احمد کو دعا کی آصف سے شادی پر راضی کر لیتے ہیں۔ ریاض احمد اور

نوال کے کہنے پر عمیر، دعا کو اس کی شادی سے ایک روز قبل الیاس کے چنگل سے چھڑا لیتا ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے سوتیلے بھائی کے دروازے پر چھوڑ آتا ہے۔

اس کا سوتیلہ بھائی ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ دعا گھروں کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر نے عمیر کو گولی مار دی ہے۔ نوکرائی اسے کہیں اور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بہت بری حالت میں دعا اپنی دوست انعم کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنے حالات بتاتی ہے۔

دعا کے متعلق رابعہ کے اصل خیالات اور عمر کے کروت جان کر ریاض احمد ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ آصف خودکشی کر لیتا ہے۔

انعم، دعا کو اپنے گھر میں پناہ دے دیتی ہے۔ انعم کی ساس کینڈا اسے ملنے آتی ہیں۔ انہیں بات پسند نہیں آتی۔ وہ انعم

اور دعا کا موازنہ کرتی ہیں۔ یہ بات دعا کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ وہ انعم کو اس کی بے اولادی کا احساس دلاتی ہیں۔ عمیر کا طلاق حملے میں بچ جاتا ہے۔ ریاض احمد، عمیر اور نوال کی بے رحمی، رابعہ احمد کو اپنی غلطیاں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عمر کی حالت میں ماں سے بھی بدتمیزی کرتا ہے اور الیاس احمد سے بھی پیسوں کا تقاضا کرتا ہے اور سارا راج مریم کے سامنے اگل دیتا ہے۔ دونوں کا جھگڑا ہو جاتا ہے اور عمر، الیاس احمد پر فائر کھول دیتا ہے۔ عمیر، الیاس احمد کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مریم، عمیر کو عمر اور الیاس احمد کے گٹھ جوڑ اور سازش کا بتاتی ہے۔ عمر کو پولیس کال کر کے جانی ہے۔ تقاضے میں اس پر تشدد ہوتا ہے۔ عمیر اور ریاض احمد تقاضے جاتے ہیں جہاں سے رہائی پانے کی خاطر عمر انہیں بچ بچ ہٹا دیتا ہے۔

تبریز احمد، مریم کو اس کے جیسے کی جائیداد دے کر بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ مریم کو ان کی بے رحمی بہت کھلتی ہے۔ وہ الیاس احمد سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ الیاس احمد اپنی جگہ شرمندہ ہوتا ہے۔

احسن اپنی ماں اور بیوی کو ہر ممکن روکنے کی کوشش کرتا ہے، مگر ناکام رہتا ہے۔ اس کی دعا سے شادی ہو جاتی ہے۔ وہ دعا کو اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے، دعا اس نے رشتے سے خوش ہے۔ جب کہ انعم متنازع کیفیات کا شکار ہے۔

رابعہ احمد کو عمر بہت یاد آتا ہے۔ وہ عمیر سے معافی مانگتی ہیں۔ عمیر نہ چاہتے ہوئے بھی ماں کی ہر خطا کو معاف کر دیتا ہے۔

الیاس احمد کی کوششوں سے عمر رہا ہو کر گھر آ جاتا ہے۔ اس کی ندامت پر سب اسے معاف کر دیتے ہیں۔ الیاس احمد اپنے اور مریم کے درمیان جاری سرد جنگ کو ختم کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

انعم، دعا اور احسن کو پھٹنے پھٹنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور ذرا سی بات کا افسانہ بنا کر احسن کے ہاتھوں دعا کو ذلیل کر دیتی ہے۔ انعم، دل آرا کو بھی دعا سے بات کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ دل آرا، احسن کو معاملہ فہمی سے کام لینے کا مشورہ دیتی ہیں۔ اپنی بے عزتی پر دعا کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔

## دسویں قسط

انعم خوش تھی بے حد خوش۔ اس کے ہاتھ نیا اور دلچسپ موضوع آ گیا تھا۔ دعا کی رات والی حرکت نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا، اب وہ پوری آزادی سے کھیل سکتی تھی۔

”ان بلیو سہیل احسن! اس نے آپ کو بھی بیڈ روم سے نکال دیا۔“ اس نے جوس کا جگ ٹیبل پر دھرا۔

وہ رات سے کوئی دس بار یہ جملہ کہہ چکی تھی۔

”کھانا نہیں، بہت تمیز کے ساتھ چلے جانے کو کہا تھا۔“ احسن نے ”نکال دیا“ کی کھج کی۔

یہ جملہ اس کی مردانگی پر تازیانہ تھا۔ انعم کو احساس نہیں تھا کہ وہ اسے کتنا نارچہ کر رہی ہے۔ وہ جلدی سے آفس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

”ایک ہی بات ہے، اسی لیے ہمارے بزرگ

نسلی اور خاندانی ہونے پر زور دیتے ہیں۔“ وہ بڑے مدبرانہ انداز میں سر ہلا رہی تھی، احسن کو تپ چڑھ گئی۔

”تمہیں کچھ زیادہ ہی جلدی بزرگوں کے فرمان یاد نہیں آ گئے۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ اور آنکھیں سرخ تھیں۔

”ماما جی کو یقین تھا کہ دعا بہت معصوم اور خاندانی ہے۔“ وہ شہنشاہی۔

”ماما جی! زندہ باد۔“ اس کی ہزبرائی ان کے کھاتے میں ڈال کے خود بری الذمہ ہوا جاسکتا تھا۔

”اسے اس گھر میں رکھتے ہوئے تمہارا بھی یہی موقف تھا۔“ اس نے بھی اپنے اندر کی جلن کم کی۔

”مجھے تو سخت غصہ آ رہا ہے احسن! آپ ہمارے مجازی خدا ہیں، آپ کا احترام ہم پر واجب ہے۔ میں نے بھی آپ کو آف تک نہیں کہا، اس نے

اتنی انسلیٹ کر دی، میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔“ وہ ایسی ہی غصیلی اور جنگ جوشی۔

”پلیز پہلا جھگڑا ابھی تک طول پکڑے ہے اور تم دوسرے کی تیاری کر رہی ہو۔ بہتر ہے کہ تم دونوں اپنی لمٹ میں رہو، گھریلو معاملات میں مجھے مت ٹھیسو۔ یہ نہ ہو کہ مجھے ماما کو واپس بلانا پڑے۔“

وہ جوس کا بھرا گلاس میز پر پٹختا کھڑا ہو گیا، اس کا اندازہ درست لگتا تھا۔ وہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

”اُم لحد بھر کے لیے ہم گئی، اسے غصہ بہت کم آتا تھا۔“

”کسی کے بارے میں اتنی جلدی حتیٰ رائے نہیں قائم کر لیتے، شی از اسے گڈ گرل۔“

اسے بریف کیس اٹھانے سے پہلے باور کر دانا پڑا۔

”یہ آپ کا سیلف ڈیفنس ہے یا اس کی طرف داری۔“ باہر نکلتے اس نے اپنی پشت پر پیش محسوس کی۔

اس کا جی چاہا کہ مزے اسے کرار اس جواب دیے۔ وہ تکی جلدی ایک جانب ہو گئی یہ شادی کوئی عاشقی معشوقی کے چکروں میں نہیں ہوتی تھی۔

”خدا حافظ۔“ اس نے زوردار آواز میں کہا، مرکزی دروازہ ”ٹھاہ“ سے بند کرتا باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

عمر نے اٹھوڑائی لے کے ٹائلیں بیڈ سے نیچے اتاریں، چنبل پیروں میں اڑس کے، تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کے دونوں پٹ وا کر دیے۔ اس نے پورچ میں نیچے جھانکا جہاں ریاض احمد بار بار گاڑی اشارت کر رہے تھے، گاڑی چل کے نہیں دے رہی تھی۔ وہ جلدی سے کھڑکی کے سامنے سے ہٹا اور سیڑھیاں اترنے لگا، اس کے باہر آنے تک ریاض احمد گاڑی کا بونٹ اٹھا چکے تھے۔

”ہمیں پایا جان! میں دیکھتا ہوں کیا خرابی

ہے؟“ بڑی ہمت سے بچ کر کے وہ آگے بڑھا۔ جتنا وہ ستا چکا تھا اب انزالہ بھی کرنا تھا۔

انہوں نے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ اسے معاف ضرور کر چکے تھے مگر دل و دماغ اس کی طرف سے صاف نہیں تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ انہوں نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ”نہیں تم جا کے نیند پوری کرو پھر کھڑا سانا شتا

کرو، میں خود کچھ لوں گا۔“

”آپ کے ہاتھ کالے ہو جائیں گے۔“ اس نے ہمت نہ ہارتے ہوئے وجہ بتائی۔

بہت برسوں کا حساب اس کی طرف لگتا تھا، جو دکھ وہ انہیں پہنچا چکا تھا۔ اس کی بھرپائی آسان نہیں تھی لیکن وہ ثابت قدمی سے کوشش کرنے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔

”ہاتھ کالے ہو جائیں تو صابن سے دھل جاتے ہیں جو کالک میرے منہ پر لی گئی ہے کسے دھلے گی۔“

عمر کا چہرہ سرخ ہو گیا، کتنا عجیب تھا، اسے لگا جیسے اس کے وجود میں کسی نے تیز دھار خنجر ٹھونسا ہو۔

”کاش میں اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کر سکوں۔“ اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

”مگر تم سے گناہ سرزد ہوئے ہیں اور گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔“ انہوں نے ایک اور نشتر چھوڑا۔

”میں یہ کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔“ اس نے انگلیاں مروڑیں۔

”میں نے سارا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے تمہیں معاف کر دیا ہے، وہ میری یتیم دلیس بھانجی کے ساتھ

زیادتی کرنے والوں سے ضرور بدلہ لے گا۔“ انہیں اس کی موجودگی ناگوار گزر رہی تھی۔

”میں اس سے بھی معافی مانگ لوں گا۔“ بڑی شرمندگی سے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اس کا سامنا کرنے کی،

خود میں ہمت نہیں پاتا تھا، نہ ہی اب تک اس کا ذکر زبان تک لایا تھا۔

”وہ معصوم تمہارے لگائے گئے الزام کو سینے

سے لگائے، اپنے لب سے، کسی سے شکوہ کیے بغیر، اپنے بھائی کے ساتھ بہت دور جا چکی ہے۔“

گاڑی ٹھیک ہو گئی تھی، انہوں نے سر باہر نکال کے بونٹ گر دیا۔

وہ نا بھی سے باپ کو دیکھ اور سن رہا تھا کیونکہ وہ حقیقت سے لاعلم تھا۔

”کچھ گناہ اتنے کبیرہ ہوتے ہیں کہ ہم زندگی بھر ان کی بھرپائی نہیں کر پاتے، جاؤ ڈھونڈ کے لے

آؤ اسے۔ میں بھی مرنے سے پہلے معافی مانگ لوں گا ورنہ روز محشر بہت سے ہاتھ میرے گریبان تک آئیں گے۔“

وہ اس حیرت کے بت کو چھوڑ کے، فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھے۔

ریاض احمد نے ہارن پر ہاتھ رکھا، عمر اپنے حواسوں میں لوٹا راستے سے ہٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح دعا بہت فریش اور ہلکا پھلکا ذہن لیے اٹھی تھی، اس نے تمام اذیت بھرے خیالات ذہن سے جھٹک دیے اور ارادہ باندھ لیا کہ وہ کسی پر بھروسہ اور ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرے گی

تب ہی اس کا اس گھر اور رشتے سے نباہ ممکن ہو سکے گا۔

احسن کبھی بھی مکمل اس کا نہیں ہو سکتا تھا، وہ ایک بنا ہوا انسان تھا۔ انہم کا مضبوط پشت پناہ بھی اسے احسن سے ضرورت سے بڑھ کر توقعات اور لگاؤ نہیں رکھنا چاہیے۔ فل سائز چائے کا گم بنا کے وہ لاؤنج میں ٹی وی لگا کے بیٹھ گئی۔

انہم اپنے کمرے سے باہر آئی تو اسے اتنے آرام دہ انداز میں بیٹھا دیکھ کے سلگ کے رہ گئی۔

”تم نے رات احسن کو بیڈ روم سے کیوں نکالا تھا؟“ وہ اس کے سر پر کھڑی تھی۔ اس سے دعا کا سکون برداشت نہیں ہوا تھا۔

دعا کے تلووں میں گئی سر پر بھیجی۔

”یہ میرا اور احسن کا پرسل میٹر ہے، اپنی پراہلم۔“

دعا نے ٹی وی کا والیوم کم کیے یا اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”تمہارا دماغ بہت آسان پر چڑھتا جا رہا ہے دعا۔“ وہ بد مزہ ہو گئی۔

دعا بولنے نہیں سکی لیکن اتنی تو برا اعتماد وہ تھی کہ وہ انہم کو تیز میں لپٹا جواب دے سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اتنے برس اس کی پرانی دوست رہی تھی۔

”آف کورس، اتنے پنڈم اور رچ پر سٹائی کی وائف ہوں، پراؤڈ ہونا تو بنتا ہے ناں۔“ وہ اسی کے انداز میں کہتی چائے پیئیں۔

”تم اچھا نہیں کر رہی ہو دعا۔“ اس نے نخوت

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست آمنہ ریاض 300/-

بڑا آدمی نسیم سحر قریشی 400/-

فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل 300/-

دل اک گلشن رضیہ جمیل 300/-

سوچ مگر کی رانی رضیہ جمیل 350/-

حتا نادرہ خاتون 550/-

چلن نادرہ خاتون 300/-

بزرگ ناولٹوں کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

32216361 اردو بازار کراچی فون: 37

سے سر جھٹکا۔

”اور جو تم نے میرے ساتھ کیا، وہ کس زمرے میں آتا ہے۔ یہ شادی تمہاری رضا مندی اور فورس کرنے پر ہوئی تھی، میں اور احسن ایک دوسرے میں انٹرنل نہیں تھے۔ نجانے تمہارے دل میں کون سے خدشات بیٹھ گئے ہیں! الو! جو تم مس بی ہو پر اترا آئی ہو، ان تمام میٹرز سے بٹ کے ہم دونوں فریڈ بھی تو ہیں اور اگر تمہیں میرے اور احسن کے ریلیشن سے پرائیم ہے تو اسے اپنے میڈروم تک محدود رکھو، مجھے قطعاً ضرورت نہیں ہے تمہارے احسن کی۔“

دعا اسے بڑی اپنائیت سے سمجھائی، کپ ٹیل پر دھرتی کھڑی ہوئی۔

”یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو دعا! آخر تم چاہتی کیا ہو، ہمارے خاندان میں عورتیں شوہر کے لیے ایک بھی غلط حرف منہ سے نہیں نکالتیں اور تم ہو کہ پڑھے چلی جا رہی ہو۔“ انہم کی کھوپڑی الٹی گھوم گئی تھی۔

وہ تو اس کا دل اپنی طرف سے صاف کرنے کے لیے لفظی — کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اینا سر دیوار پر دیے مارے۔ انہم نے اپنی ایسی ذہنیت بھی ظاہر نہیں کی تھی۔

”مجھے پتا ہے کہ شوہر کی کیسے اور کتنی عزت کرنی ہے، یہ مجھے تم سے سیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ دعا ریوٹ موٹنے پر اچھال کے، اس منظر سے ہٹنے کے لیے بیڑیاں چڑھ گئی۔

تب ہی لینڈ لائن فون کی تیل بجنے لگی، انہم مڑ کر اسٹینڈ تک گئی، یہ فون شاذ و نادر ہی بجتا تھا۔ اس کا شک درست تھا، ہی ایل آئی پر دل آرا کا نمبر تھا، وہ یقیناً دعا کی آواز سننے کی خواہاں تھیں، انہم مسکرا دی، اسے کھینچنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔

☆.....☆

ماں کی زبان سے ساری سچائی سن کے وہ گنگ رہ گیا۔ اس کے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ وہ ساکت

تھا، آنکھیں خشک تھیں اس کی سوچ یہیں تک تھی کہ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی، گھر کے کسی کونے کھدے میں چھپی بیٹھی ہے یا اپنے کمرے تک محدود ہے۔

اس کا فہم تھا کہ چیل میں سزا کاٹ کے مہنا ہوں کا کفارہ ادا ہو گیا مگر اصل سزا تو اب شروع ہوئی تھی۔ امتحان گاہ میں تواب آیا تھا، رابعہ احمد اسے دعا کو ڈھونڈنے کا کہہ رہی تھیں۔ خود کو کوس رہی تھیں پھر وہ اللہ سے اپنی بھلائی اور مغفرت کی دعا مانگنے لگیں۔ دعا کی حفاظت اور عزت و آبرو کی سلامتی مانگتے ان کا دھیان بالکل عمر کی طرف نہیں تھا، جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆.....☆

لینڈ لائن فون کی تیل بجی، انہم تیر کی سی پھرتی سے کمرے سے نکلی اور سی ایل آئی پر نمبر دیکھا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ناہید..... ناہید.....“ اس نے ملازمہ کو آواز دی، اس کا ذہن تانے بانے میں رہا تھا وہ بہت آگے تک سوچنے لگی تھی۔

”فون اٹھاؤ ناہید!“ اس نے سنجیدگی سے حکم دیا۔

اس نے لپک کے فون اٹھایا، انہم کی مٹھوک حرکات اس کی عقل سے بالاتر تھیں۔

”ہیلو..... جی کون؟“ اس نے حسب معمول جملہ دہرایا۔

”کیسی ہو ناہید! میری دعا سے بات کرہ او!“ دل آرانے حال پوچھ کے مطلب کی بات کی۔

گھر میں سیاست چل رہی تھی یا رویوں میں تبدیلی آگئی تھی، ان کی عقل سے سب بالاتر تھا۔

”ٹھیک ہوں بی بی جی! ابھی دعا بی بی کو بلاتی ہوں۔“ ناہید نے کن اکھوں سے انہم کو دیکھتے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ انہم نے اس کے ہاتھ سے

ریسیور تھام کے الٹا رکھ دیا۔

”ناہیجی سے کہو کہ دعا کا جواب ہے کہ وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”جج..... جی بی بی.....“ اس کی زبان لڑکھرائی اور آنکھیں پھیل گئیں۔

وہ گواہ تھی کہ جھوٹ اس خاندان کی سرشت میں شامل نہیں۔

”جو میں نے کہا، تم نے سنا نہیں ناہید!“ انہم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ وہ خاندانی ملازمہ تھی، مالکن کے رحم و کرم پر۔ اس نے تھوک نکل کر ریسیور اٹھایا۔

”جی بیگم صاحبہ! دعا بی بی کہہ رہی ہیں کہ وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔“ ناہید بار بار اسے دیکھتی سب کہہ رہی تھی۔

”کیا اس نے یہ کہا؟“ دل آرا بے یقین ہوئیں۔ جہاں تک وہ دعا کی فطرت کو جانتی تھیں وہ اتنی بدبین نہیں تھی۔

”تم دوبارہ سے جاؤ اس سے کہو میرا حکم ہے کہ فوراً فون تک آئے۔“ ان کا غصہ سوائیز سے پرچھ گیا۔

اس گھر میں کیا چل رہا تھا، کون صحیح تھا کون غلط۔ انہم سے کچھ پوچھنا بے کار تھا، اس کا رونا احسن کے گرد ہی گھومتا تھا، احسن کو وہ اس ساری چپقلش سے دور رکھنا چاہتی تھیں۔ اب کے ناہید نے خود ریسیور الٹا رکھا۔

”وہ بہت غصے میں ہیں، دعا بی بی کو پھر سے بلانے کا حکم دیا ہے۔“ وہ بڑی مشکل میں ٹھنسی لگاتی تھی، ایک مالکن حاضر می دوسری غیر حاضر۔ ایک سیر می تو دوسری سوا سیر۔

”کہہ دو کہ دعا نے دروازہ لاک کر لیا ہے، تمہارے دستک دینے اور آوازیں دینے پر بھی نہیں کھولا۔“

انہم کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس نے چاروٹا چار فون اٹھایا اور گلا کھٹکا را۔

انہم مسکراتی ہوئی مڑ گئی، اسے خود ساختہ انتقام کے علاوہ کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ وہ اس احساس سے بھی عاری ہو چکی تھی اگر اس کا جھوٹ پکڑا گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے ماں کی نظروں سے گر جائے گی۔

☆.....☆

احسن شام کو گھر لوٹا تو انہم نے اسے بڑے خوش گوار موڈ میں پہنی دی۔ اس نے دعا سے ہونے والی گفتگو کا بالکل ذکر نہیں کیا، دعا چکن میں کھانا تیار کر رہی تھی، اس نے سب کچھ شوہر کا من پسند بنایا تھا۔ احسن اسے چکن میں کام کرنا دیکھ کے مطمئن ہو گیا، ملازمہ کے ساتھ مل کے اس نے ٹیل لگائی۔ ڈزرتیوں نے ساتھ بیٹھ کے کیا۔

دس بجے کے بعد جب وہ کمرے میں آیا تو وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری دعا؟“ اس نے تمہید باندھی۔

”بہتر ہوں۔“ اس نے کتاب بند کر کے مختصر جواب دیا۔

وہ گزرے وقت کی رخش دل میں نہیں رکھنا چاہتی تھی حالانکہ اسے احسن کی ایک طرف گفتگو نے گہرا دکھ دیا تھا۔

”کتاب پڑھ رہی تھیں؟“ اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”جی، آج ہی شروع کی ہے۔“ اس نے نظریں جھکائے جواب دیا۔

”دن بھر کیا کرتی ہو؟“ وہ اس کے قریب تک گیا۔

”کچھ خاص نہیں، کتاب پڑھنا، ٹی وی دیکھ لیا یا پھر چکن۔“ اس نے صاف بتایا۔

”ہماری شادی کی وجہ سے، تم دونوں کی مثالی دوستی دشمنی میں بدل گئی ہے ورنہ تمہارے آنے سے انہم بہت ریلیکس اور خوش ہو گئی تھی۔ تم دونوں کے پاس ڈھیروں قصے ہوتے تھے اور اب.....“ اسے



ماہنامہ شعاع مارچ



کیا۔

”پتا نہیں جی، ہاتھ میں چھوٹا سا پلاسٹک بیگ تھا، دعا صاحبہ کے کمرے میں گئے اور چند منٹ بعد ہی واپس بھی چلے گئے۔“ اس نے اپنی معلومات — دیں۔

وہ مزید تجسس لیے دعا کے کمرے کی طرف بڑھی۔

”دعا۔“ اس نے آواز دیتے دروازہ کھول دیا۔ ”ابھی احسن کیوں آئے تھے؟“ لہجہ سخت نہیں مگر خشک تھا۔

”وہ مجھے یہ موبائل دینے آئے تھے۔“ اس نے خوشی سے موبائل والا ہاتھ آگے کیا۔

”موبائل۔“ وہ حیرت سے نگاہ گئی۔

”یہ گفٹ وہ خود لائے ہیں یا تم نے منگوا یا ہے۔“

”گفٹ“ کا لفظ استعمال کرتے اسے سخت تکلیف ہوئی تھی۔

”یہ گفٹ مجھے احسن نے نہیں، آنٹی جان نے دیا ہے۔“ دعا نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔

”ماما نے۔۔۔۔۔“ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”تمہاری ماما جی سے بات ہوئی تھی۔“ اس نے اپنا خشک دور کرنا چاہا۔

”ہاں رات احسن کے سیل پر۔“ وہ بے خبری میں سب بجاتی گئی۔

”اُمم واپس مڑنی اب مزید کچھ نہیں تھا پوچھنے کو۔“

☆ ☆ ☆

”اُمم نے بال بٹاکے، پہلا کام دل آرا کو کال کی، نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے جھنجھلا کے موبائل کان سے ہٹایا، احسن کے ساتھ بات کرنا مناسب نہیں تھا، وہ بھی انجان تھا۔

”اُمم کے ذہن میں دوسرے آرہے تھے اگر اس کی چوری اور جھوٹ پکڑا گیا تو۔۔۔۔۔

دوسری طرف دعا کو ایک گھنٹہ بعد پہلی کال دل آرا کی موصول ہوئی تھی۔

”السلام علیکم آئی جی! میں بہت شدت سے آپ کی کال کا انتظار کر رہی تھی۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”وعلیکم السلام! جیتی رہو، میرے دل نے بھی تمہاری نکالاری کی اور شاؤ کیسی ہوا اور کیا کر رہی ہو؟“

ان کے لہجے میں شیرینی چھلکی تھی۔

”بہتر ہوں اور فی الحال فارغ، رات کا کھانا بنانے کی ذمہ داری میری ہے تب مصروف ہوتی ہوں۔“ اس نے بڑے عام سے انداز میں اپنی روشنی بتائی۔

”کیا مطلب ذمہ داری۔۔۔ کیا تم ڈیلی کھانا بناتی ہو؟“ انہیں اچھا خاصا جھجکا لگا۔

”جی، جب آپ یہاں تھیں تب بھی میں ہی بناتی تھی۔“ وہ ہنسی میں کہہ گئی۔

”پہلے کی بات اور بھی دعا! اب تم احسن کی بیوی ہو اور شادی کو دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ تم شام کو فریش ہو کے اسے پہنی دیا کرو، آپس میں مل جل کے بیٹھا کرو۔ اُمم کیا کرتی رہتی ہے دن بھر؟“ آخری سوال انہوں نے بڑے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”وہ بھی کچھ خاص نہیں، بس یوں ہی۔۔۔۔۔“ اس نے گول مول سا جواب دے دیا، وہ اب نہیں کیا بتاتی، وہ اُمم کی ساس کے علاوہ ماں بھی تھیں۔

”سنو دعا! میرے ساتھ جھوٹ نہیں بولو، جو ج ہے وہ ہنا جھجکے بتا دو۔ میں اگر وہاں موجود نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم دونوں آپس میں لڑتی مرنی رہو اور میرے بیٹے کو پریشان کرو۔“ انہیں غصہ چڑھ گیا۔ اُمم کا غصہ وہ اس پر نکال رہی تھیں۔

”بھڑا آنٹی! میرا قصور یہی ہے کہ میں مسز احسن ہوں مگر اُمم۔۔۔ وہ بہت بدل گئی ہے اس کے رویے میں میرے لیے نرمی اور دوستی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اپنے کمرے میں مسمی رہتی ہے، دل چاہے تو لڑکتی ہے ورنہ نہیں۔۔۔ اور بھی بہت کچھ ہے جو میں شیر نہیں کرنا چاہتی مگر پلیز۔۔۔ پلیز آنٹی جان! آپ واپس لوٹ آئیں۔ آپ کی موجودگی، رہنمائی اور

سرپرستی ہی اس رشتے اور گھر کو بچا سکتی ہے۔“ اس نے تم آواز میں انہیں اشارتاً بہت کچھ بھجوا دیا تھا۔

دل آرا کا دماغ اور کان سائیں سائیں کرنے لگے، غلط دعا کی رپورٹ نہیں اُمم تھی۔ دعا جھوٹ نہیں بول رہی تھی، انہیں اپنی بیٹی سے ایسی بچہ حرکات کی توقع نہیں تھی۔

”میں خود چاہتی تھی کہ سب سیٹل ہونے تک تم لوگوں کے پاس ٹھہروں لیکن میری مجبوری تھی۔ میں جلدی آخری کو ابھی تک انعام نہیں کر پائی۔ انہیں اُمم سے بہت محبت اور لگاؤ ہے، آئی ڈونٹ نو، وہ کیسے ری ایکٹ کریں گے پھر وہ ہارٹ اور کولیسٹرول کے مریض ہیں ان کی بھی کیئر کرنی ہے۔“ وہ بھی بہت دل گرفتہ ہو گئی تھیں۔ ان کا اُمم پر شک یقین میں بدل گیا تھا۔

”تو پھر آنٹی میں کیا کروں؟“ وہ ہمدرد پا کے رو ہنسی ہو گئی۔

”صبر کرو میری جان! آئی نو ویل کہ انو غیر مستقل مزاج ہے مگر وہ اپنی جلد اور بدگمان لنگے کی میں نہیں جانتی تھی حالانکہ میں بہت اچھی طرح سے اس کی برین واشنگ کر کے آئی تھی۔“ دل آرا کو خود تشویش لاحق ہو گئی تھی، انہیں معاملے کی نزاکت کا خیال تھا لیکن وہ دعا کو صرف دلاسا ہی دے سکتی تھیں۔

”میرا دل بہت گھبراتا ہے آنٹی! اُمم کا بدلتا روپ، مجھے ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں اور احسن بہت محتاط رہتے ہیں، ابھی اس کے سامنے ایک دوسرے کو مخاطب بھی نہیں کیا۔ وہ میرے بیڈ روم میں نہ آئیں، میں تب بھی گلہ نہیں کرتی کیونکہ میں اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہوں کہ ان پر زیادہ حق اس کا ہے۔ ان کی خاندانی بیوی، محبت اور بچپن کی ساتھی اور کزن ہے، میں تو بے سہارا تھی، میرا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ آپ لوگوں نے مجھے پناہ دی، نام اور رہنے کو چھت دی، میں آپ سب کی احسان مند ہوں، اس سب کے باوجود وہ مجھ سے ان سیکورٹیل کر رہی

ہے۔“ اس کے اندر کے غبار کو نکاس کا رستہ ملا تھا، وہ سب احسن سے شیر کر لیتی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر دل آرا اپنی فہم کے رستے اس کے لیے آسانیاں پیدا کر سکتی تھیں۔

”تم بس خاموش رہا کرو، اس کی بدزبانی کا برابر جواب نہ دیا کرو اگر تم بھی مقابلہ کرو کی تو دونوں میں فرق کیا رہ جائے گا۔ ان شاء اللہ وہ بھی آہستہ آہستہ بہتر ہوتی جائے گی، ابھی نیا نیا بٹوارہ ہے پھر اس میں برداشت کی بھی کمی ہے۔“

دل آرا اسے ہی سمجھا سکتی تھیں، وہ کمزور مہرہ تھی۔ اگر وہ یہ سب اُمم سے کہہ دیتیں تو وہ اودھم مچا دیتی، خود تری کا شکار ہو جاتی، اسے اپنی حیثیت ماند پڑتی نظر آتی۔ وہ خود سے کتنے ہی اندازے لگا کے سب کا جینا بحال بنا دیتی۔

”اچھا آنٹی! فون رکھتی ہوں۔“ دعا نے بہت برے دل سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کا چہرہ اداس اور سوگوار تھا۔

ہر ایک اسے ہی صبر کا درس دیتا تھا، اس کے دل میں شیسیں سی اٹھنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

ریاض احمد ہلکی مدھم روشنی جلائے ایزی چیئر پر جھول رہے تھے۔ لان میں دونوں فیملیز جمع تھیں سوائے ان کے، راجہ احمد نے بہت عرصہ بعد خاص اہتمام سے دعوت کی تھی۔ مہم بھی مدد کر رہی تھی، زین عروہ اور نوال موبائل پر ٹیم کھیل رہے تھے۔

عمر نے ایک طرف باری کیو کے لیے آگ جلائی ہوئی تھی وہ اور الیاس احمد سنج کباب بھون رہے تھے۔ ٹیبل لان میں سیٹ کی گئی۔ ملازمہ مریم کی تقلید میں فنی برتن احتیاط سے ٹیبل پر سیٹ کر رہی تھی۔

وہ چیئر سے اٹھ کے کھڑکی تک آئے، لان کا منظر بلاشر خوب صورت تھا مگر انہیں نامکمل سا لگا۔ کہیں کچھ کمی تھی یا صرف انہیں ہی محسوس ہو رہی تھی یا پھر کوئی اور بھی تھا۔ جو ان سب کے بچہ بچہ بھی ذہنی طور پر حاضر نہیں تھا، جس کے ہونٹ ہلکی سی اداس

مسکراہٹ کا گھبراہٹ کیے تھے۔

وہ بھی نوال کے پکارنے پر عروہ اور زین کی دھاندلی کا جھگڑا مٹاتا، عمر کی پکار پر اس کا کباب چیک کر کے داد دیتا اور بھی ماں کی پکار پر پھیل کھینچتا، جیسریت کرتا، اپنا دل بھلرا ہوا تھا۔

یوں ہی دھیان اور بے دھیانی میں ان دونوں کا دل اس سہری سی لڑکی میں جا لگتا۔ کیا ہنسی اس کے ہونٹوں پر بکھرتی ہوگی؟ اس کا دل بھی سرور و مطمئن ہوگا، راجہ احمد دروازہ دھکیل کے اندر آئیں۔

”ریاض! کمرے میں اندھیرا کیوں ہے؟“ انہوں نے سوچ چورڈ سے پاور لائٹ آن کی۔ ”بس یوں ہی، طبیعت ٹھیک نہیں۔“ ان کا انداز بھی ست تھا۔

”کیا ہوا طبیعت کو، کہیں درد وغیرہ تو نہیں ہو رہا؟“ وہ فوراً پریشان ہو گئیں۔ ”نہیں..... نہیں، آئی ایم ٹاٹ فینکٹ بیٹر۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر جا بیٹھے۔

”آپ باہر آئیں سب کے سچ، دیکھیں، کتنی رونق لگی ہے، سب جمع ہیں ان کے ساتھ بیٹھیں، دل خودی بہل جائے گا۔“ انہوں نے اپنے تئیں مفید مشورہ دیا۔

وہ کچھ بول کے راجہ احمد کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے چپ سادھ لی۔ ”نہیں، میں تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں، شور شرابے سے میرا دل گھبرانے لگے گا تم لوگ انجوائے کرو، میں نیند لوں گا۔“

وہ کہتے ہوئے لیٹ گئے۔ وہ شوہر کے مزاج سے واقف تھیں، اس انکار نے اقرار میں نہیں بدلنا تھا۔

”آپ بڑے ہیں، آپ کی موجودگی ہے تو خاندان مکمل لگے گا ورنہ سب بہت اداس ہو جائیں گے۔“ ایک آخری کوشش کی گئی۔

”جاتے ہوئے لائٹ اور دروازہ بند کر جانا۔“ انہوں نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا، راجہ احمد تاسف

سے سر ہلاتی واپس مڑ گئیں۔

☆ ☆ ☆  
احسن کی واپسی پر ایک طوفان اس کا منتظر تھا، انہم نے دوبارہ دل آرا گو کال کی اس بار بھی نمبر بڑی جارہا تھا، اس نے بیچ بھی چھوڑا لیکن انہوں نے اسے کال بیک نہیں کی۔

جس سے انہم کے دل میں شک مزید گہرا ہو گیا، اب اسے احسن کی واپسی کا انتظار تھا۔ ”السلام علیکم!“ وہ سیدھا اس کے پاس ہی آیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ موبائل کو لے کر وہ ناراض ہوگی۔

”تم آج آئے اور مجھ سے ملے ہی نہیں۔“ وہ سلام کا جواب دیے بغیر جرح پر اتر آئی۔ احسن نے بریف کیس رکھا، اسے انہم کے تاثرات چھوٹکا گئے۔ اس نے بات بڑے طریقے سے شروع کی تھی۔

”میں دعا کو موبائل دینے آیا تھا، آفس میں ضروری کام تھا اس لیے جلد لوٹ گیا۔“ وہ اس کے تیور برداشت کرتا جو کچھ تھا وہ بولا تھا۔

”پہلے ضروری کام پتلا لیتے، سب چھوڑ چھاؤ کے موبائل کا نذرانہ پیش کرنا ضروری تھا۔“ اس نے دانت پیسے۔

احسن نے پہلی بار اس سے پوچھے یا بتائے بغیر کوئی کام کیا تھا۔ وہ بھی اپنی دوسری بیوی اور اس کی سوتن کے لیے۔

”میری ماں کا حکم تھا، اس لیے سب چھوڑ چھاؤ کے نذرانہ دینے آنا پڑا۔“ اس نے انہم کی آنکھوں میں جھانک کر کہا اور ٹائی کی ٹاٹ ڈھیل کرنے لگا۔

”اسے موبائل کی کیا ضرورت ہے، ماما جی میرے اور تمہارے نمبر پر بھی اسے کال کر سکتی ہیں، لینڈ لائن بھی ہے۔“ اس نے نیا کتہ نکالا۔

احسن سے لڑنے کی تنگ نہیں بنتی تھی کیونکہ اس نے یہ حرکت اپنی مرضی اور دعا کی خواہش پر نہیں کی تھی۔

”آئی تھنک یہ سوال ماما جان سے پوچھنا، وہی سچ سے وجہ بتا سکیں گی۔“ وہ جوتے اتار کے واش روم کی طرف بڑھا۔

”چلو، یہ میں ناما سے پوچھ لوں گی، یہ بتاؤ اتنا مہنگا موبائل کیوں لا کر دیا؟“ اس نے ایک نیا مخالف پوائنٹ نکالا جس میں زیادہ قصور احسن کا تھا۔

”کیونکہ میرا جمیر اور حیثیت مجھے اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنی بیوی کے لیے کوئی گھٹیا کوالٹی کی چیز خریدوں۔“ وہ جو واش روم میں ٹھس گیا تھا، دروازے میں رک کر مڑ کر جواب دیا اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔ انہم نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔

☆ ☆ ☆  
”میں آپ سے سخت ناراض ہوں ماما!“ انہم نے بڑے لاڈ سے گلے کیا۔

اس نے خودی کال کی تھی، رات احسن دعا کے پاس سویا تھا، صبح انہم نے اسے ناشتا۔ بھی نہیں بنا کر دیا۔

”ناراض تو میں بھی تم سے بہت ہوں لیکن پہلے تم بتاؤ۔“ دل آرا سمجھ گئی تھیں، اس لیے پہلے اسے بولنے کا موقع دیا۔

”آپ نے دعا کو موبائل گفٹ دیا ہے، وہ بھی مجھے بتائے یا مشورہ کیے بغیر۔“ دل کی چھین ٹوک زبان پر آ گئی۔

دوسری طرف دل آرا تھیں، اس کی رگ رگ سے واقف، اسے کب اور کس طرح ہینڈل کرنا ہے جانتی تھیں۔

”تو کیا ہوا؟ ایک معمولی سا موبائل ہی گفٹ کیا ہے، وہ بھی تمہاری وجہ سے۔“ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف کہہ ڈالا۔

”میری وجہ سے کیوں؟ میں نے کیا کیا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تم نے میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا انہم! احسن کی ہم نے دوسری شادی مجبور کی ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میری نظروں میں تمہاری اہمیت گر گئی ہے

اور اس اہمیت کو بڑھانے کے لیے تم جھوٹ کا سہارا لینے لگی ہو۔“ دل آرا کو بے حد افسوس ہو رہا تھا۔

اگر وہ پہلے ہی موقع پر خاموش رہ جائیں تو انہم کو مزید جھوٹ ملتی اسے پہلے ہی قدم پر ٹوٹنا اور غلطی کا احساس دلانا ضروری تھا۔

”کک..... کیسا جھوٹ؟“ انہم کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے سب بہت احتیاط سے کیا تھا، اس کی زبان الفاظ ادا نہیں کر پاتی تھی۔

”کیا تم منکر جاؤ گی کہ تم نے ناہید سے جھوٹ بولا۔“ دل آرا کا جی چاہ رہا تھا کہ اس غلط بیانی پر وہ ان کے سامنے ہوتو پھڑکادیں۔

”نن..... نہیں ماما جی.....“ اس کی زبان ہکلا رہی تھی، مزید جھوٹ کھڑا نہیں جا رہا تھا، سچ بتانا بے وقوفی تھی۔

”آئی ایم سوری!“ دل آرا کی خاموشی نے اس سے مبہم سا اعتراف کروالیا۔ وہ کیسے بھول گئی کہ وہ اس کی رگ رگ سے واقف ہیں۔

”تم کیوں اتنی چپ کر رہی ہو انہم! احسن کو انگلیزن اسٹڈیز کے لیے بھیجنے پر راضی نہیں تھی، تمہیں اس پر بھر دسا تھا تم ہی نے مجھے فورس کیا تھا۔

احسن جب سوچتا تھا تم گھر میں ذرا بھی شور نہیں ہونے دیتی تھیں اور آج تم خود اس کا ڈنڈی سکون برپا کر رہی ہوگی۔“ وہ غصے میں بولتی ہی چلی گئی تھیں۔

والدین اور شوہر سے جھوٹ۔ بولوگی، ہمیں دھوکے میں رکھوگی۔“ وہ غصے میں بولتی ہی چلی گئی تھیں۔

انہم کے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا، وہ کیوں بھول گئی تھی کہ انہیں دھوکے میں رکھنا اتنا آسان نہیں، انہوں نے اسے جنم نہیں دیا تھا پالا تو تھا۔

”میری بات غور سے سنو انہم! احسن کی دوسری شادی اس کی رضا مندی یا پسند کی نہیں ہے نہ ہی دعا کو اس میں اثر سٹ ہے۔ یہ قدم ہم نے اپنی غرض اور وارث کے لیے اٹھایا ہے، اس میں تمہاری بھی رضا مندی شامل تھی۔ یہ واحد فیصلہ جو میں نے اپنے بیٹے

کے لیے لیا ہے، مجھے اپنے اس فیصلے پر کوئی بچھڑانا نہیں، اپنے حواس پر قابو رکھو اور دماغ کا استعمال کم کرو۔ احسن خوش خبری آ جانے تک دعا کے پاس ہی رہے گا، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ ان کا لہجہ اہل تھا انہوں نے جھوٹ کی سزا سنائی تھی۔  
”جی نہیں۔“ اس کی چٹکی چٹکی آواز برآمد ہوئی۔

”تینوں شام کو مل کے چائے پیو، گپ شپ کرو، رشتوں کا احترام کرو۔ محبت سے پیش آؤ، کوئی عمر یا رشتے میں بڑا ہونے سے بڑا نہیں بن جاتا بلکہ انسان کا اخلاق اس کا وسیع ظرف، انسان کو بڑا بناتا ہے۔ مجھے تم سے اچھی توقعات ہیں اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی اور آئندہ شکایت کا موقع بھی نہیں دو گی، اللہ حافظ۔“  
انہوں نے ابھی خاصی سنا کے فون بند کر دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ انم کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ بھی نہیں۔

☆.....☆

اگلے تین روز دعا اور احسن کی زندگی کے خوش گوار دن تھے، انم نے ہر قسم کا اعتراض نہ کیا، چینی، روک ٹوک اور طنز وغیرہ کرنا ختم کر دیا تھا۔ وہ دونوں شام کو انم کی احسن کے ساتھ لان میں چائے پیتیں۔ روزمرہ کی باتیں، پرانے قصے، دعا مسکرا دیتی یا زیادہ خوش نظر آتی تو انم ایک دم سے خاموش ہو جاتی۔ اس کی چہرے پر بے سکونی، بوریت اتر آتی، دعا اسے مخاطب کر لیتی تو جواب دے دیتی ورنہ چپ چاپ بڑی راتیں۔ ایک جگہ، ایک ہی پوزیشن پر بیٹھے اسے گھنٹوں گزر جاتے۔

دعا کو اس کی حالت برتر آتا، اس نے احسن سے بھی ذکر کیا، اس کا خیال تھا کہ وہ خود ہی آہستہ آہستہ ایڈجسٹ کر لے گی۔ وہ خود ہی اس کے کمرے میں، اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتی، وہ دعا کے مسلسل بولنے سے اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو کر، پہلے جیسی انم بن جاتی۔ یہی موقع تھا، دعا اس پر واضح

کر دیتا جا رہی تھی کہ وہ اس کے متعلق متقی سوچتی ہے، وہ اب بھی اس کی بہترین دوست ہے۔ اس کا ہر کہا اور فیصلہ اس کے لیے مقدم ہے، وہ اس کے لیے قابل احترام ہے اور وہ انم کی احسان مند ہے، وہ خوش تھی کہ انم نے اپنی ذہنی اختراع والے سارے اخلاقیات ختم کر دیے تھے۔

احسن بھی انم کو زیادہ وقت دیتا، ناشتا ہی سے فرمائش کر کے بنواتا۔ آفس ٹائمگ میں چار، پانچ بار اسے ضرور کال کرتا۔  
دعا اسے مجبور کر کے انم کے بیڈروم میں بھی بھیج دیتی حالانکہ دل آرانے احسن کو سختی سے منع کر رکھا تھا۔ دعا نے یہ حقیقت ان سے چھپائی تھی، دعا نے انم کے بدلاؤ کا ذکر، بڑی خوش دلی سے انہیں بتایا تھا۔ دل آرا بھی اسے دل سے معاف کر چکی تھیں لیکن ان سب کو انم کی خاموشی اور برداشت بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔

☆.....☆

احسن آفس سے آ کے سیدھا انم کے بیڈروم میں گیا، فریش ہو کے وہ دونوں لاؤنج میں آ گئے۔ شام کی چائے اور فرمائش لوازمات دعا ہی بناتی تھی، آج بن خالی تھا۔  
”دعا کدھر ہے؟“ صوفے پر بیٹھے اس نے انم کو دیکھا۔

”شاید اپنے روم میں ہو، آج وہ میرے پاس بھی نہیں آئی۔“ وہ پھر کونا ہیڈ بتا رہی تھی کہ اس نے سچ بھی نہیں کیا، ”انم نے ذرا سوچتے ہوئے اسے بتایا۔  
”تمہیں اس کی خبر تو لینی چاہیے تھی۔“ وہ فوراً اٹھا اور اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، انم نے بھی اس کی تقلید کی۔ کمرے میں اندھیرا تھا، دعا لیٹی ہوئی تھی۔

”دعا..... دعا.....“ انم نے اسے پکارتے لائٹ آن کی۔  
دعا کاہلی سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی، لائٹ کی تیز روشنی کی چھین پر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ

”آر یو اوکے، دعا“ وہ اس کے نزدیک پہنچا۔  
”صبح ناخستے کے بعد سے طبیعت بہت بوجھل اور عجیب سی ہو رہی ہے۔ سراجا بھاری ہے کہ اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہا، پلیز انم! یہ لائٹ بند کرو۔“ اس نے سر گھٹنوں میں دے لیا۔

”تم نے مجھے بتایا ہوتا، میں ڈاکٹر کو کال کر دیتی۔“ انم نے احسن کو دیکھتے اپنا بھاد کیا۔  
وہ چپ تھا، انم کے سامنے اپنی تشویش ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ وہ اس کی فکر کو محبت کے زمرے میں رکھ لیتی۔

”میرا اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا، بہت بھاری پین سا محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ رو دینے لگی۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل اور رگت زرد تھیں۔  
”انم تم اسے چیخ کر دو، میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔“ احسن موبائل پاکٹ سے نکالنا باہر نکل گیا۔  
انم اسے اٹھنے میں مدد دیتی داش روم میں لے گئی۔

☆.....☆

چالیس سالہ ڈاکٹر نے دعا کا پی پی اور نبض چیک کرنے کے بعد، بیڈ اور پیچ پکڑے، کافی دیر سوچتے ہوئے بغور دعا کا بھی جائزہ لیا۔  
”یہ خاتون میری ہیں۔“ اس نے اندازہ لگایا۔

”ہی!“ انم فوراً بول پڑی۔  
”میں نے یہ میڈیسن لکھ دی ہیں، کچھ لائٹ سا کھلا کے انہیں دودھ کے ساتھ دیں اور صبح ضرور انہیں کسی اچھے گائنا کولو جسٹ سے۔ چیک اپ بھی کروائیں، مجھے معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔“  
آخری جملہ ڈاکٹر نے احسن کو نسخہ پکڑاتے آہستگی سے ادا کیا۔

”معاملہ.....؟“ احسن نے دہرایا۔  
”گائنا کولو جسٹ.....؟“ انم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“ انم پر جوش اور بے یقینی تھی۔  
دعا انکیشن کے زیر اثر پرسکون ہوئے آنکھیں موند چکی تھی۔

”میں کچھ بھی حتمی نہیں کہہ رہا، اپنا شک ظاہر کر رہا ہوں۔ آپ کل ان کا ٹیسٹ کروائیں کفرم ہو جائے گا۔“ انم کے مسکراتے ہونٹ اور چمکتی آنکھیں باند پڑ گئیں۔

☆.....☆

ڈاکٹر اپنا بیگ اٹھا کے باہر کی طرف بڑھ گیا۔  
بہت بنا احسن اس کے پیچھے لگا۔

☆.....☆

ڈاکٹر کے لگائے گئے انکیشن اور میڈیسن لے کر دعا پرسکون نیند سو گئی۔ احسن اور انم وہیں صوفے پر بیٹھے خوشی و مسرت سے باتوں میں من رہے۔ انہیں ذہنی رات کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔  
”تمہیں لگتا ہے کہ رپورٹ پازیو آئے گی۔“ اس نے انم سے تصدیق چاہی۔

”آف کورس، کیونکہ میں بھی دو تین روز سے دعا کی طبیعت گری گری محسوس کر رہی تھی جو اللہ کو منظور، ہم دعا کر سکتے ہیں۔“ انم بے یقینی تو تھی مگر قبل از وقت امید نہیں باندھنا چاہتی تھی۔

”تم کل ناخستے کے بعد دعا کو ڈاکٹر باہرہ کے کلینک لے جانا، سلی سے چیک اپ کروانا۔ اگر میری ضرورت پڑی تو میں بھی جوائن کر لوں گا۔“

احسن کا دل بلبوں اچھل رہا تھا لیکن انم پر ظاہر کرنا بے وقوفی تھی پھر ابھی کچھ کفرم بھی نہیں تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خود دعا کو ڈاکٹر کی پاس لے جائے مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ وہ خوشی کے نلے سے مل ہی اسے ملایا یہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔  
”ڈونٹ وری، میں سب ہینڈل کر لوں گی۔“

وہ دعا کی نیند کے خیال سے آہستہ سے بولی۔  
”اس کی میڈیسیز، پریزور وغیرہ اور ڈائٹ میں کیا لے، ہر چیز اچھی طرح سے پوچھ کے آنا۔“



احسن کو اس کی حالت پر افسوس تھا، وہ انعم کو دل میں مٹی بار کال کر لیتا تو دعا کے پاس بھی موبائل تھا تب بھی اس نے ایک بار بھی اسے کال نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن تکلیف میں رہی تھی۔ انعم کی لاپرواہی کی حد تھی، اس نے دعا کے بیڑوم میں جھانکا تک نہیں اور نہ ہی اس کے بچنے نہ کرنے کا ٹوس لیا اس سب کا ذمہ دار وہ خود کو ٹھہرا رہا تھا۔

احسن بڑے غور سے سوئی ہوئی دعا کو دیکھ رہا تھا۔

”کتی کمرور لگ رہی ہے ناں۔“ وہ کھوسا گیا۔ انعم اس کے چہرے پر سے نظریں پٹانہ پانی، وہ اس کے ماتھے پر پڑے پر نظر بلوں کو گنتے گی۔ وہ خوش تھا، اس سے دعا کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں مگن مسئلہ تب ہی پیدا ہوتا تھا جب احسن کی آنکھوں اور لہجے میں دعا کے لیے فکر یا سانس چمکتی تھی۔

انعم کو لگتا کہ وہ دو حصوں میں بٹ رہا ہے، اس کی تقسیم بہت بھاری تھی۔ اس مرحلے پر اس کا حوصلہ، ہمت، خود کو پڑھانے گئے صبر و برداشت کے تمام اسباق جواب دینے لگتے۔ احسن کی زبان سے ماں کے بعد اس نے صرف اپنا نام، ذکر، فکر، تعریف، محبت اور لڑائی جھگڑا سنا تھا۔ اس کا ہر تعلق اور رشتہ اسی سے خشک تھا۔ اب اس میں دعا بھی حصے دار بنتی جا رہی تھی، اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

”ماما جان! بابا جان تیار نہیں ہوئے۔“ آفس کے لیے تیار غمیر نے کرسی چھیٹے پوچھا کیونکہ ان کی کرسی خالی تھی۔

”تمہارے بابا جان کو رات ہارٹ پین ہوئی تھی، کافی دیر جاگتے رہے۔“

”آپ مجھے چکا لیں، میں انہیں ہسپتال لے جاتا۔“

”غیر کو سب کی فکر ایک ساتھ تھی۔“

”انہوں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔“

”آپ مان گئیں، خدا خواستہ کوئی سیریس۔“

غیر سلاکس واپس رکھ کے تیری سے بولا۔ اسے باپ

کے معاملے میں ذرا سی بھی لاپرواہی برداشت نہیں تھی۔ عمر جو نیوز پیپر کھولے ہیڈ لائنز پڑھ رہا تھا، وہ بھی متوجہ ہوا۔

”ڈونٹ وری! اباؤٹ ہم، وہ ٹھیک ہیں۔ ابھی سو رہے ہیں، میں نے ڈاکٹر کو کال کر دی ہے، وہ آ کے ان کا سلی سے چیک اپ کر جائے گا۔“ انہوں نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

”اچھا، میں فکٹا ہوں۔“ وہ ٹیبل پر پڑا موبائل اٹھا کے کھڑا ہو گیا۔

”بیٹا ناشتا تو کرتے جاؤ۔“ ماں نے اسے ٹوکا۔

”آفس میں بہت زیادہ کام ہے، اسلام آباد سے ڈیلی میٹین آنا ہے، دو ایپلائرز کو فائر کر دیا گیا ہے، باخدا آج کوئی لیو پر نہ جائے۔“ ماں کو سب بتاتا وہ باہر کو دوڑتا گیا۔

عمر ٹیبل کی سطح کو کھرچتے کچھ سوچنے لگا۔

☆ ☆ ☆

دعا کو صبح انعم اس کے کمرے میں بہت نرمی، محبت اور دوستانہ انداز میں جگانے آئی تو وہ حیران رہ گئی۔

پھر ناشتے کی ٹیبل پر انعم نے اسے رات ڈاکٹر کا شک بتایا۔ دعا بے یقین تھی بھلا اتنی جلدی یہ سب مگر وہ خاموش رہی۔ انعم اتنی خوش تھی کہ مسلسل خود سے بولے جا رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اسی خاموشی سے گانا کو لو جھٹ کے پاس آگئی تھی۔

دعا کے میٹ ہو گئے تھے ڈاکٹر ماہرہ رپورٹ لینے گئی تھیں۔ دعا اور انعم کے لیے انتظار کا ہر پل سچی میں بسنے کے برابر تھا۔ انعم اضطراب کی کیفیت میں بار بار موبائل اسکرین کو دیکھتی، کبھی ٹیبل پر پڑے اوراق سے جھپیر چھا کر کرنے لگی۔ رات سے لے کر اب تک اس کا ہر عضو انتظار تھا۔

احسن، دعا کے ساتھ بیڑ پر بیٹھا تھا مگر اس نے وہیں صوفے پر بیٹھے رات بتا دی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں بہت سی متضاد کیفیات چل رہی تھیں وہ

ظاہر خوش تھی مگر دل کے کسی خانے میں دکھ کی چھین بھی واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنی تمام تر کوشش کر کے خوش ہونا چاہتی تھی۔

”مبارک ہو مسز احسن! آپ کی یہ کزن پریکٹس ہیں۔“ ڈاکٹر مائرہ اسے مژدہ روح افزا سناٹی آرہی تھیں۔ دعا حیرت و بے یقینی میں گھری ڈاکٹر کے ہلنے ہونٹ دیکھتی رہ گئی۔

”آپ..... آپ.....“ انعم کے منہ سے الفاظ لکنا مشکل تھے، وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔

”جی میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔“ ڈاکٹر مائرہ نے اس کا دھورا جملہ پورا کیا۔

”مبارک ہو دعا..... بہت بہت مبارک ہو۔“ انعم نے اسے بھی زبردستی کھڑا کر کے خود میں بچھ لیا۔

”آئی ایم سو پیسی!“ اس نے دعا کو خود سے الگ کیا۔

”احسن بھی بہت..... بہت خوش ہوں گے۔“ اس نے کہا کہ دعا کو کچھ سے گلے لگالیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا یہیں بھگڑا ڈالنا شروع کر دے۔ اسے بچی دعا کے ہونٹ بھی ذرا سامنا کا دیے۔

”تھنک یو۔“ وہ یہی کہہ پائی۔

”یہ تیس مسز احسن!“ ڈاکٹر نے انعم کی طرف پرچہ بڑھایا۔

”انہیں کمزوری بہت زیادہ ہے، یہ میڈیسنز ریگولر یوز کرنی ہیں۔ دودھ کا گلاس صبح و شام ڈیلی، پھل اور گوشت کا استعمال بھی لازمی کرنا ہے۔ ڈائنٹ اور میڈیسن ماں اور بچے کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے، اب پندرہ دن بعد چیک اپ کے لیے آئے گا۔“ انہوں نے ساری ہدایات تفصیل سے بتا دیں۔

”تھنک یو ڈاکٹر مائرہ! میں اس کا ہر ممکن خیال رکھوں گی، چیک اپ کے لیے بھی ضرور لاؤں گی۔“ انعم نے مسکراتے شکر یہ ادا کیا اور اٹھ گئی، دعا نے بھی تقلید کی۔

☆ ☆ ☆

احسن کی ساری توجہ فائل پر مرکوز تھی، موبائل کی بیل ہوئی تو اس نے پین روک کے موبائل اٹھالیا۔

”ہیلو.....“ وہ کرسی کی پشت سے ٹکا۔

”مبارک ہو احسن!“ انعم اور دعا گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی تھیں۔ گاڑی اشارت ہوتے ہی اس نے احسن کو کال کر دی تھی۔

”تم سچ کہہ رہی ہو ناں انعم!“

اس کا ہر ہر عضو اس خوش خبری کو سننے کا منتظر تھا۔ اس نے خود پر بہت ضبط کا پیرہ بٹھا کے انعم کو کال نہیں کی تھی۔ وہ پل میں تولیہ پیل میں ماش بن جاتی تھی۔

”لیس، دعا پریکٹس ہے۔“ انعم کی خوشی سے چیخ نکل گئی۔

دعا بے دلی سے پچکا سا مسکرا کے، گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یہ خوش خبری خود احسن کو سنا تی مگر وہ انعم کو بتانے سے روک نہیں سکتی تھی یا شاید وہ اس سے زیادہ خوش تھی۔

”اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہو، ٹیٹ کے بعد کنفرم ہوا ہے ناں۔“

”دعا کی رپورٹس پازیو آئی ہیں۔“ اس نے چہرے پر آئے بالوں کو ایک اداسے پیچھے جھکا۔

”میں بہت..... بہت خوش ہوں، میں اب کیا کروں۔“ وہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔

”میں بس تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں، تم فون بند مت کرنا..... میرا مطلب ہے بند کر دینا.....“ اس کی زبان اس کے دماغ کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی، اس نے فون بند کیا اور باہر کو دوڑ لگا دی۔

انعم نے مسکراتے ہوئے زیر لب اس کی سلامتی کی دعا مانگی اور موبائل جھولی میں گرالیا۔

☆ ☆ ☆

جس مقصد کے لیے یہ شادی کی گئی تھی، وہ بہت جلد پورا ہو گیا تھا۔ انہیں زیادہ انتظار سے نہیں گزرنا

پڑا تھا۔

انہم بھی اس خوش خبری پر دل سے مطمئن تھی، دعا کو پہلے تو جھٹکا لگا اب انہم اور احسن کو خوش دیکھ کے اس کے اندر بھی سکون اترتا چلا گیا۔

”دعا! تم یہاں بلاوجہ نہ بیٹھو، جاؤ اپنے بیڈروم میں جا کے ریٹ کرو۔ میں ناہید کے ہاتھ جوں اور اپیل بھجواتی ہوں، وہ ضرور کھالینا۔“ انہم نے دعا کو لاؤنج میں کھڑے ہی آرڈر دے دیا۔

ناہید جو ان کی آمد پر چوکھٹ پر آئی تھی، جوں اور اپیل کے لیے دوبارہ مڑ گئی۔

دعا خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی حالانکہ اس کا دل لاؤنج میں بیٹھ کے، احسن کا انتظار کرنے کو چاہ رہا تھا لیکن اس لیے وہ انہم کو انکار یا حکم عدولی کر کے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

انہم کو بھی احسن کا انتظار تھا، وہ بیٹھنے کے بجائے چکر کاٹنے لگی، اسے اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔

دعا کو خوشی میں آرام نہیں سوچ رہا تھا، احسن تھوڑی دیر میں آنے والا تھا اسے شاور لیے دو دن ہو گئے تھے۔ کل اس کی طبیعت خراب تھی۔ صبح بھی اس نے انہم کے کینے پر کپڑے پہنچ کر لیے تھے، اب اس کا موڈ بھی کافی خوش گوار تھا۔ وارڈروب کھول کے کپڑوں کے بیٹنگ آگے پیچھے کرنا شروع کر دیے۔

احسن کی گاڑی بیکری کے سامنے کھڑی تھی، مٹھائی خرید کے اس نے ٹوکریاں گاڑی میں رکھوائیں۔

انہم باریار وال کلاک کو دیکھتی، ہونٹ چپاتی چکر لگاتی جا رہی تھی۔ وہ دل آرا کو اتنی بڑی خوش خبری اکیلی نہیں سنانا چاہتی تھی، وہ احسن کی آمد کی منتظر تھی۔

دعا نے شاور لے کر نیوی بلیو کمر کا سوٹ زیب تن کیا، اس کی بری کے کتے ہی جوڑے بغیر استعمال کیے لٹک رہے تھے۔ دل آرا نے سارے سوٹ گہرے رنگوں کے خریدے تھے ان کا خیال تھا کہ نئی

نوبلی دلہن کو بھی رنگ زیب تن کرنے چاہئیں، اس

نے بھی لال، پیلے، ہرے رنگ نہیں پہنے تھے۔

بالوں پر لپٹا تو لیکھول کے اس نے بال جھٹکے، تو لیکھول پر ڈال کے، وہ دراز میں سے ہیز ڈرائیر نکال کے سیدھی ہوئی تو اس کی نگاہ اپنے وجود پر جا پڑی۔ نیوی بلیو کمر اس کے مناسب سراپے پر خوب بیچ رہا تھا۔

احسن کی گاڑی مسلسل ہارن بجاتی روش پر دوڑتی، پورچ میں آرکی۔ انہم کی اکھڑی سانس بحال ہوئی، وہ باہر کی طرف بڑھی۔

دعا کے ہاتھوں میں بھی تیزی آ گئی، بالوں کو ڈھیلا سا کچر میں جکڑ کے اس نے برش سے آنکھوں میں کاجل لگایا اور پنک لب گلوں ہونٹوں پر پھیرا۔ خود پر اس پرے کر کے اس نے آخری تنقیدی نگاہ خود پر ڈالی وہ بالکل سادہ اور خوب صورت لگ رہی تھی۔

اسے کبھی باہر گھرے رنگ بھانے لگے تھے۔ انہم ابھی چند قدم پیچھے تھی کہ احسن اندر داخل ہو گیا۔

”آئی دیر کی آپ نے، اب تو میں سیریلی پریشان ہونے لگی تھی۔“ اس کی بے تابی عروج پر تھی۔ ”اتنی بڑی خوشی کی خبر، اب کیا میں خالی ہاتھ گھر آ جاتا۔“ چار ملازم مٹھائی کے ٹوکے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

”مٹھائی میں سے ملازمین کا حصہ رکھ کے، باقی سب پڑوسیوں میں تقسیم کر دو اور سلیم، تم جا کے منڈی سے دو کالے بکرے صدقے کے لیے لے آؤ۔“ احسن نے ملازمین کی ڈیوٹی لگائی۔

انہم کچھ بولنے جا رہی تھی، اس کے الفاظ منہ میں اور ہونٹ کھلے رہ گئے۔

”دعا کدھر ہے، نظر نہیں آ رہی۔ دعا۔۔۔۔۔“ دعا۔۔۔۔۔ احسن آوازیں لگاتے لگا۔

وہ اپنی مسرت میں انہم کے تاثرات نوٹ نہ کر پایا ورنہ دعا کو آواز بھی نہ دیتا۔ بظاہر یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی مگر انہم کے لیے تھی۔

وہ اسی بیکری کی منتظر تھی، اسے احسن کا سامنا

کرتے حیا آ رہی تھی، اس نے بیڈ پر پڑا دوپٹہ اچھے سے اوڑھ لیا۔

”دعا۔۔۔۔۔ دعا۔۔۔۔۔“ اس کے نام کی دوبارہ پکار پڑی۔ وہ ہڑ بڑا کے باہر کود پڑی۔

”جی۔۔۔۔۔“ پھولی سانس لیے وہ اس کے سامنے موجود تھی۔

انہم جو پہلے ہی غصے سے بھری جا رہی تھی، دعا کو دیکھ کر جامد ہو گئی جسے اس نے ریٹ کرنے بھیجا تھا، وہ چودھویں کے چاند کی مانند چمک رہی تھی۔ وہ اسکول دکان کے فنکشنز میں بھی لائٹ کلر استعمال کرتی تھی، نیوی بلیو کمر شاید بنا ہی اس کے لیے تھا وہ جنت سے آئی کوئی خور لگ رہی تھی، لمبے بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ کچھ ایسی ہی حالت احسن کی بھی ہوئی تھی، انہم نے دو لمحہ پکڑ لیا تھا۔

”دعا آئی ایم سو پی۔۔۔۔۔ ڈھیروں ڈھیر مبارک ہو تمہیں۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو جاؤں گا، تم سیریلی نہیں جانتیں کہ یہ میری زندگی کی کتنی بڑی خوشی ہے جو مجھ سے سنبھالی نہیں جا رہی۔“ وہ غیر ارادی بولتا جا رہا تھا۔

دعا شرم سے سر جھکاتی، اٹھاتی مسکرائے جا رہی تھی اس کے چہرے پر بھی الوہی سی چمک پھیر گئی تھی۔ انہم جامد کھڑی، اس منظر میں ایک اینٹیولوج رہی تھی۔ جس کی نگاہیں بھی احسن کے خوشی کا نور پھوٹتے چہرے پر اور بھی شرمیلی دعا پر جا پڑیں۔

”سلیم! تم ابھی تک نہیں کھڑے ہو، صدمے کے لیے دو کالے بکرے لے آؤ اور یہ مٹھائی اٹھا کے سب میں بانٹ دو اور غفور چچا سب ملازموں کے سنے کپڑوں اور آپ لوگوں کے کھروں میں مینے بھر کے راشن کا حساب لگا کے بتادیں اور مظفر بھائی! آپ نے شام کو تین خانے اور مدر سے میں کھانا پوری ذمہ داری سے سمجھواتا ہے۔ سب اپنے حصے کا کام دھیان سے کریں، کوئی غفلت نہ برتے۔“ اس نے ایک ہی سانس میں وہاں کھڑے تمام ملازمین کو حکم جاری کر دیے۔ سب اثبات میں سر ہلاتے مٹھائی کے

ٹوکے اٹھا کے باہر نکل گئے۔

”ناہید! تم سارے گھر کے کام چھوڑ دو، صرف اور صرف دعا کا خیال رکھو۔ میں کسی قسم کی ذرا سی بھی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔“ اس نے انگلی اٹھا کے حکمانہ لہجے میں ناہید کو بھی تنبیہ کیا۔

وہ مسکرائی ہوئی اثبات میں سر ہلاتی رہ گئی۔

”ماما جان کو کال کی ہے؟“ اب اس نے رخ ساکت کھڑی انہم کی طرف موڑا۔ اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلادیا، وہ جو اس کی ہر رگ پکڑ لیتا تھا، اس کے چہرے پر پٹھہرے طوفان کو نہ پڑھ سکا۔

”چلو! واپس پھر ماما جان سے چیٹ کریں، وہ بہت ایکسٹنڈ ہوں گی۔“ وہ دعا سے کہتا ہوا صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

”تم بھی آؤ ناں انہم!“ دعا نے مڑ کر وہیں کھڑی انہم کو پکارا۔

وہ خالی دل اور خالی ذہن لیے ان کی طرف چل دی۔



”راہیہ بیگم میں بالکل فٹ فٹ ہوں آپ نے بلاوجہ مجھے جھٹی کروائی ہے۔ آج تو کام کا بڑن بھی بہت زیادہ تھا، عمر اکیلا پریشان ہوگا۔“ ریاض احمد کو بے چینی ہو رہی تھی، بار بار دھیان بیٹھے میں جا لگتا۔

”نہیں پریشان ہوتا وہ اور نہ ہی آپ ہوں۔“ وہ معنی خیزی سے مسکرا دیں۔

”تم نہیں جانتیں، دو ایمپلائز کو فائر کر دیا گیا ہے، آج اسلام۔۔۔۔۔“

”سب جانتی ہوں میں، اپنا عمر ہے ناں، وہ چلا گیا ہے آفس۔“ بڑے عام سے لہجے میں بھتی وہ خالی برتنوں کی ٹرے اٹھائے چلی گئیں۔

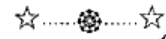
”عمر۔۔۔۔۔ کیا عمر آفس گیا ہے۔“ ریاض حیران و بے یقین پھرتی سے چپل پیروں میں اڑس کے ان کے پیچھے چلے آئے۔

”جی بالکل گیا ہے، اب وہ روز جایا کرے گا۔ آپ کو کوئی اعتراض؟“ ٹرے رکھ کے وہ پلٹیں، انداز بہت اترتا ہوا تھا۔

”نن..... نہیں..... مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔“ وہ کندھے اچکا کے رہ گئے، اپنے اندر کی ابھرنے کو چھپانے کے لیے وہ واپس لاؤنج میں آ گئے۔

”اعتراض ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ میرے بیٹے کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے، ہمیشہ فرسٹ ڈویژن.....“ ریاض احمد کی ہچکچاہٹ نے ان کا حوصلہ بلند کر دیا تھا، انہوں نے پیچھے سے پرجوش پکار لگائی۔

”جی بالکل جناب! تعلیم کے علاوہ بھی آپ کے بیٹے کے سارے ریکارڈ بہت شان دار ہیں، فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن۔“ انہوں نے مڑ کر، بڑی کو گھورتے چبا چبا کر جواب دیا۔ انہیں عمر پر فخر کرنی، وہ بہت بری لگی تھیں۔



”السلام علیکم ماما جان!“ لیپ ٹاپ احسن کی گود میں تھا، اس کے دائیں طرف دعا اور بائیں طرف انم براجمان تھی۔

”علیکم السلام میری جان اینڈ آئی ایم سوپٹی۔ میری فیملی ایک ساتھ مل جل کے کبھی ہے۔“

دل آرآنے دل میں ہی ان کا صدقہ اتارا اور امن و سلامتی کی دعا بھی مانگی۔

”دل تھام لیں ماما جان کیونکہ میں آپ کو بریکنگ بلکہ اسرارنگ نیوز سٹانے جا رہا ہوں۔“

احسن نے سنسنی خیز تمہید باندھی۔

”میرا دل بہت مضبوط ہے، تم سناؤ۔“ ان کے جسم کا ہر رواں کھڑا ہو گیا، وہ کیا سنانے جا رہا تھا جو سننے والوں کے کان برسوں سے منتظر تھے۔

”اگر آپ اتنی اسرارنگ ہیں تو چلیں پھر دس منٹ انتظار کریں۔“ وہ آج موڈ میں تھا، ماں کو تنگ کرنے میں اسے مزہ آ رہا تھا۔

”پلیز احسن تنگ مت کرو، جلدی سے بتا دو۔“

وہ بھی بگڑنے لگیں۔

”ماما جان! آپ دادی بننے والی ہیں۔“ احسن نے چیخ مارنے والے انداز میں بتایا۔

”نہیں..... کیا..... کچ..... کیا تم..... میں دادی.....“ خوش خبری اتنی جلدی، اچانک اور بڑی ملی تھی کہ زبان الفاظ ادا نہیں کر پا رہی تھی۔

”انم! یہ کچ بول رہا ہے، ہے ناں۔ دعا..... دعا تم بتاؤ..... تم ماں بننے والی ہو؟“ ان کی خوشی سے بری حالت اور بے یقینی طاری ہو گئی تھی۔ انہوں نے باری باری تینوں سے تصدیق چاہی۔

دعا کا سر شرم سے جھک گیا تھا، انم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے، تو نے مجھے اتنے بڑے رتبے پر فائز ہونے کی نوید دی، میں گناہ گار اس قابل کہاں..... تو نے میری سن لی۔“ وہ خدا کا شکر ادا کرتی رونے لگیں۔ ان کو اپنے جذبات اور حواس پر بس نہیں تھا۔

”اس خوشی کے موقع پر آپ رورہی ہیں۔“ احسن کو یہ عجیب منطق سمجھ میں نہ آئی۔

”تم نہیں سمجھو گے، ابھی باپ نہیں بنے بھلا اولاد کی تکلیف کیا جانو۔ اس وقت کے لیے میں نے کتنی دعائیں مانگی ہیں، خدا نے مجھ جیسی گناہ گار کی بھی سن لی حالانکہ میں اس قابل نہیں تھی۔“ انہوں نے گال پر پھیلے آنسو صاف کیے۔

”تو پھر آپ کب آرہی ہیں ماما جان!“ احسن نے انم کو بھونکا دیا۔

”تم جانتے ہو، میں ابھی تک تمہارے پایا جان کو انفارم نہیں کر سکی“ اس لیے اتنی جلدی پکڑ لگا ناممکن نہیں۔ کوئی سولڈر ریزن بھی تو ہونا چاہیے۔“ انہوں نے مجبوری بتائی۔

”اب آپ پایا جان کو سب کچ بتادیں۔ وہ بہت خوش ہوں گے ماما جان!“ اس نے اپنے تئیں مشورہ دیا۔

”ایک دم سے ہرگز نہیں، وہ انم کے لیے بہت

پوزیو ہیں، ابھی مزید کچھ عرصہ خاموش رہو۔“ ان کی پلاننگ لگی تھی۔

”آپ انہیں سارا کچ بتادیں ماما جی! آگے میں خود ہی پنڈل کر لوں گی۔“ تب سے خاموش بیٹھی وہ بول پڑی۔

”اچھا کچھ کرتی ہوں، تم بتاؤ دعا کا صدقہ دیا، سب ملازموں میں کپڑے اور مٹھائی بھی بانٹنا احسن!“

انہوں نے احسن کو محبت بھری ہدایات دینا شروع کی۔

”جی ماما جان! صدقہ بھی دے دیا ہے اور مٹھائی بھی بٹ بٹ چکی ہے۔“ احسن نے ذمہ داری کا ثبوت دے دیا۔

”اور دعا تم نے خود اپنا خاص خیال رکھنا ہے، میں بھی کوشش کر کے جلد از جلد پاکستان پہنچتی ہوں۔

سنو دعا! تمہارے اسٹارٹ کے چند مہینے بہت احتیاط کے ہیں! خدا نخواستہ ذرا سی بھی کوتاہی عمر بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ اس لیے کوئی وزنی چیز نہیں اٹھائی، پراپر ڈاسٹ لو، اپنی نیند پوری کرو، ہر دم خوش اور فریٹش رہو۔ جس کام اور چیز کے لیے دل چاہتا ہے وہ کرو، جس کے لیے دل رضامند نہیں وہ پھوڑ دو۔ میں روز تم سے تمہاری روٹین ڈسکس کروں گی اور ناہید۔“

”ماما جان! ناہید کو میں نے کہہ دیا ہے وہ اس کا خاص خیال رکھے گی، ماشاء اللہ سے تین بچوں کی ماں ہے اسے تجربہ بھی ہوگا۔“ احسن نے ان کی بات کاٹ کے اپنی کارکردگی گنوئی۔ اس کے آخری جملے پر دل آرآنے قہقہہ لگایا۔

”مگڈ احسن! تم نے بھی اپنی دعا کا خاص خیال رکھنا ہے، ڈاکٹر کے پاس ٹائم پر لے کر جانا، ایک ڈرائیور گھر کے لیے بھی گاڑی سے بلوالو۔“ وہ ایک ہی سانس میں اسے سب ہدایات دیے جا رہی تھیں۔

”اور الو! تم نے تینوں وقت کا کھانا، خود دعا کو اپنے ساتھ بٹھا کے کھانا ہے۔“ دل آرآنے اس خاموش صورت کو مخاطب کیا، وہ ہڑ بڑا گئی۔

”جی..... جی..... ماما جان! جی ضرور.....“ اس نے اکتے، جھپکتے ہوئے سر اٹھا کے ہاں میں ہاں

پوزیو ہیں، ابھی مزید کچھ عرصہ خاموش رہو۔“ ان کی پلاننگ لگی تھی۔

”آپ انہیں سارا کچ بتادیں ماما جی! آگے میں خود ہی پنڈل کر لوں گی۔“ تب سے خاموش بیٹھی وہ بول پڑی۔

”اچھا کچھ کرتی ہوں، تم بتاؤ دعا کا صدقہ دیا، سب ملازموں میں کپڑے اور مٹھائی بھی بانٹنا احسن!“

انہوں نے احسن کو محبت بھری ہدایات دینا شروع کی۔

”جی ماما جان! صدقہ بھی دے دیا ہے اور مٹھائی بھی بٹ بٹ چکی ہے۔“ احسن نے ذمہ داری کا ثبوت دے دیا۔

”اور دعا تم نے خود اپنا خاص خیال رکھنا ہے، میں بھی کوشش کر کے جلد از جلد پاکستان پہنچتی ہوں۔

ملادی۔



رابعہ اور ریاض احمد لان میں آکر بیٹھ گئے تھے، شام کی چائے عیسر کے ساتھ پی پی جانی تھی۔ رابعہ احمد بہت خوش اور پرجوش ہو رہی تھیں لیکن اپنے جذبات پر ضبط رکھے بیٹھی تھیں جی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ گاڑی روش پر روک کر عیسر ڈرائیونگ سیٹ سے اور عمر دوسرا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

ریاض احمد نے دونوں جوان بیٹوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کے نظر لگ جانے کے ڈر سے ذرا رخ پھیر لیا۔

”کیسا رہا تمہارا دن عمر!“ ابھی وہ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ پوچھنے لگیں۔

”بہت اچھا، بہت ساری غلطیاں کی ہیں میں نے“ حالانکہ پیر خیال تھا کہ میں دو چار جگہ جاب کر چکا ہوں مجھے آفس ورک کا تجربہ ہے۔“ عمر نے بڑے ریلیکس موڈ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”تمہیں صرف غلطیاں کرنے کا تجربہ ہے، اپنی زندگی میں صرف یہی کام تم نے دل لگا کے لیا ہے۔“

ریاض احمد کا انداز سنجیدہ تھا۔

ان سے عمر کی مسکراہٹ اور اطمینان برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ لاکھ خود کو سمجھاتے مگر اس کے سامنے آتے ہی ان کا پارہ چڑھ جاتا، وہ اسے دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔

عمر کا چہرہ تاریک پڑ گیا، رابعہ احمد کی مسکراہٹ بھی سمٹ گئی۔ عیسر نے معاملے کی نزاکت بھانپ کر جلدی سے عمر کے کاندھے پر ہاتھ دھر کے اسے تسلی دی۔

”آپ نے پایا جان سے سیکھا ہے میں بھی سب کچھ ان ہی سے سیکھوں گا۔“ اس نے حوصلہ نہ ہارا۔

غلطیاں بھی تو بہت کی تھیں، اسی کی وجہ سے انہیں دل کا روگ لگا تھا۔

انہیں دل کا روگ لگا تھا۔

عمر کا چہرہ تاریک پڑ گیا، رابعہ احمد کی مسکراہٹ بھی سمٹ گئی۔ عیسر نے معاملے کی نزاکت بھانپ کر جلدی سے عمر کے کاندھے پر ہاتھ دھر کے اسے تسلی دی۔

”آپ نے پایا جان سے سیکھا ہے میں بھی سب کچھ ان ہی سے سیکھوں گا۔“ اس نے حوصلہ نہ ہارا۔

غلطیاں بھی تو بہت کی تھیں، اسی کی وجہ سے انہیں دل کا روگ لگا تھا۔

انہیں دل کا روگ لگا تھا۔

”یہ عمیر ہی تمہارے ساتھ سر کھائے گا، میں بہت جلد تھک جاتا ہوں۔“ انہوں نے بڑے سہاؤ سے صاف انکار کے ساتھ جواز بھی پیش کر دیا۔

”چلو اٹھو عمر اور عمیر! آپ لوگ پیچھے کرو، میں جانے لگوں گی۔“ رابعہ احمد موضوع بدلتے ہوئے گھڑی ہو گئیں انہیں بھی شوہر کا انداز برالگا تھا۔

”کل سے تم میرے ساتھ ہی جایا کرو گے۔“ عمیر چلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں میری بائیک ہے ناں۔“ ان کی آوازیں دور دوری جا رہی تھیں ریاض احمد ان کی پشت کو دیکھتے کھوسے گئے تھے۔

☆.....☆

احسن دعا کو بڑی احتیاط سے چلنے اور اٹھنے بیٹھنے کی ہدایات کرتا اس کے ساتھ بیڈروم میں چلا گیا۔ انہم کئی ہی دیر وہیں صوفے پر بیٹھی رہی اور پھر وہ بھی اٹھ کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کی رگ رگ میں تھکاوٹ اتر گئی تھی، وہ دم سے بیڈ پر گری اور تکیے میں سر دے کے رونے لگی۔

اپنی کم مائیگی، بامعہ پن کا احساس اس کی نس نس میں برایت کر گیا۔ یہی التفات، محبت، خوشی وہ احسن کی آنکھوں میں اپنے لیے دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں اس نے اپنی تخیل کے لیے۔ اللہ سے رورو کے التجا کی تھی کہ وہ اس بنجر زمین کو ہرا بھرا کر دے لیکن اس نے لاکھوں نعمتوں سے نواز کے، ایک اس خوشی سے محروم کر دیا تھا۔

محرومی بھی اتنی بڑی کہ اس کی زندگی، اس کی سانسوں میں ہی محبت، دل کے ساتھ دھڑکنی محبت کا کا بڑا رہ ہو گیا تھا۔ دعا سے شادی کا مقصد اولاد کا حصول تھا، یہ سب تو ہوتا ہی تھا پھر تکلیف اور آنسو کیسے؟

لیکن وہ دعا کے ماں بننے پر نہیں رورہی تھی بلکہ اپنی محبت میں ایک اور حصے دار کی شراکت پر رونا آ رہا تھا۔

اس کی زندگی میں پہلی بار یہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ احسن کی خوشی میں خوش نہیں تھی۔ اس کے دل میں ڈر نے کنڈلی ماری تھی اور ایسا بھی پہلی بار ہوا تھا، احسن اس کی چہرے کی اداسی، آنکھوں میں ٹھہری نمی اور ہونٹوں کی پکیپکاہٹ کو دیکھ ہی نہ پایا تھا۔

کیونکہ آج اس کی نظروں میں صرف دعا کا عکس تھا، انہم کا رونا مزید شدت پکڑ گیا لیکن ابھی بہت کچھ پہلی بار ہونا باقی تھا۔

☆.....☆

موبائل کی تیل بجے جا رہی تھی، وہ منہ پر تکیے رکھے روتے روتے سوچنے لگی تھی۔ وہ کسمسے لگی تھی، پانچ سینکڑی خاموشی کے بعد موبائل پھر سے بجنے لگا۔ اس نے بھاری ہونساں اٹھایا، دھکتی آنکھیں بشکل کھول کے بیڈ پر ہی ہاتھ پھیر کے موبائل ڈھونڈ لیا۔

”بیوہ، السلام علیکم؟“ اسکرین پر دل آرا کا نمبر دیکھ کر اس کے حواس قائم ہوئے۔

”علیکم السلام! کیسی ہو؟“ دل آرا کا دھیان اسی میں تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں۔

”نہ ٹھیک ہو نہ ہی خوش۔“ انہوں نے اسے جتلا دیا۔

انہم کی آنکھیں یکدم پوری کھل گئیں، اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی محرومی اور اداسی کے ساتھ تنہا گھڑی ہے تو وہ غلط تھی۔ انہوں نے اس کے چہرے پر پھر ہرا کر پڑھ لیا تھا۔ کھوٹ اس کی محبت یا نیت میں آ گئی تھی، وہ رشتوں کی پہچان بھونچتی جا رہی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں۔“ کافی دیر بعد وہ فقط یہی کہہ پائی۔

”تو پھر تم روٹی کیوں ہو؟“ وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھی مگر وہ جان گئی تھی۔

اب کے اسے حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں اور عقل پر پردہ پڑ چکا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

”کچھ نہیں ماما جی، بس یوں ہی مجھے رونا آ گیا تھا۔“ اسے ہال آ کر تسلیم کرنا ہی پڑا۔

”دعا کے پریکٹس ہونے پر یا احسن کی خوشیوں پر۔“ انہوں نے دھکتی رگ پکڑ لی۔

”آپ جانتی ہیں، میں حسد نہیں کرتی ہوں۔“ انہم کو برا لگا۔

”میں جانتی ہوں کہ تم خود سے کتر سے حسد نہیں کرتیں لیکن یہ تم اچھے سے جان لو کہ دعا ہمیں سات پوتے بھی دے دے تب بھی وہ کبھی تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔“ ان کا لہجہ مضبوط اور مستحکم تھا۔

”آپ یہ نہ بھی کہیں تب بھی مجھے یقین ہے لیکن جو آج پہلی بار میں نے احسن کی آنکھوں اور چہرے پر دیکھا ہے وہ احساس بہت اٹو کھا اور انہوں نے اس کی آواز پر پکیپکاہٹ واضح تھی۔

”بی بی بریو! اناب بہت کچھ ایسا ہوگا، جو پہلے نہیں ہوا۔ لیکن تم فکر نہیں کرو، ہونے دو، یاد رکھو کہ یہ بچہ ہمارے خاندان کے لیے کتنا اہم ہے۔“ دل آرا نے اس کے ذہن میں راسخ کرنا چاہا، وہ اسے احساس کسری سے باہر نکالنا چاہتی تھی۔

”اس خاندان اور بچے سے بڑھ کر، میرے لیے صرف احسن اہم ہے۔“ وہ زور سے بولتی ہوئی رو پڑی۔

وہ بھی خاموش ہو گئیں، انہم کے دل میں اٹھتے طوفانوں کا اندازہ تھا، احسن کی شراکت قطعاً برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”کیوں انو! میں نے جنہیں آل ریڈی ہی سب تفصیل سے سمجھا دیا تھا۔ تم یہ سوچ کر ہی اپنا ظرف بڑا کر لو کہ احسن دعا میں انٹر سٹوڈنٹ تھا نہ ہی دعا اس میں۔ ساری پلاننگ ہم دونوں نے اپنے فائدے کے لیے کی ہے، دعا جنہیں بچہ دے گی، تمہاری گود بھر جائے گی۔ تمہاری محبت کا بڑا ورہ ہوگا تو وہ بھی اپنی اولاد میں جنہیں حصہ دار بنائے گی، سودا گھانے کا نہیں ہے۔“ وہ اسے نری اور سہاؤ سے ٹال

رہی تھیں۔ انہیں افسوس تھا کہ اس نے اپنی عقل کا درست استعمال کرنا ترک کر دیا تھا۔

”نہیں ہے مجھ میں آپ جتنا ظرف، آپ نے ایک یتیم و مسکین تین سال کی انو کو سینے سے لگالیا۔ اللہ کی قسم اگر میری سگی ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی مجھے اتنی محبت نہ دیتی جتنی آپ نے مجھے دی لیکن ماں..... مجھ میں حوصلہ نہیں ہے، میں ٹوٹ رہی ہوں، مر رہی ہوں۔“ وہ پاگلوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

دل آرا خاموش ہو گئیں کیونکہ اتنی جذباتی حالت میں اسے کچھ بھی سمجھانا ناممکن تھا۔

☆.....☆

رابعہ احمد باری باری سب کے آگے ناشتے کے لوازمات رکھتی جا رہی تھیں، عمر تقریباً بھاگتا ہوا ٹیبل تک آیا۔

”سوری، میں لیٹ تو نہیں ہو گیا۔“ اس نے عمیر اور نوال کو باری باری دیکھا۔

ریاض احمد نے اسے اوپر سے نیچے تک گھورا، نوال نے شرارت سے مسکرا کے کندھے اچکا دیے۔

”پورے سات منٹ لیٹ ہو۔“ عمیر نے رسٹ واپس دیکھ کے حساب لگایا۔

”وہ کل میں فائنٹ ایویشن سائیڈ ہو کے آفس چلا گیا، آج میں نے خوب دل لگاکے تیاری کی ہے۔ اچھا لگ رہا ہوں ناں۔“ اس نے اپنی تاخیر کی وجہ بتائی۔

رابعہ نے بولنے کے لیے منہ کھولا تھا اس سے پہلے ریاض احمد بول پڑے۔

”آفس آجانا ہے فیشن شو میں نہیں۔“ وہ تلخ ہو گئے۔

”اگر میں فریش ہوں گا تو میرا ذہن بھی تازہ دم رہے گا جو کہ بہت ضروری ہے۔“ عمر نے جواز پیش کیا۔ عمیر منہ پر ہاتھ رکھ کے اپنی ہنسی روکنے لگا۔

”تمہارا ذہن صرف غلط رشتوں پر ہی دوڑ سکتا

ہے۔“ ان کی بڑبڑاہٹ اتنی واضح ضروری کہ سب نے سن لی۔

☆ ☆ ☆

انعم کو رات بھر ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی، منہ ہاتھ دھو کے وہ چہل قدمی کے خیال سے باہر آئی تو اچانک اس کی نظر پکٹن میں کھڑی دعا پر جا پڑی۔ وہ حیران ہی اس طرف آگئی۔

”گڈ مارننگ!“ اس نے چوکھٹ سے فیک لگائی۔

دعا پلٹی۔ ”گڈ مارننگ!“ وہ پھر سے آٹا گوندھنے لگی۔

”کیا کر رہی ہو؟“ اس نے ٹوہ لی۔

”آٹا گوندھ رہی ہوں۔“ سادہ سا جواب تھا۔

”اچھا آٹا گوندھ کے میرے لیے جوس بنادو۔“

انعم آ رڈر پاس کر کے دیں کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گئی اس کا جوس پینے کا ارادہ ابھی بتا تھا۔

دعا آٹا پیالے میں نکال کے برات اور ہاتھ سنک میں دھونے لگی، برتن لگا کے وہ فریق میں سے پھل نکال لائی۔

”بہت خوش ہو تم دعا!“ اس نے تمہید باندھی۔

رات سے کرب اس کے اندر پل رہا تھا۔

”ہاں خوش ہوں۔“ اس نے سچ بولا۔

”ماں بننے پر یا احسن کی نظروں میں برتری حاصل کرنے پر۔“ اب لہجہ کڑوا ہو چکا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”برتری کیسی؟ شاید تم بھول گئی ہو کہ اس شادی کا مقصد یہی تھا۔“ وہ اسے یاد دہانی کرواتے سیب دھونے لگی، اس نے انعم کے حملے سے بچنا تھا۔

”ہمارا تو بس یہی ایک مقصد تھا لیکن تمہارے بہت سے مقاصد ہیں جواب ایک ایک کر کے پورے ہوتے جائیں گے۔“ اس نے ہوا میں تیر چلاتے الزام دھرا۔ رات دل آرا کی کی گئی نصیحتوں کا رنی بھر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

”تم بلاوجہ مجھ پر شک نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔“ دعا پلیٹ میں سیب کاٹنے لگی۔

”چلو ہم کوئی اور بات کر لیتے ہیں۔“ دعا کو صبح صبح جھگڑا کرنا اچھا نہ لگا۔

کل ہی تو اسے اتنی بڑی خوش خبری ملی تھی، رات بھر اس نے اور احسن نے بہت خوب صورت سننے دیکھے تھے۔ احسن کی اپنے بچے کے لیے لمبی پلاننگ تھیں جو وہ سن کے کھنکھاتی رہی، انعم کا رویہ چھپچھپے دنوں نارمل رہا تھا۔

”اور بات یہ کہ..... احسن کو اب تمہارے پاس سونے کی ضرورت نہیں۔“ اس بات کی اسے تکلیف تھی جو زبان تک آگئی تھی۔ دعا کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے۔

”یہ بات آج تم اسے سمجھا دینا۔“ اس نے گیند دعا کی کورٹ میں پھینکی وہ خاموش رہی۔ اسے انکار کر کے غصہ دلانے کی جرأت نہیں تھی، احسن واک پر گیا تھا۔ اسے بھی ابھی آ جانا تھا، وہ اس طرح گفتگو کو سمیٹ دینا چاہتی تھی۔

”شوگر مت ڈالنا۔“ نیا آ رڈر۔

”اب تم احسن کو غرے دکھاؤ گی، فرمائش کرو گی، تمہارے پاؤں جم گئے ہیں، اب اسے خود سے

باندھ کے، مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کی جائے گی اور تم.....“

دعا نے مشین کے بٹن پر انگلی رکھ دی تاکہ شور میں اس کی آواز دب جائے۔ انعم دانت کچکا کے رہ گئی دعا کو اس کی سوچ پر ہنسی بھی آ رہی تھی، جب تک مشین نہ بند ہوئی وہ دعا کی پشت کو گھورتی رہی۔

”میرا اتنے اوجھے جھکنڈے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں البتہ تم جو چاہو، احسن کو سمجھا دو۔ مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں۔“ دعا نے نرمی سے اپنا موقف بتا دیا۔

”ظفر کر رہی ہو؟“ اس کی نرمی بھی زہر لگی تھی۔

اس نے اپنے آگے جوس رکھتی دعا کو گھورا۔

”مشورہ دے رہی ہوں۔“ وہ کہہ کر پلیٹ لگی اور فریق میں سے قہر نکالنے لگی۔

”مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔“ وہ مزید چڑ گئی۔

”دعا..... دعا.....“ احسن باہر سے ہی آوازیں دیتا آ رہا تھا۔

انعم کے کان سائیں سائیں کرنے لگے، وہ صبح انھ کے اسی کو پکارتا تھا اس گھر میں صرف انعم کے نام کی گونج سنائی دیتی تھی۔ آج دعا کا نام بھی درود پوار سے فکرا گیا تھا۔

”تم یہاں ہو میں تمہیں بیڈروم میں ڈھونڈ آیا ہوں۔“ وہ پکٹن میں آ گیا۔

”جی میں آپ کے لیے قہر والا پراٹھا بنا رہی تھی آپ کو پسند ہے ناں۔ آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے۔“ اس نے قہر میں سوکھا دھنیا اور زیرہ کس کرتے پوچھا۔

”مگر تم جو لمبے کے سامنے اتنی دیر کھڑی نہیں رہ سکتیں، ماما نے رات تمہیں منع کیا تھا ناں۔ اب کیا مجھے ڈانٹ پڑاؤ گی۔“ احسن ناراض ہونے لگا۔

”کیا ہو گیا ہے، صرف آپ کا بریک فاسٹ ہی تو بنا رہی ہے۔“ انعم فٹ سے سچ میں کود پڑی۔

”ڈاکٹر ماہرہ کہہ رہی تھیں، فرسٹ بے بی ہے، بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی کوتاہی بہت بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی ہے۔“ احسن کا فرمان سن کے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”آپ نے خود ڈاکٹر ماہرہ کو کال کی تھی؟“ اس کے منہ سے سینی نما آواز نکلی۔

”ہاں میں نے کی بھی، یا انعم! تم پراٹھا بنادو، ساتھ میں ہری مرچ کی چٹنی بھی بنا لینا میرا دل کافی دنوں سے چاہ رہا تھا اور تم چلو کرے میں۔“ احسن نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔

انعم اس کی جرأت پر حیرت کے زیر اثر تھی، اس

کا کلائی تھام لینا، اسے لگا کہ جھٹ سر پر آگری ہے۔ اس کے ہاتھ سے جوس کا گلاس کرتے کرتے بچا، اس نے ہشکل اپنے حواس قابو میں رکھے۔

”ہاتھ تو دھو لینے دیں۔“ دعا احتجاج کر رہی تھی۔

اس کا دل بھی مٹھی میں جکڑا گیا تھا، احسن کی ان تمام حرکات کا خمیازہ اسی کو بھگتنا تھا کیونکہ انعم نے تیور بدل لیے تھے۔

”اچھ ہاتھ میں دھو لینا۔“ وہ اسے باہر لے گیا تھا۔

”آئندہ میں تمہیں کوئی کام کرتے نہ دیکھوں۔“ وہ اس سے کہہ رہا تھا جو انعم نے بھی بخوبی سن لیا۔

اس کے جسم سے جان نکلی جا رہی تھی وہ ساکت و جامد میز کی سطح کو گھورتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

**گل کھستار**

**نزدیکی**

قیمت - 400 روپے

مکتبہ ایمے کاہنہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی





”ہر وقت تسبیح گھماتی رہتی ہیں اماں۔ نجانے کیا پڑھ پڑھ کے اپنے بیٹوں پر پھونک مارتی ہیں۔ اس لیے تو دونوں بیٹے ماں کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے عمل کرتے ہیں!“

نانکھ نے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے کن اکیوں سے اپنی ضعیف ساس کی طرف دیکھا جو پاس بیٹھے ہوئے بڑے بیٹے پر پھونک مارتی تھیں۔

”ارشاد کے لیے بھی کھانا لے آئیں۔ میرے ساتھ کھا لیتا۔ آج کتنے دنوں کے بعد تو فراغت ملی ہے اسے!“ اماں نے بڑے بیٹے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ارشد جو نانکھ کے اشارے پر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تھا، اماں کی بات سن کر رک گیا۔

”ارے اماں! ارشد ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں! کچھ دیر آرام کریں گے۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ آپ آرام سے کھانا کھائیں، چلیں ارشد! میں آپ کے کپڑے نکال دوں۔“

ہمیشہ کی طرح نانکھ نے باتوں کے ہیر پھیر میں ارشد کو الجھا کر اماں کے پاس سے اٹھا دیا۔ ارشد بھی ہمیشہ کی طرح بیوی کی آنکھوں اور کانوں سے دیکھنے اور سننے والا۔ فوراً سر جھکا کر اٹھا اور اماں کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اماں نے گہری سانس لی۔ دل کے نہاں خانے سے اٹھتا اداسی کا ہلکا سا دھواں، سانس کی ڈور سے الجھا تو اماں کا دل گھبرانے لگا۔ وہ سر جھٹک کر سامنے رکھے سادہ سے کھانے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ کچھ دیر تک دیکھتی رہیں اور پھر بسم اللہ پڑھ کر پہلا نوالہ توڑا۔ چند نوالے بمشکل کھائے اور پھر اماں نے روٹی لپیٹ کر رکھ دی۔

”شکر ہے میرے مولا۔۔!“ اماں کی زبان سے شکر کا کلمہ نکلا۔

”زوہیب کے آنے میں ابھی کافی دیر ہے!“

اماں نے سائینے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی اور نیم دراز ہو کر اپنی تسبیح تمام لی۔ زوہیب کا انتظار کرتے ہوئے تسبیح کے ہر دانے کے ساتھ خیر کی دعا نکل رہی تھی۔

☆☆☆

”آج ویک اینڈ ہے۔ سب دوست کریم مارکیٹ میں اپنی مخصوص جگہ پر جمع ہو رہے ہیں۔ زبردست سا پیزا لڑائیہ میرے طرف سے آخر خواہ میں اضافہ جو ہوا ہے۔ تم بھی ناٹم سے آ جانا بلکہ ایسا کرو۔ میرے ساتھ ہی چلو۔ گھر جا کر کیا کرو گے!“

فیضان نے آفس سے نکلنے سے زوہیب سے کہا تو بایک میں چالی لگاتا، وہ مسکرا دیا۔

”نہیں یار! جھپٹلے کچھ دنوں سے اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اکیلے گھبرا جاتی ہیں! ویسے بھی سارا ہفتہ انہیں ٹھیک سے وقت نہیں دے پاتا ایک ویک اینڈ تو ملتا ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ نہ گزاروں۔“

”ایک تو تم بھی تا یا را اپنے والدین سے سب ہی محبت کرتے ہیں مگر تم نے تو حد ہی کر دی ہے۔ اپنے لیے بھی تھوڑا ناٹم نکالا کرو۔ کل کو تمہاری شادی بھی ہوئی ہے۔ اپنی فیملی کے لیے کیسے وقت نکالو گے!“

فیضان نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھایا۔

”تو کیا اماں میری فیملی نہیں ہیں؟“ زوہیب نے تعجب سے پوچھا۔

”تم سمجھ نہیں رہے یار!“ فیضان نے کچھ کہنا

چاہا۔

”ایسی سمجھ تم رہنے ہی دو میرے بھائی! ابھی میں چلا۔“ زوہیب نے ہیملٹ پہننے ہوئے ہاتھ ہلایا اور زن سے بایک اڑا کر لے گیا۔

☆☆☆

”یہ دیکھیں اماں!“ کھانے کے بعد زوہیب ماں کے ساتھ لیٹ کر باتیں کرنے لگا اور پھر ہاتھ

میں پکڑے موبائل پر انہیں نعین لگا دیں۔ اماں بہت خوش ہو کر دیکھنے لگیں۔

”زوہیب! میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں اللہ کے گھر جاؤں مگر۔۔۔!“ اماں نے حسرت سے موبائل میں نظر آتے خانہ کعبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر کیا امی! میں تھوڑے پیسے جوڑ لوں۔“



ان شاء اللہ آپ کو ضرور لے کر جاؤں گا!“ زوہیب نے یقین سے کہا تو اماں دھیر سے مسکرا دیں۔

”بیٹا! پیاری نے کسی قابل کب چھوڑا ہے۔ اب مجھ سے سفر کہاں ہوگا! بس میری دعا ہے کہ تم بہت جلد اللہ کے گھر کا دیدار کرو۔ اگر تم نے کر لیا تو میں سمجھوں گی کہ میں نے بھی کر لیا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی اماں! ہم دونوں ساتھ ہی جائیں گے دیکھ لیتا!“ زوہیب نے کہا تو اماں خاموشی سے کچھ سوچنے لگیں۔

”زوہیب بیٹا! تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ میری ہر بات مانی ہے۔ بیٹا! میری خواہش ہے کہ اب تم شادی کر لو۔ دیکھو تمہارا بڑا بھائی خیر سے شادی شدہ بال بچوں والا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں سیٹ ہے۔ اس لیے میں اس کی طرف سے مطمئن ہوں مگر میرا دل ہر وقت تمہارے لیے بے چین رہتا ہے۔ میرے بعد تم کیا کرو گے!“

اماں نے کہا تو زوہیب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”اماں! آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں!“ زوہیب نے ماں کا مزور ہاتھ تھام کر کہا۔

”بیٹا! سوچنا پڑتا ہے۔ آنے والے وقت کے لیے! بس تم اب کچھ نہیں کہو گے۔ میں کل ہی تمہاری چھپو کے گھر جاؤں گی۔ لیکن سے تمہاری منگنی ہوئے بھی کئی سال گزر گئے ہیں۔ وہ لوگ بھی پوچھ پوچھ کر تھک کر خاموش ہو گئے۔ اگر لیکن کی مرضی اور پسند شامل نہ ہوتی تو شاید یہ رشتہ ہی ختم کر دیتے!“ اماں نے آہستہ سے سمجھایا۔

”ہاں تو کر دیں! کسے فکر ہے!“ زوہیب نے لا پرواہی سے کہا تو اماں نے مسکرا کر اس کا کان پکڑ لیا۔

”اچھا زیادہ ڈرامے مت کر ماں کے سامنے جانتی ہوں تیرے دل کی بات! روز رات کو اس سے باتیں کرتا ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ میں سو رہی ہوں اس لیے مجھے کچھ نہیں پتا۔ مگر سب خبر ہوئی ہے مجھے!“

اماں کے کہنے پر زوہیب کھیٹا ہو کر ہنس پڑا۔ ”اچھا مان لیا! میری ماں بی بی کی سی ہے نا۔!“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“ اماں نے حیرت سے سوال کیا۔

”وہ جسے سب کی خبر رہتی ہے!“ زوہیب نے ماں کو ٹالا۔

”سب کی تو نہیں، ہاں مگر ماں کو اپنے بچوں کی خبر ضرور رہتی ہے!“

اماں نے بھی اطمینان سے جواب دیا تو زوہیب مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

☆☆☆

”ارے تم لوگ آج بھی گھر پر ہو؟ کہیں آؤنگ پری چلے جاتے!“

نانکھ ٹنگٹاتی ہوئی نیچے اتری تو لاؤنچ میں ٹی دی کے سامنے بیٹھی لیلا کو دیکھ کر کہنے لگی۔ زوہیب کی شادی کے بعد وہ لوگ اوپر والے پوریشن میں سیٹ ہو گئے تھے۔ نانکھ دن میں اکثر نیچے جا چکر لگا کر سن گن لینے کی کوشش کرتی۔ چہ میمنے گزر جانے کے باوجود اسے اپنے مطلب کی کوئی بات نہیں ملی مگر پھر بھی وہ اپنی طرف سے پوری ”ایمان داری“ سے کوشش کرتی رہتی تھی کہ کسی طرح ان لوگوں کی پرسکون زندگی میں، بالکل مچا کر تماشہ دیکھ سکے۔

”آئیں بھابھی! میں ابھی جائے بیٹانے کے لیے اٹھ رہی تھی۔ اچھا ہوا آپ آئیں۔“ لیلا نے خوش دلی سے کہا۔

”چائے کا چھوڑو! میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو! زوہیب آج بھی اپنی اماں کے گودے سے لگ کر بیٹھا ہوگا اور تم یہاں اٹلی!“

نانکھ کے کہنے پر لیلا گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”ایسا نہیں ہے بھابھی! آپ کے دیور تو اپنی بائیک کی ہفتہ وار صفائی میں لگے ہوئے ہیں۔ اماں دوپہر کے کھانے کے بعد سو رہی ہیں۔ عصر کی اذان ہو جائے تو انھیں اٹھا دوں گی۔ لیکن نے نرمی سے جواب دیا تو نانکھ ”اونہہ“ کر کے رہ گئی۔

”ویسے تم اچھے پردے ڈالتی ہو! خیر مجھے کیا بھوہر کو اپنے حقوق کا احساس نہیں دلاؤ کی تو وہ ایسے ہی لا پرواہی سے پیش آئے گا۔ مجھے دیکھو ہریک اینڈ پر آؤنگ کا پروگرام بناتی ہوں۔ جاے ارشد مائیں یا نہ مائیں۔ اس کے علاوہ بھی روز نہیں نہ کہیں ان کے ساتھ جاتی ہوں۔ اماں کی تو مجبوری ہے کہ کہیں آ جا نہیں سکتیں مگر ہم کیوں خود کو پابند کریں!“ نانکھ نے فحوت سے کہا۔

”در اصل بھابھی بات اپنی اپنی پسند اور ترجیحات کی ہوتی ہے! ضروری نہیں ہے کہ سب کی سوچ اور پسند ایک جیسی ہو! آؤنگ کرنا مجھے بھی اچھا لگتا ہے مگر مجھے بھار! اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مجھ پر کوئی پابندی ہے! میں اپنی مرضی اور خوشی سے زیادہ وقت گھر میں گزارنا پسند کرتی ہوں۔“ لیلا نے اطمینان سے جواب دیا تو نانکھ سر جھٹک کر رہ گئی۔

کچھ دیر وہاں بیٹھ کر پھر چلی گئی۔ لیکن سب کاموں سے فارغ ہو کر میگزین دیکھنے لگی۔

”سنو! آکس کریم کھانے چلو گی؟“ زوہیب نے میگزین کے ورق پلٹتی لیلا سے پوچھا تو وہ چونک گئی۔

”اس وقت؟“ لیلا نے رات کے گیارہ بجاتی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”ہاں تو؟“ زوہیب نے تھکے انداز میں پوچھا تو لیلا اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اماں رات کے کھانے کے بعد دوپہر کو کھا کر سو چکی تھیں۔ لیلا نے آہستگی سے دروازہ کھول کر اماں کو بخواب دیکھا تو اطمینان سے سر ہلاتی باہر نکل گئی۔ زوہیب نے اسے آتے دیکھ کر بائیک اسٹارٹ کی۔ رات کی خاموشی میں بائیک کی آواز گونجی تو اوپر والی کھڑکی کا پردہ ہٹا اور نانکھ نے دونوں کو باہر جاتے ہوئے دیکھا تو منہ بنا کر رہ گئی۔

”اونہہ! لیلا! جنوں!!“

زوہیب اور لیلا قریبی آکسکریم پارلر میں آئے۔

”بیٹھے، اپنے سامنے رکھی مزیدار اور پسندیدہ آکس کریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”ویسے آج بہت مہربان ہیں لوگ!“ زوہیب کے کپ میں سے پیچ بھر کر مزے سے کھاتے ہوئے لیلا شرارت سے بولی۔ تو جواہر زوہیب نے بھی اس کے کپ کی طرف پیچ بڑھایا مگر لیلا نے جلدی سے کپ پیچھے کر لیا۔ زوہیب اسے گھور کر رہ گیا۔

”ویسے ایک بات بتاؤ! کیا تم بھی نانکھ بھابھی کی طرح ہی سوچتی ہو کہ اماں۔۔۔!“ زوہیب کے چپ ہونے پر لیلا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ زوہیب نے نانکھ بھابھی کی باتیں سن لی تھیں۔

”کیا آپ کو ایسا لگتا ہے؟ دیکھیں زوہیب! ہمارا رشتہ بے زیادہ وقت نہیں ہوگا مگر ہم دوستی کے ایک تعلق میں کئی سال سے بندھے ہوئے ہیں۔

شادی سے پہلے ہی میں بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ آپ کی سوچ اور ذمہ داری کیا ہے؟ میں نے یہ سب دل سے قبول کیا ہے۔ اور اماں صرف میری سانس ہی نہیں، میری مائی بھی ہیں۔ میرے دل میں ان کی جگہ اور مقام بہت اونچا ہے۔ آپ کسی وہم کا شکار مت ہوں۔“

لیلا نے نرمی سے کہا تو زوہیب کے دل میں جہاں اس کا مقام مزید اونچا ہوا، وہاں اس سے محبت میں بھی اضافہ ہو گیا۔

”سچ پوچھو تو تم سے اتنے سال منگتی رہنے کے باوجود میں شادی کرنے سے ڈر رہا تھا، مجھے لگتا تھا کہ شاید میں ماں اور بیوی میں توازن نہیں رکھ پاؤں گا! نانکھ بھابھی اور ارشد بھائی کو دیکھ کر میں بہت حیران ہوتا۔ جس طرح نانکھ بھابھی نے ارشد بھائی کو اماں سے دور کر دیا، کہیں میری بیوی بھی آ کر ایسا نہ کرے! میں بہت چھوٹا تھا جب ابابھیں چھوڑ کر چلے گئے! اماں نے ہم دونوں بھائیوں کو بہت مشکل اور مشقت سے پالا پوسا ہے۔ میں ہمیشہ سے اپنی ماں کے زیادہ قریب تھا۔ ان کے ہر دکھ، درد کو بن کے سمجھنے والا۔۔۔! میں شاید بھی نہیں بھول سکتا کہ میری ماں نے ہمارے لیے کتنی قربانیاں دی ہیں! اور شاید اسی وجہ سے

میں ان کے بارے میں بہت حساس ہوں!“  
زوہیب نے ہنسنے لگے۔

”آپ ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ کھڑا دیکھیں گے زوہیب!“ علی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو زوہیب اس کی آنکھوں سے جھانکتے یقین کو دیکھ کر مطمئن سے انداز میں مسکرا دیا۔

☆☆☆

”آپ کی بات ہوئی اماں سے یا نہیں!“ نائلہ نے روز کی طرح جلدی جلدی کھانے کے برتن سینے ہوئے پہلا سوال یہ ہی کیا تو ارشد گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”ایک بار کہہ دو دیا ہے تمہیں کہ اماں سے سب ملے ہو گیا ہے پھر بار بار سوال کیوں کرتا! دیکھو اونے پونے میں گھر بیچنے کا کوئی فائدہ ہمیں بھی نہیں ہوگا۔ جب اچھی قیمت لگے گی تو گھر بیچ دیں گے یا مجھے میرا حصہ دے دیں گے۔ اب تم بھی کچھ صبر سے کام لو۔ تمہارے کہنے پر اپنی ماں اور بھائی کو چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔ تمہاری پسند کے مطابق شہر کے پوش ایریا میں گرائے پر گھر لے لیا ہے۔ گھر سیٹ کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں رہی۔ جو تم نے چاہا، ویسا ہی تو ہو رہا ہے!“

ارشد نے تیز لہجے میں کہا تو نائلہ سنبھل کر بولی۔  
”ہاں وہ تو مجھے پتا ہے۔ بچے بھی یہاں آ کر بہت خوش ہیں اور ہم سب گہری نیندیں رہے ہیں؟ اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے نا!“  
نائلہ نے ہمیشہ کی طرح بچوں کا نام لیا تو ارشد سر جھٹک کر رہ گیا۔

”ویسے کیا آپ کو لگتا ہے کہ زوہیب کے پاس کبھی اتنے پیسے ہوں گے کہ وہ ہمیں ہمارا حصہ دے سکے؟“ نائلہ کی سوئی گھوم پھر کے وہاں ہی آ کر رکی۔  
ارشد بھی سوچ میں پڑ گیا۔

”مشکل ہے! اس کی تنخواہ تو اتنی نہیں ہے اسے گھر بیچنا ہی پڑے گا! میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔ آخر مجھے بھی کاروبار میں ڈالنے کے لیے

رقم چاہیے!“ ارشد نے دو ٹوک لہجے میں کہا تو نائلہ کے دل میں سکون پھیل گیا۔

ارشد کو اس گھر سے یہاں تک لانے والی وہ ہی تو تھی! ارشد کا روز بہ روز ترقی کرتا کاروبار، پیسے کی ریل پیل نے نائلہ کا دماغ ساتویں آسماں پر پہنچا دیا۔ زوہیب کی ترقی کی رفتار پچھوے بیسی تھی جبکہ ارشد خرگوش کی طرح لمبی لمبی چھلانگیں مارتا، بہت آگے نکل گیا۔ اماں ان کے گھر چھوڑ کے جانے سے بہت افسردہ تھیں مگر وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھیں۔ نائلہ نے بہت چالاکی سے، ان کا بیٹا دور کر دیا تھا۔ وہ سب سمجھتی تھیں مگر سمجھ کر بھی چپ تھیں۔ نائلہ کی حرکتیں اور چالاکیاں ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ بس وہ گھر کا سکون برقرار رکھنے کے لیے خاموش رہتیں۔ جسے نائلہ ان کی کمزوری یا لاعلمی سمجھتی رہی۔

دوسری طرف لیلیٰ تھی۔ لیلیٰ جو بھی کرتی، اس میں کوئی دکھاوہ یا مجبوری کا عنصر نہیں ہوتا تھا۔ لیلیٰ کا ہر عمل اس کی اچھی نیت اور صاف دل کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ اپنی ساس کی تنہائی اور بڑھاپے کو سمجھتی تھی۔ اس لیے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتی۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں سے اس کے سچے اور صاف دل کا پتا چلتا تھا۔ اماں بھلے پرہیزچی کھانا کھاتی تھیں مگر لیلیٰ انہیں دسترخوان پر اپنے ساتھ بیٹھنے پر اصرار کرتی اور وہ سب کھانا ایک ساتھ اور ایک جگہ پر کھاتے۔ پہلے پیل اماں نے منع کرنا چاہا تو لیلیٰ کے جواب نے انہیں لا جواب کر دیا۔

”اماں! آپ سے برکت ہے!“  
لیلیٰ جب کبھی زوہیب کو پریشان دیکھتی یا اس کی طرف سے پریشان ہوتی تو دوڑی ہوئی اماں کے پاس چلی آتی۔

”اماں! زوہیب کے لیے دعا کریں! وہ آج کل پریشان ہیں۔“  
”بے فکر ہو! میری ہر دعا میں شامل ہے وہ!“  
اماں تسبیح گھماتے ہوئے تسلی دیتیں۔

”جی اماں! مجھے پتا ہے مگر جب بھی میں آپ سے ان کے لیے دعا کا کہتی ہوں تو ان کی مشکل فوراً ختم ہو جاتی ہے!“

لیلیٰ کے کہنے پر اماں دھیرے سے مسکرا دیتیں۔ لیلیٰ بے خبری میں کائنات کے سب سے بڑے راز کو جان گئی تھی۔

کہ ماں کی دعا، اولاد کے لیے نجات کا ذریعہ ہے!

☆☆☆

”آج آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی؟“  
نائلہ نے ہنسنے پر ارشد کو پانی کا گلاس پیش کرتے ہوئے پوچھا۔ ارشد نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

”بس کیا بتاؤں! کوئی کام بھی سیدھا نہیں ہو رہا۔ کاروبار میں مسلسل نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ قرض ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر یہ ہی صورت حال رہی تو ارشد نے پریشانی سے کہا تو نائلہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جہاں جھکن اور پریشانی کا گہرا جال بچھا ہوا تھا۔

”ایک بات کہوں“ آج صائمہ کا فون آیا تھا میری پریشانی دیکھ کر اس نے ایک بابا جی کا پتا دیا ہے جو کچھ لینے نہیں ہیں! اگر آپ اجازت دیں تو میں صائمہ کے ساتھ ان کے پاس چلی جاؤں!“ نائلہ نے جھجکتے ہوئے کہا تو ارشد نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جو دل چاہے کرو!“ ارشد کہتا ہوا اٹھ گیا۔ نائلہ نے گہری سانس لے کر اپنی چھوٹی بہن صائمہ کو کال کی اور گرین سگنل ملنے کی نوید سنائی۔ اگلے دن نائلہ بابا جی کے پاس سے ہو کر آئی تو بہت بُرا مزاج اور مطمئن تھی۔ ارشد کو تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگی کہ ”بابا جی بہت نیک اور نورانی چہرے والے ہیں! انھوں نے پڑھنے کے لیے کچھ وظائف دیے ہیں اور دعا بھی کی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“  
”اچھا چلو! دیکھتے ہیں!“ ارشد چپکے سے

مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔  
☆☆☆

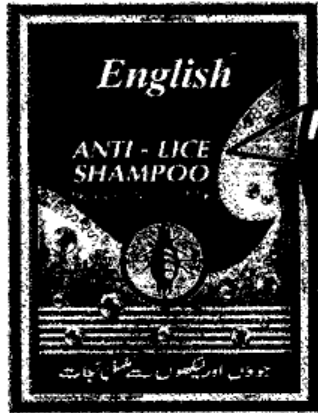
”عجیب سی مشکلات میں گھر گیا ہوں۔ ایک مسئلہ حل نہیں ہوتا اور دوسرا اٹھ اٹھتا ہے۔ زندگی کتنی مشکل ہو گئی ہے!“ اپنے بچے کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا ارشد گھر لایا تو تھک کر کہنے لگا۔ پچھلے ایک مہینے سے بچے کو لے کر مختلف ہسپتالوں کے چکر کاٹ رہا تھا کسی کو اس کی بیماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مشکل بچے کی حالت سنبھلی تو وہ شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے گھر کو لوٹے۔

”ہاں کیا کہہ سکتے ہیں!“ نائلہ نے بھی مدھم لہجے میں کہا اور اٹھ کر گھر کے گھر کو سینے لگی۔  
”مولوی صاحب! میں بہت پریشان ہوں! میرے لیے دعا کریں!“ ایک مدھم سی آواز پر ارشد نے سر اٹھا کر دائیں طرف دیکھا۔ جہاں ایک آدمی مولوی صاحب سے دعا کے لیے کہہ رہا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد بہت سے لوگ جا چکے تھے۔ بس کچھ لوگ ہی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جن میں ارشد بھی تھا۔

”ہاں ضرور! دعا تو رحمت ہے اور رحمت تو سب کے لیے ہوتی ہے!“ مولوی صاحب نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔  
”ایک بات بتاؤ بھائی! کیا تمہاری ماں حیات ہے؟“ مولوی صاحب کے پوچھنے پر اس شخص کے ساتھ ساتھ ارشد بھی چونکا۔

”اگر ماں حیات ہوتی تو فکر ہی کیا تھی مولوی صاحب! ان کی دعا تو ڈھال ہی میرے نیلے!“ اس شخص کا لہجہ نرم ہو گیا۔ مولوی صاحب نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔  
”ٹھیک کہا آپ نے! جس نے ماں سے دعا کی ہو، وہ دعا کے لیے درود کی ٹھوکریں نہیں کھاتا۔“ مولوی صاحب نے کہا۔  
”اگر آپ کی ماں راضی تھی میں تو ان کی دعا کا سایہ ہمیشہ آپ کے سر پر رہے گا! فکر مت کریں!“

# نہ کھجائیں.. Health ہو جائیں!



اصل کی پہچان HOLI GRAPHIC PRINT

5 منٹ میں جوڑوں اور لیکھوں سے مکمل نجات

”نانک! کیا تمہیں اماں کی طرح دم کرنا آتا ہے؟  
ارشد نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو  
نانک! اس کی سرخ آنکھوں میں تیرے آنسو دیکھ کر  
ساکت رہ گئی۔

”تم جانتی ہو! آج میں کہاں گیا تھا؟“ ارشد  
نے دوبارہ سر جھکا لیا۔

”کہاں؟“ نانک! نے سرسراہتی آواز میں پوچھا۔  
”اماں سے ملنے۔۔۔!“ نانک! لرز کر رہ گئی۔

”مگر نانک! اتنی دیر تک ان کے پاس بیٹھنے پر  
بھی وہ نہیں ملیں۔ انھوں نے مجھے پریشان دیکھ کر  
ہمیشہ کی طرح دم نہیں کیا۔ نانک! کیا مرنے کے بعد  
ماؤں کی قبر کی مٹی بھی خاموش ہو جاتی ہے؟ اگر ایسا  
ہے تو زوہیب کیوں کہتا ہے کہ اسے ہر بار اس مٹی  
میں سے ماں کی خوشبو، ماں کا لمس، ان کا احساس نظر  
آتا ہے۔ کیا اماں صرف زوہیب کی نہیں؟

دیکھو میں اماں کی قبر کی مٹی سے لپٹ کر اتار دیا  
ہوں کہ خود مٹی ہو گیا مگر اماں کی خوشبو نہیں آئی! کیا وہ  
مجھ سے ناراض ہیں؟“

نانک! پتھر کا بت بن کر کھڑی تھی۔ اس کی  
آنکھیں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مرد کوچوں کی طرح  
پھوٹ پھوٹ کر رونا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

آج اس کے اندر کی حاسد عورت کو شکست کا  
سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ جو آج تک اپنے تئیں بہت  
چالاکی سے کھیلتی آ رہی تھی۔ آج منہ کے بل گری تو  
اسے اپنا بنایا ہوا یہ گھر بھی ہوا میں بچوں کی طرح اڑتا  
ہوا نظر آ رہا تھا۔

اس نے شکست خوردہ وجود کے ساتھ خود سے  
یہ اعتراف کیا تھا کہ  
”مکاری اور چالاکی میں بھلے میں کتنی بھی آگے  
سہی! مگر میرے پاس اماں کے دم کا کوئی ٹوٹ نہیں ہے۔“



وہ شخص اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ارشد کے دل  
کو کچھ ہوا۔ اسے اچانک یاد آیا کہ اماں بھی ہر وقت  
اس پر دم کرتی رہتی تھیں۔ اماں کے ساتھ رہتے  
ہوئے، وہ ایک عجیب سے حصار میں رہتا تھا۔ شاید وہ  
اماں کی دعاؤں کا حصار تھا۔ جو کسی مشکل یا پریشانی کو  
اس کے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ جب کبھی وہ پریشان  
یا بیمار ہوتا تو اماں کے کچھ پڑھ کے پھونک مارنے  
سے فوراً ہی ٹھیک ہو جاتا۔ نجانے اماں کے دم میں ایسا  
کیا جادو تھا۔ وہ بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور  
تھکے ہوئے قدموں سے مسجد سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ جب اپنے پرانے گھر پہنچا تو مغرب کی  
اذان ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ مین گیٹ کی لائٹس  
روشن تھیں۔ گھر کے دروازے پر ہوا نیا پیٹنٹ اور پورچ  
میں کھڑی مہنگی گاڑی، اور زوہیب کے نام کی نیم  
پلیٹ، اس کی ترقی کی نشان دہی کر رہے تھے۔

”دیر سے ہی سہی مگر سب کچھ تو زوہیب نے  
بھی حاصل کر ہی لیا نا! اپنا گھر، اچھی گاڑی، ترقی،  
اچھی بیوی، پیارے بچے اور سب سے بڑھ کر اماں کی  
محبت اور رضا۔۔۔! زوہیب کتنا خوش نصیب  
ہے۔۔۔!“

ارشد نے گہری سانس لی۔ مغرب کی اذان کا  
نور ہر طرف پھیلنے لگا تو وہ مغرب کی نماز پڑھنے کے  
لیے قرعہ مسجد کی طرف چل پڑا۔

وہ اپنے گھر لوٹا تو رات کا اندھیرا جمیل چکا تھا۔ نانک!  
اسے دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھی۔

”حد ہے بھی! میں نے کتنی کالز کی ہیں مگر آپ  
کافون ہی آف تھا! کہاں رہ گئے تھے آپ!“  
نانک! نے اس کے حکم زدہ اور مٹی سے اٹے  
کپڑوں کی طرف حیرت سے دیکھا۔

ارشد خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔  
”سنو نانک! تم ہر فن میں طاق ہونا!“ ارشد نے

مدھم لہجے میں پوچھا۔  
”کیا مطلب؟“ نانک! نے الجھ کر پوچھا۔

# حالیہ حال

”اف منت کیا بناؤں تمہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ لندن میں رہتے ہوں گے۔ آئی تو خیر شروع ہی سے مولیانی (مولویانی) تھیں۔“ اس کے برعکس لہجے میں اردو میں بات کرنے پر ادھر منت ہنس ہنس کر دہری ہو گئی تھی۔ موبائل ہاتھ میں پکڑے وہ پہلے کھڑکی میں کھڑی تھی پھر بیڈ پر گر گئی۔

”ان کی اولاد بھی ان ہی پر گئی ہے۔ جب تم یہاں آؤ گی تو دیکھنا کیسے کیسے نمونے بھرے بڑے ہیں ان کے گھر میں۔“ اس کے انداز پر اس کا نفرتی نقطہ کمرے کی خاموش فضا میں جلتے گنگ بجانے لگا۔

”اب تو مجھے بھی دیکھنے کا بہت شوق ہو رہا ہے۔ کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ آئی سے تو ملاقات سال دو سال بعد ہوئی جاتی ہے جب وہ پاکستان آتی ہیں مگر ان کی اولادیں۔ کافی حصہ ہو گیا ان کو دیکھے۔“ کچھ سال پہلے دیکھی گئی اپنی کزنز اور لہجہ امریل سزا سے یاد آ گیا۔

”کر لینا شوق بھی پورا نہیں دیکھنے کا ہمیں تو آتا ہے تمہیں۔ ملاقاتیں بھی ہوں گی۔“ اسی نے اس کے شوق کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم سناؤ تمہاری تیاری کہاں تک پہنچی۔ ہم تو ساری تیاری ادھر آ کر ہی کریں گے۔ پاکستانی ایجنٹ

## مکمل ٹاپ





ڈرہسز۔ واہ۔ اس نے سوچ کر ہی خوب صورت کام والے کپڑوں کا مزہ لیا۔

”کچھ ہوئی کچھ ہو رہی ہے۔ چل رہا ہے سب کچھ۔“ اس نے کالے گھٹے بالوں میں ہاتھ پھیرتے اس نے سامنے عیشے میں اپنا عکس دیکھا اور کتنی دیر تک دیکھتی ہی رہی۔

”شادی کے ڈرہسز بھی فیضی اور تم اپنی مرضی سے لے لینا۔ آج کل تو ویسے بھی اتنی ورائٹی ہے کہ چوائس مشکل ہو جاتی ہے۔“ آخر وہ جس کا تذکرہ سننا چاہتی تھی اس کا ذکر ہو ہی گیا تھا۔ اس کا گلابی رنگ مزید گلابی ہو گیا۔

”ہوں۔“ ہولے سے بولتے ہوئے وہ مسہری پر پچھی چادر کے ٹرینائن پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ فیضی یعنی فیضان احمد کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی مگر ایسے

کے بیٹے کے رونے کی بدولت پوچھ نہیں سکی تھی۔  
”اچھا مہمان کو دیکھ لوں ذرا پہچانتا کریں گے اور ہاں تم دو چار اچھے اچھے ڈرہسز کی فوٹوز سینڈ کرو مجھے کچھ تو اندازہ ہو کہ کس طرح کا ڈریس لوں میں اپنے لیے۔“  
ایسے اسے تاکید کرتے فون رکھ کر چاچکی بھی اور وہ آنے والے دنوں کے سنہری خواب آنکھوں میں سہاے خواجوا مسکرا رہی تھی۔

برٹش لیجے میں بات کرنے والا وجیہ فیضان احمد صرف اس کی پیچھو کا بیٹا ہی نہیں تھا اس کو پسند بھی تھا۔ شاندار من چاہی زندگی اور من پسند ساتھی۔ اس کی دھڑکیوں کی لے لے تھم تھم کر چلتے لگی۔ وہ شاید پندرہ سال کی تھی جب پیچھو نے اسے فیضان کے لیے مانگا تھا۔ بلیا کی لاڈلی بہن تھیں وہ بھلا ان کی بات کیسے ٹال سکتے تھے۔ سو اس کے ہاتھ میں فیضان کے نام کی انگوٹھی جگمگانے لگی تھی۔ ہر دو سال بعد آنے والی اس کی پیچھو اگر اس کی انیڈیل تھیں تو ان کی اولادیں اس کی دوست۔۔۔

\*\*\*

محمد رؤف صدیقی پیر مل کے مالک تھے جو انہوں نے انتھک محنت سے بنائی تھی ان کی چار بیٹیوں میں سب سے بڑی منت جو انگلیش لٹریچر میں ماسٹر کر رہی تھی۔ تحریک بی ایس سی میں تھی اور حرم اور امل دونوں جڑواں تھیں اور میٹرک میں تھیں۔ حرار رؤف ان کی بیگم بڑھی لکھی خاتون تھیں انہوں نے بہت سال پہلے ایک اسکول کھولا تھا جواب اچھے اسکولوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی ساری دلچسپیاں اسکول کے ساتھ تھیں۔

رؤف صدیقی کی دو بہنیں تھیں۔ حنا صدیقی اور ہما صدیقی۔ دونوں بہت سال پہلے بیاہ کر پہلے گاؤں اور پھر لندن چلی گئی تھیں۔ حنا بڑی تھیں۔ گاؤں میں شادی ہوئی تھی پھر وہیں سے لندن جانے کا سلسلہ چل نکلا تھا اور ہما کا بھی انہوں نے ہی باہر بلایا تھا۔ حنا کی تین اولادیں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں اور ہما کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

رؤف صدیقی دونوں بہنوں سے چھوٹے تھے اس لیے ان کی اولادیں بہنوں کی اولاد سے چھوٹی تھیں۔ ہما کا بڑا بیٹا نعمان اور بیٹی ایسہ شادی شدہ تھے اور فیضان کے لیے انہوں نے منت کو مانگ لیا تھا۔

”من آج چلو میرے ساتھ شاپنگ کرلو۔ اتنے سارے کام جو پینڈنگ میں پڑے ہیں ان کو بھی تو نمٹانا ہے ویسے بھی تمہاری پیچھو کے آنے پر شاپنگ واپس بات تو اب ختم ہوئی کیوں کہ ان کو صرف دو دن پہلے آنا ہے۔ اب ساری تیاری وہیں سے کریں گی۔ تم بھی مکمل کر لو اپنی شاپنگ۔“

حنا بیگم اس کے سامنے جس کا گلاس رکھتے اسے تفصیل سے بتا رہی تھیں۔ انہوں نے آج اسی وجہ سے چھٹی کی تھی۔ منت ویسے ہی پیرز کے بعد فارغ تھی۔ اس نے سرسری سا انہیں دیکھا اور گھونٹ گھونٹ جوس اپنے اندر اٹھ لینے لگی۔

فیضان اس کا کرن اور منگیت تھا، مگر ساری بے قراری اور بے چینی صرف اسی کی طرف سے تھی۔ ہر کوئی فیضان کی بے انتہا مصروفیات کا ہی رونا روتا ناظر

آتا تھا۔

”میدر فیکٹری نہ ہو گئی آری والوں کے رول ہو گئے۔“ بے دلی سے سوچتے اس نے جوس ٹیبل پر رکھ دیا۔ ”عموماً فون بھی وہی کیا کرتی اور کبھی بھار اس سے بات ہو جاتی۔ وہ میز پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

”منت تم خود ہی شاپنگ کرلو۔ کوئی اچھا سا مگر چوز کر لیتا۔ میں تو ایک دن پہلے ہی آسکوں گا۔“  
اسے اس کی کچھ دن پہلے کی باتیں یاد آئی تھیں۔ اس نے کیسے آرام سے کہہ دیا تھا اور اس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ کچھ سال پہلے تک کیا نہیں کھہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے ٹانگیں گرسی کے اوپر کر لیں۔ کچھ دن پہلے تحریم کے ساتھ کی گئی گفتگو اس کے ذہن میں ابھرتی رہی۔

”وفیت کے ساتھ میچ جو ویل آگئی ہے۔ اچھا ہے ہاں۔“ تھی تو وہ اس سے چھوٹی مگر ملا کی سمجھ دار تھی۔ اپنے خدشات اس نے صرف تحریم سے شیئر کیے تھے

اور تحریم نے اسے مطمئن بھی کر دیا تھا۔

”ہاں پروگرام کیا ہے آج کا۔ میں نے اسی لیے چھٹی کی ہے اور تمہاری خالہ بھی آ رہی ہیں اسی مقصد کے لیے۔“ حنا نے اسے وہیں بیٹھے دیکھ کر اس کے قریب آکر پوچھا تھا۔ وہ سوپ کے لیے سبزیاں نکال رہی تھیں جانے سے پہلے کچھ کام نبھانے تھے۔  
”آپ تحریم کو ساتھ لے جائیں وہ پسند کر لے گی سب کچھ۔“

”شادی تمہاری ہے اور پسند تحریم کرے گی۔ واہ! تمہارا بھی جواب نہیں۔“ وہ اسے شاباشی دے کر کندھا تھپکتے لگیں۔ ان کے انداز پر اسے ہنسی آگئی۔  
”اچھا تھیک ہے ہو جاتی ہوں تیار۔“ بے دلی سے کہتی وہ چیل تھپکتے اٹھ کر کمرے کی جانب چل دی۔  
”ہاں ہاں مولیٰ ہے جناب کی۔“ انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

”آخر یہ فیضان آئیں نہیں جاتا۔“ اب وہ تحریم کے سر پر سوار تھی۔ اس کیج بناتے بناتے اس نے اس

کے منہ کے مجڑبے زاویوں کو دیکھا۔ چہرے پر بے زاری چھائی ہوئی تھی۔  
”منم ابیہ کو کیوں نہیں بلا لیتیں۔ آخر کو تمہاری سہیلی مند ہے تمہارے ذہن میں فٹور ڈالنے والی۔ اب اگر شاپنگ کروادے تمہیں۔“ بڑے محل سے اس نے اسے راہ دکھائی۔

”ہاں کہہ چکی ہوں کئی بار ہر ایک کی مصروفیات میری شادی کی منتظر نہیں اس کے بچوں کے بھی پیپر ہیں۔“

”مگر تم پیریوں سے فارغ ہو گئی ہو تو کیا ضروری ہے کہ باقی سب بھی ”ڈیلے“ ہوں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ شادی کی تاریخ آگے کر دی جائے جب سارے فارغ ہوں تو۔“ اس کے چیمپڑے پر اس نے پاس پڑا تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا۔

”من کی بیٹی! امیر اسارا اس کیج خراب کر دیا۔“ اسے گھر کے تھوہ اپنا اس کیج تھیک کرنے لگی۔

\*\*\*

بڑے سے صحن میں پھیلی دھوپ کی حدت ابھی جوں کی توں تھی۔ صحن میں لگا ہرے بھرے پتوں والا درخت اپنے نیچے چھاؤں کے ”سروانی“ اور اس کے بچوں کو اپنی پناہ میں لیے ہوئے تھا۔ کالے رنگ کی مرغی اور اس کے بچوں کو اس نے برآمدے سے درخت کے نیچے اوٹھتے دیکھا تھا۔

”حسین کے لیے روٹی بٹالوں پھر ان کو دانہ ڈالتی ہوں۔“ دل میں سوچتے ہوئے اس نے بچن کی جانب قدم بڑھا دیے۔

روٹی بنا کر رومال میں لپیٹتے اس نے سامن گرم ہونے کے لیے رکھا اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چوزوں کے آگے ڈالے۔ مرغی اور چوزے جیسے کھانے پر ایک دم ٹوٹ پڑے تھے۔ مرغی زمین پر چوچ مار مار کے بچوں کو متوجہ کر رہی تھی۔ انہیں وہیں چھوڑ کر وہ اندر گئی، تھکیت کر بیڈ سٹل فین برآمدے میں لاٹی، چٹائی، بچائی اور ایک بار پھر کمرے

ہی غلطی ہے سب۔ اگر پہلے انہوں نے دیکھے لکچ میں اعتراض کیا۔

”تو آپ مجھے پہلے بتا دیتیں۔ ذلیل کرنے کے لیے کیا آپ کو میں ہی ملا تھا جب کہ سب لوگ میرے گھر میں جمع ہیں۔ بات کے آنے سے پہلے آپ مجھے بتا رہی ہیں کہ آپ کا بیٹا بھاگ گیا ہے۔“ انہیں شدید غصہ آیا تھا ان پر لسی لیے آواز اونچی ہو گئی۔ ہا نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے معاف کر دو روٹ۔“ انہوں نے ان کے بندھے ہاتھوں کو نظر انداز کر کے دوسری جانب منہ پھیر لیا۔ ان کا عقد قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

”اگر ایسا ہی ہے قابو اور آوارہ تھا آپ کا بیٹا تو میری بیٹی۔ مجھے پہلے بتا دیتا۔“ نہ جانے انہوں نے خود کو کیسے کنٹرول کیا تھا۔

”جائیں ایسا یہاں سے چلی جائیں اس سے پہلے کہ مجھے

خود پر قابو نہ رہے۔“ ان کا چہرہ شدت جذبات

کئی مہینے گزر گئے تھے۔ اس کا اپنا کوئی بہن بھائی تھا نہیں جس سے مشورہ کرتا۔ جتنی کے بھائی سے مشورہ کرنا چاہیے۔ اس نے سوچنے کا وقت لے لیا۔

\*\*\*

”ہا ایسا! کیا ریس لگا کر آئی ہیں۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟“ بڑے سے لان میں مہمانوں کا استقبال کرتے اسے ہاندر جاتی نظر آئی تھیں۔ ابھی رات مندی کے فنکشن پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پرسوں رات ان کی ساری فیملی کو انہوں نے ڈیورٹ پر ریو کیا تھا۔ گھر لانے کھانا کھانے اور گپ شپ میں وقت گزرنے کا علم ہی نہ ہو سکا تھا۔ ان کے بہت روکنے پر بھی وہ نہیں رکتے تھے۔ ان کے ہونٹوں میں کمرے پہلے سے بک تھے۔ سودھ سب دوسرے چلے گئے تھے۔ ہما کا چہرہ دیکھتے انہیں عجیب سا احساس ہوا تھا جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر رہے تھے۔

”روٹ۔ روٹ۔“ کمرے کا دروازہ بند کرتے کوئی تیسری بار ان کا نام پکارتے وہ پھر سے چپ ہو گئیں۔

”سب ٹھیک تو ہے نا ایسا۔ امانت بھائی کی طبیعت۔“ ہونٹوں کے بخارنے انہیں کل کافی پریشان کیا تھا۔

”وہ ٹھیک ہیں۔ بس فیضان واپس چلا گیا ہے۔“ ان کی طرف سے جیسے دیکھے لکچ میں دھاکا لگایا گیا تھا۔ ”کیا۔ کیوں؟“ کیسے چلا گیا واپس۔“ ہما کے الفاظ توان کی سمجھ میں آگئے تھے شاید مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ہی اسے قسمیں دے دے کر منانا یہاں آنے پر راضی کیا اور آج۔“ آپ کچھ چھپانا ممکن نہیں تھا۔ وہ پیکٹ پھینک کر روٹنے لگیں۔ وہ من سے وہیں کھڑے رہے۔

”کیوں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

”کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر میں۔ میری

دریافت کرنے والا تھا اس کی بات کے دوسرے حصے پر ٹھک کر پوچھنے لگا۔

”رجو تو باہر ہوتی ہے ہاں پتا چلا تھا کہ مجھے آئی ہوئی ہے ہاں بچوں کے ساتھ جب اہل زندہ تھیں تو بہت آنا جانا تھا اس کا یہاں بیٹھا ہوا تھا اہل نے اسے۔ مجھے بھی بھائی کہتی تھی۔ دیکھو کتنے دن ہو گئے۔ ملے بھی نہیں آئی ایک بار بھی۔“

حسین کو زبانی بولنے کی عادت تھی۔ وہ بولا تو بولتا ہی چلا گیا۔ ”ویسے کیا کہہ رہی تھی۔“

”جتنی ہے۔ دوسرے لندن میں مسجد میں بچوں کو قرآن پڑھایا کر دیا۔ اس کا میاں وہاں مسجد کی انتظامیہ میں ہے۔ کہتی تھی بھائی کو بھی لے جاؤں گی اور مجھے بھی۔ آپ سے ملنے آئے کی تو میاں بھی ساتھ آئے گا اس کا۔“ اس نے اپنی طرف سے اسے حیران کر دیا تھا۔

”او مذاق کر رہی ہوگی۔ بڑی مذاقہ تھی۔ ہر وقت ہاسے میں بڑی رہتی تھی۔ اب بھی وہی کر رہی ہوگی۔ ویسے بھی ہم اپنا کھار پھوڑ کر نئی جگہ پر کیوں جائیں گے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”یقیناً وہ بہتر جانتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ مذاق ہی کر رہی ہو بات آئی گئی ہو گئی تھی مگر اگلے ہی دن اس کی بات غلط ثابت کرنے کو وہ اپنے میاں کے ساتھ چلی آئی تھی۔

”بھائی! ہاش، غواہ اور اچھی جگہ پھر مسئلہ کیا ہے چلے میں۔“

رجو (رضیہ) کامیاں عاطف اچھا خاصا پڑھا لکھا چلتا پرزہ قسم کا بندہ تھا وہی حسین کو یقین دلانے میں کامیاب رہا تھا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔

”اگر آپ اپنے لیے پریشان ہو تو نہیں ہوں ہاں وہاں آپ کی نوکری کا بندہ بہت مزاحمت۔“ حسین کے سوچنے پر اس نے اس کی یہ پریشانی بھی دور کر دی تھی۔

وہ تب سے یہی سوچ رہا تھا کہ یہ آفر تو اس کی جتنی کے لیے تھی تو وہ کیا کرے گا وہاں۔ اہل کا انتقال ہوئے

میں آگئی۔ حسین آنے والا تھا۔ جب وہ کھانا کھا چکا تو بچے پڑھنے آنا شروع ہو جاتے تھے اس کے گھر کی ہر روز کی مصروفیت تھی اور اس میں کبھی کبھار ہی بدلاؤ آیا کرتا۔

حسین کی گاؤں کے کڈ پر دکان تھی۔ تھوڑی بہت زمین بھی تھی جو اس کے اور اس کے چاچے کے بیٹوں کے درمیان تنازعے کا باعث تھی جس کی وجہ سے کئی سال سے مقدمہ چل رہا تھا۔ وہ تین سال پہلے گجرات کے اس دور دراز گاؤں میں بیاہ کر آئی تھی۔ باجرہ احسان اس کے ابو کی دور پرے کی بہن تھیں اور حسین ان ہی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ آئی ابو کے مرنے کے بعد ان بہن بھائیوں کی زندگی جن مشکلات کا شکار رہی تھی اس میں حسین کا رشتہ ایک نعمت کی طرح تھا جسے فوراً قبول کر لیا گیا تھا اور وہ لاہور سے بیاہ کر گجرات آگئی تھی۔ اب تو وہ اس زندگی کی عادی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی حسین کی روز بروز بڑھتی محبت اسے کچھ اور سوچنے ہی نہ دیتی۔

”کیا حال ہے میری جتنی کا۔“ کیسا گزرا آج کا دن۔ ”پورے دن کی تھکاوٹ کے باوجود وہ اسے دیکھ کر ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔

”بالکل ٹھیک۔ آپ سناؤ، کیسا گزرا آپ کا دن۔“ اس نے اس کا دھیان خود سے ہٹاتے سامنے رکھی روٹی کی طرف دلایا اور اس سے پوچھنے لگی۔ اس کے دیکھنے پر وہ اسی طرح تجھو ہو جاتی تھی۔

”چھ گزرا اس آج شہر جانا پڑا دکان کی کچھ چیزیں ”ہم“ (ختم) گئی تھیں، کئی دنوں سے لوگوں نے پوچھ پوچھ کر جان تک کی ہوئی تھی۔ آج آخر کار لے ہی آیا جا کر۔“ دال کے ساتھ روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالتے وہ اسے قصیلا بتا رہا تھا۔

”آج صبح ماسی حلیما اپنی بیٹی کے ساتھ آئی تھی۔ بڑی عجیب بات کر کے گئی ہے۔“ اس کی بات سنی سے سننے کے بعد اس نے اچانک بات شروع کی تھی۔ ”ہیں کیا عجیب بات۔“ وہ جو ماسی کا حال چال

ہیوٹی ہکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم  
 کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے  
 بالوں کو مشروط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت -/120 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر ہر روزی آرڈر سے منگوانے والے  
 روٹوں میں -/300 روپے تین روٹوں میں -/400 روپے  
 اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل ہیں۔

بڑے ذراک سے منگوانے کا پتہ  
 جی ٹی ٹکس 53 اور گریڈ ایکٹ نام کے پاس جاس روڈ کراچی۔  
 ذی خیر دے کے لیے  
 مکینہ عمران ڈاکسٹ 37 اور روڈ کراچی۔ فون نمبر 32216361

اور اشتعال سے دھک رہا تھا۔ مٹھیاں بند کرتے کھولتے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کریں۔  
”یہ صدمہ میری ساری نکیوں کا۔ امی ابو کے بعد آپ دونوں کی تعلیم شادی، آپ کا باہر میٹل ہونا۔ کہاں کی رہی تھی جو آپ کی اولاد مجھے یوں ذلیل کر گئی۔ ایسے کی شادی، نعمان کی شادی ان کے رشتے۔ رؤف بھی کوئی رشتہ دیکھو یہاں کے لڑکوں سے تو میں اپنی لڑکی کا رشتہ بالکل کرنے کی نہیں۔“ انہوں نے اس کی نعل اندلی۔

وہ آپ سے باہر ہو رہے تھے، تھوڑی دیر کو سانس لینے کے لیے رکے۔ اسی وقت حرا اور حنا کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ کمرے کی فضا ان کی توقع کے بالکل خلاف تھی۔ کونے میں روٹی ہوئی تھا اور سرخ چروہ اور تیز آواز میں بولتا رؤف۔

”آپ کی آواز باہر تک جا رہی ہے۔ آہستہ بولیں۔ کچھ بتا بھی تو چلے کہ آخر ہوا کیا ہے؟“ حرا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”پچھتے ہو۔ ان سے پوچھو، ان کا بیٹا بھاگ کر لندن چلا گیا انہیں سب کچھ بتا تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کہیں اور منہ کالا کر رکھا ہے اس نے پھر بھی یہ اسے پہلا پھسلا کر یہاں لے آئیں، پوچھو ذرا۔“ حرا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

”یا اللہ خیر! باہر اتنے سارے مہمان جمع ہیں۔ اب کیا ہوگا؟“ انہوں نے حنا کی جانب دیکھا جو جن کھڑی بھی رؤف کو چپ کرانے اور بھی ہما کی ہچکچوں کو بند کروانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ”ہما! اسے کال کرنے کی کوشش کرنا تھی۔ اگر یہیں ہے تو اسے سمجھا لیتے۔ حنا نے دوپٹا سنبھالتے رمان سے ہاتھ سے کہا تھا۔

”آپ! بڑی کوشش کی پر وہ غلامی کر چکا تھا۔ اب تک تو بیچ بھی گیا ہوگا۔“  
”تو آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ جاؤں چلی جائیں

یہاں سے۔“ رؤف نے ہاتھوں سے انہیں دروازے کی جانب دھکیل دیا۔

وہ بھائی کے عھیلے چہرے کو نظر بھر کر دیکھتے وہاں سے باہر نکل آئیں۔ نا فرمان اولاد کیسے ذلیل در سوا کرتی اور کروائی ہے اس کا احساس کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔ آج ان کا اکوٹا بھائی ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو گیا تھا۔ مرے قدموں کو گھٹیت کرنے جانے انہوں نے گیت تک کاراستہ کیسے طے کیا تھا۔

کمرے میں موجود تینوں انوس ایک، دوسرے کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے۔ ”اب کیا ہوگا؟“ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ان تینوں کو معلوم ہوتے ہوئے بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔

”وہ اور بس، میرا بار نثر دو بار رشتہ مانگا اس نے نفع سے منت کا۔ میں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگا بھائی باہر لڑکوں پر اعتبار نہ کرنا۔ میں نے خوب دلائل دیے اسے۔ اب اس کو موقع مل جائے گا مجھے ذلیل کرنے کا۔“ سر ہاتھوں میں تھا اسے وہ اچانک بولنے بولتے خاموش ہو گئے۔

”آپ! آپ تو اسی شہر میں رہتی ہیں۔ آپ نے بھی کچھ نہ بتایا۔“ انہوں نے پریشان بیٹھی حنا سے شکوہ کر ڈالا۔

”بھائی! میں گھر میں رہنے والی عورت۔ مجھے کیا پتا۔۔۔۔۔“

”کچھ کریں رؤف! میری تو بیٹی کی زندگی خراب ہو گئی۔“ حرا روتے ہوئے ان کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔

”چار چار بیٹیوں کا ساتھ ہے۔ باقی رشتے کیسے کریں گے ہم۔ کیا بتائیں گے لوگوں کو۔“

رؤف صدیقی بھی کرسی پر بیٹھ جاتے بھی اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگتے۔ حرا ہاتھوں کو ایک دوسرے سے مسلتے، غم آنکھوں سے نہ جانے کیا سوچے جا رہی تھیں۔ ”اب کیا ہوگا“ کا ڈراؤنا جن منہ کھولے ان سے سامنے تھا۔

”آپ! آپ ہی کچھ بتائیں، کریں اب باہر جا کر

لوگوں کو کیسے بتاؤں کہ بارات نہیں آ رہی، کیسے دوں گا جواب میں لوگوں کے سوالوں کا۔“ پنڈال میں پوچھتے جانے والے سوالوں کو سوچ کر ہی ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

”دولہا بھاگ گیا۔“ بھی دلہن تو سنی تھی بھاگتے یہاں تو دولہا ہی غائب ہو گیا۔ نیا زمانہ ہے بھی نیا زمانہ۔“

”آپ کا تو بھانجا تھا ناں پھر ایسا کیسے ہو گیا۔“

”کڑی لڑکی پسند نہیں تھی اسے۔“

”لڑکی میں ہی کوئی عیب ہو گا۔ عین وقت پر بتا چلا تو چھوڑ کے چلا گیا۔“

طرح طرح کی آوازیں ان کی سوچوں کو پر آگندہ کر رہی تھیں۔ نیوی بلیوز سوٹ میں ملبوس باوقار سے رؤف صدیقی کے چہرے کا سارا خون جیسے کسی نے نچوڑ لیا تھا۔

”خوصلہ رکھو رؤف! اللہ بہتر کرے گا۔“ آف وانٹ شیفون کے سوٹ میں بڑے سے دوپٹے سے خود کو مکمل طور پر ڈھانپنے حنا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔

”حرا تم بھی حوصلہ کرو۔ بیٹھو یہاں۔“ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر روٹی ہوئی حرا کو بیڑ پر بٹھادیا۔

”پانی لاتی ہوں تمہارے لیے پھر مل کے کچھ سوچتے ہیں۔ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“

ان دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر وہ کچھ دیر کے لیے منظر سے غائب ہو گئی تھیں۔

”انسب بیٹے! کہاں ہو تم۔ ابھی تک پہنچے نہیں یہاں۔ میں تو تمہارا انتظار کر رہی ہوں کب سے۔“

ان کا لاؤلا فریادوار بیٹا شاید اس بار اسی لیے پاکستان آیا تھا۔ انہیں اس پر خود سے زیادہ یقین تھا مگر اس سے بات کرنا بھی ضروری تھا۔

”بس امی! ابھی ماموں کے گیت سے اندر آیا ہوں۔ سوچا تھا پہلے بیچ کر ماموں کی کچھ پہلپ کروں گا، مگر جلدی نہیں آسکا۔“ وہ قریب ہی تھا انہیں حوصلہ سا ہوا۔

”انسب! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے سیدھے اندر آ جاؤ۔“ فون بند کر کے وہ اس کا انتظار کرنے لگیں۔

\*\*\*

”کیا یہ ضروری ہے کہ دوسروں کا پھیلایا ہو آگندہ ہمیشہ ہم ہی سمیٹیں؟“ بلیک ڈنر سوٹ میں ان کے سامنے کھڑا ان کا چہرہ بیٹا ان سے جواب طلب کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک تنبیہی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ اس کی صاف گوئی سے سراسیمہ ہو گئی تھیں۔

”اس طرح کی فضول باتوں کی مجھے تم سے توقع نہیں تھی۔“ ان کا لہجہ تادیبی تھا۔

”ہاں توقع تو بہت سی چیزوں کی نہیں ہوتی۔ آپ کے عزیز ازاں جان، ہسنوی اور ہمن نے کیا کیا؟ اس کی توقع تھی کیا آپ کو؟“

وہ نہ جانے کیا جتنا ناچ رہا تھا۔ وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئیں۔ وہ ان کے ساتھ ہی پاکستان آیا تھا، مگر کراچی اپنے دوست کی شادی اٹینڈ کرنے چلا گیا تھا۔ کچھ کام اس کے ابو کے تھے جنہیں نہانے کے بعد وہ یہاں پہنچا تھا۔ اس کا انداز تھوڑا بدتمیز، تھوڑا متفرسا تھا۔ وہ کتنی دیر اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ وہ کبھی کبھار ہی تو ایسا بد مزاج ہوتا تھا۔

”بنو میں نے پوچھا ہے وہ بتاؤ، تم راضی ہو کہ نہیں۔“ دو ٹوک انداز میں اس سے بات کر کے وہ اسے دیکھنے لگیں۔

اس نے ایک لمبا گہرا سانس لے کر کندھے اور ہاتھ اوپر اٹھائے جیسے ساری صورت حال اس کی سمجھ سے باہر ہو۔

”کیا یہ سب آج ہی ضروری ہے۔“

”ہاں۔“ اس کے پوچھنے پر انہوں نے صرف ایک لفظ کہا۔

”میرا بھائی میرے لیے کیا ہے۔ تم جانتے ہی ہو۔ اگر آج میں اس کا ساتھ نہیں دوں گی تو کون دے گا۔“ اب کے ان کے انداز میں منت والا انداز در آیا

تھا۔

”پہلے بھی ایک بار ”ساتھ دینے“ کا انجام بھگت تو چکی ہیں آپ؟“ متوازن ہو، ہمارے لیے وہ انہیں جو یاد دلایا تھا، وہ انہیں بھولائی کب تھا۔

”تمہیں غصہ آجاتا ہے جس بات پر آتا ہے یہ بھی علم ہے۔ مگر اس بات کو کرنے کے لیے نہ جگہ مناسب ہے نہ وقت۔ تم اپنی شادی کا ہر اختیار مجھے دے چکے ہو، یاد ہے یا نہیں؟“ آنے سے پہلے ہی تو انہوں نے اس سے بات کی تھی۔

”تو ٹھیک ہے، آپ کی مرضی۔“

اس نے کندھے اچکا کر انہیں مکمل اختیار دے دیا۔ جیسے معمولی بات ہو۔ تھوڑا اختلاف تھا، لیکن خیر۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا نہ خوشی نہ غم۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”میرے بچے! جیتے رہو۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو غم۔“

اس پر بے تحاشا ہار آیا تھا، انہیں۔ وہ لینے تو پانی آئی تھیں، مگر پانی کو بھول کر بھی بھائی کی سیرابی کا انتظام کر لیا تھا۔

\*\*\*

”رووف! انسب کو اپنا بیٹا بنالو۔“

ایدا وغیبی کے منتظر رووف صدیقی کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے، چونک کر مڑتے انہوں نے حنا اور انسب کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔

حنانے حرا کا ہاتھ تمام لپٹا جو ابھی تک اسی جگہ کھڑی تھیں جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔ رووف صدیقی انسب کو سامنے دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئے تھے۔ چھ فٹ سے لگاتار قد، فزانت سے چمکتی آنکھیں، گندمی رنگت، مضبوطی سے جھکے قدم۔ ابھی پچھلے سال ہی تو وہ لندن میں اس سے ملے تھے۔ فیضان پہلے ہی اپنے بچپن سے ملنے دئی جا چکا تھا۔ ہاں انسب سے ملاقات ضرور ہوئی تھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہو کر آئے تھے۔ یونیورسٹی آف لندن سے، سسٹری کی ڈگری لینے کے بعد

آج کل نہ جانے کیا کر رہا تھا۔

دل غم میں بیٹنی الجھنیں پریشانیاں اور اب۔۔۔ ”آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ وہ بے یقین سے تھے۔ ایک دم جیسے انہیں اندھروں سے کھینچ کر باہر نکال لیا گیا تھا۔

”باہر کے لڑکوں کا کوئی اعتبار نہیں۔“ اور پس ان کے اندر منہ پھاڑ کے چلایا۔ انہوں نے اندر کی آواز کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”آپ! آپ نے انسب کی مرضی معلوم کر لی۔“

”تو اس کی مرضی کہاں ہو گی بھلا۔ اسے پڑھائی سے فرصت ہو تو کچھ اور سوچے یا پھر باپ کے ساتھ ابھی بھی تو اسی کا سارا بندوبست کر کے آیا ہے۔ آرڈر لیٹ ہو گیا تو اس بار انہوں نے خود آنے کے بجائے اسے بھیج دیا۔“

ان کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ رووف کو اس کے اچھا ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ جو تھوڑا متذبذب تھا، حرا کے ہاتھ دبانے اور سر ہلانے پر وہ بھی جا رہا تھا۔ انہوں نے چھوٹی بہن کو ہمیشہ تنقید کرتے بڑی بہن کا مذاق اڑاتے دیکھا اور سنا تھا۔ وہ کبھی ٹوک دیتے کبھی نظر انداز کر دیتے، لیکن ان کے لیے دونوں برابر تھیں۔ کیا ہوا جو ہمارے پاس زیادہ پیسہ تھا۔ فیضان بینک میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ امانت بھائی کا لیدر کا کاروبار تھا تو بڑی بہن بھی اچھا کھاتی پیتی تھیں۔ اولاد نیک تھی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا۔

انہوں نے خود بھی تو صفر سے شروع کر کے سب کچھ حاصل کیا تھا۔ جدی ریشتری رئیس تو تھے نہیں۔ ”ٹھیک ہے آپ! جیسے آپ کی مرضی۔“ انہوں نے کھینچ کر انسب کو سینے سے لگالیا۔

\*\*\*

”وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو یوں بے غیرتوں کی طرح منہ چھپا کے تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہ بھاگتا۔ اللہ نے اسی میں تمہارے لیے بہتری لکھی تھی۔ اگر بعد میں کسی اور سے شادی کر لیتا یا عورتوں

کے پیچھے۔“

بہن سے باتیں کرتے انہیں اس سے حد درجہ حیا آتی تھی لیکن جو کچھ وہ کہہ رہے تھے، گناہ ضروری تھا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھے وہ اسے سمجھاتے رہے۔ نہ جانے وہ خود کو کسلی دے رہے تھے یا اسے۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ جیسے بچے کے ہاتھ سے من پسند کھلونا چھین کر کوئی ان چاہا کھلونا پکڑا دیا جائے۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ اسے اس شخص سے شادی نہیں کرنی تھی جسے وہ کل تک طنز و تشکیک کا نشانہ بناتی رہی تھی، مگر اس کی تو ساری سوچیں ہی منجمد ہو گئی تھیں۔ ”باہر لوگ جمع ہیں۔ بارات کا پوچھ رہے ہیں۔“ اسے اپنی جگہ جیسے کھڑے دیکھ کر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

وہ غصے کے تیز تھے۔ ان کی بیٹیاں ان سے اتنی فری نہیں تھیں، مگر وہ اس کے جذبات سمجھ سکتے تھے۔ اس پر جیسے سکتے طاری ہو گیا تھا۔

”ہر کیا کہیے ہو سکتا ہے۔ فیضان اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے یقیناً مذاق کیا ہو گا۔“ سوچتے سوچتے اس نے اچانک کہا۔ آواز کمزور اور لہجہ بے یقین تھا۔

”مذاق۔ بارات لانے کے انکار۔ مذاق!“ حرانے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے میری جان۔“

خوب صورتی اور مہارت سے کیے گئے میک اپ، سنہری عروسی لباس میں فیضان کے لیے پور پور نئی منت، تھوڑی دیر پہلے تک کتنی سرشار تھی، مہندی کی خوشبو اور اس کی سیسیلوں کی بھٹی سے باہر کو ایک دم جیسے ویران ہو گیا تھا۔ حرانے سب کو باہر نکال دیا۔ صرف تحریم ایک کونے میں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اور منت سوچوں میں گم تھی۔

”میری عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے منت۔“ رووف صدیقی ہوئے سے کہہ کر ان ہی قدموں پر زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک دم ہوش میں آکر وہ تیزی سے ان کی جانب بڑھی۔ اسے زمین پر بیٹھے باپ کے سوا کچھ یاد

نہیں رہا تھا۔

میکا کی انداز میں نکاح نانے پر دستخط کر کے وہ انسب کی ہو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے ایک رذیل شخص سے چھٹکارا ملنے پر خوش ہونا چاہیے یا ایک ان چاہے شخص کے ساتھ پر رونا چاہیے۔ آگے کا سفر نہ جانے کیسے کٹنے والا تھا۔ وہ تو انہی سے تھک گئی تھی۔

پچھو اسے چوم رہی تھیں۔ لپٹا رہی تھیں۔ مبارک بادیں وصول کر رہی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھے جارہی تھی۔ مگر لال رنگ، خطرناکی انداز میں اس نے انگلیوں سے مہندی کو کھینچنا شروع کر دیا۔

\*\*\*

”کیوں پریشان ہوتی ہے میری بھگنی۔“ عاطف اور راجو نے اتنا زور دیا تھا کہ وہ آدھارا ضعیف تو ہو ہی گیا تھا۔ باقی جس جس سے بھی مشورہ کیا تھا انہوں نے بھی مثبت جواب ہی دیا تھا۔ عاطف کو کوئی لالچ بھی نہیں تھا۔ سارا کام بھی خود کروا رہا تھا تو انکار کرنا اسے مشکل لگنے لگا۔ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے گونانا اسے بے وقوفی لگی، مگر جتنی نہ جانے کیوں دوسروں میں گھری ہوئی تھی۔

”تین سال ہو گئے ہماری شادی کو اور ابھی تک ہم۔۔۔ ہمارا شادی میرے بعد ہوئی تھی۔ دو دو اولادیں لے کر بیٹھی ہے۔“

اولاد نہ ہونا ایک ایسا غم تھا جو اس کے ہر غم پر بھاری تھا۔ ہر خوشی اس ایک غم کو سوچ کر آدھی ہو جاتی اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے نہ باہر جانے کی خوشی تھی، نہ بہتر زندگی نہ کسی اور چیز کی۔ اسے تو صرف ایک ہی دکھ تھا جو ہر چیز پر حاوی ہو گیا تھا۔

”تین سال تو تو نے ایسے کہا جیسے تین کے بجائے تیس سال ہو گئے ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں سب ٹھیک ہے۔ اللہ کی رضا ہو گی تو اولاد بھی ہو جائے گی۔“

اس نے اس کا نرم ہاتھ پکڑ لیا، پٹنگ۔ دونوں ساتھ ساتھ ہی تو بیٹھے تھے۔ اس کا سر اس کے کندھے پہ ٹکا

تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس میں انگلیاں پھیرنے لگا۔  
 ”زمین کے کانڈ تو میرے ہی نام ہیں۔ بات کرتا  
 ہوں رب نواز سے، جتنے پیسے دے اسنے ہی ٹھیک ہیں۔  
 دکان بھی بیچنے کا کہتا ہوں۔“  
 ”فیصل پر پہنچ ہی گیا تھا۔ اگرچہ فیصلہ مشکل تھا، مگر  
 آفر پر کشش تھی پھر زندگی کو بہتر بنانے کے مواقع زیادہ  
 تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے مختلف  
 سوچوں میں گھرے ہوئے تھے اس کی ہر سوچ بچوں  
 سے شروع ہو کر بچوں پر ختم ہو جاتی، مگر وہ مروتھا اسے  
 اور بھی بہت کچھ سوچتا تھا۔ اگر زندگی ایک موقع دے  
 رہی تھی تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتا برا تو نہیں تھا۔  
 پھر کچھ مینوں بعد ہی وہ سب کچھ بیچ باج لندن کے  
 اس گنجان آباد علاقے میں آگئے تھے۔

\*\*\*

”میں نے کہا جانے سے پہلے ایک بار آپ سے مل  
 لوں؟“ وہ بے حسی بے دلی اور لاتعلقی کی آخری حدوں  
 کو چھوتی اسی کمرے میں موجود تھی۔ نکاح کے بعد  
 سب کھانا کھانے جا چکے تھے جب وہ اچانک ہی اس کے  
 سر پر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔  
 ”میں نے کہا اتنے ہی ننھے کا کے ہوتاں تم کہ جو امی  
 کہیں گی وہی کرتے رہو گے۔“  
 وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا، مگر نہ اس نے سر  
 اٹھایا تھا نہ اٹھانے کی خواہش تھی۔ سر تو تباہ اٹھاتی  
 جب دیکھنے کی کوئی خواہش ہوتی، مگر اسے اس سے کوئی  
 سروکار نہ تھا۔ ہاں زہریلی سوچیں ضرور ذہن میں جنم  
 لے رہی تھیں۔ اس کے پرسکون انداز پر اس کے اندر  
 بھانپنے جلنے لگے تھے۔  
 ”یہی آرام سے بات کر رہا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ  
 ہو۔“

وہ کرسی سمجھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اسے کس  
 طرح اس کے سر تھوپ دیا گیا تھا۔ کیا وہ اتنی بے کار  
 فالتو اور کم رو تھی روئیے جانے کاغذ اب سستے شاید پتھر  
 ہو گئی تھی۔ اپنی سوچوں میں گم شاید اس کی موجودگی

بھی بھول گئی تھی۔  
 اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اسے انگوٹھی پہنا دی۔  
 ”میں نے دی ہے۔“ وہ تباہا تھا۔  
 ”میں نے دی ہو یا تم نے خودی ہو۔ مجھے کوئی سروکار  
 نہیں۔“ اس کی خود سری ایک دم عود کر آئی اس نے  
 ہاتھ گود میں دھر لیا۔  
 اسے کچھ سال پہلے کا مکمل انس یاد آگیا۔ ذرا ذرا  
 سی بات پر گھبرا جانے والا عدم اعتماد کا شکار جسے کئی بار  
 اس نے بے وقوف بنایا تھا۔ اس کی نظروں کی پیش  
 محسوس کرتے ہوئے بھی اس نے اس کی طرف نہیں  
 دیکھا تھا۔ اسے کوئی شوق بھی نہیں تھا اسے دیکھنے کا۔  
 وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔

”تم ہوتے کون ہو مجھے اس طرح دیکھنے والے۔“  
 مگر نہیں کہہ سکی تھی ابھی سارے حقوق خود تفویض  
 کیے تھے اس نے اسے دیکھنے کے۔۔۔

”انسب بیٹا! تمہارے ابو تم دونوں کو دیکھنا چاہتے  
 ہیں۔“ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد حنا کمرے میں داخل  
 ہوئی تھیں۔ ”اس کا پانچ آن ہے۔ لو بات کرو۔“  
 ”چھپچھورے سب ہی چھپچھورے ہیں۔ ان کی تو  
 جیسے مراد پوری ہو گئی ہے۔ میری شادی وہاں نہیں ہوئی  
 تو انہیں موقع مل گیا۔“  
 یہاں وہاں سب کے لیے نفرت ہی نفرت تھی اس  
 کے اندر۔

پچھوسے فون پکڑ کر اس نے خود سلام کر کے اس  
 کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بھی سلام کیا تھا۔ جانے  
 کیوں کیا تھا۔ خود بھی نہیں جانتی تھی۔  
 ”مبارک ہو بیٹا! بس جلدی سے آجاؤ یہاں  
 تمہیں پتا ہی نہیں کہ ہم سب کتنے بے قرار ہو رہے  
 ہیں۔“ وہ بڑے جوش میں نہ جانے کیا کیا کہہ رہے  
 تھے۔

”نہیں میرے اربابوں کے خون اور بے عزت ہونے  
 کی مبارک باد قبول کر لینی چاہیے مجھے۔“  
 ”چھا ہوا اس نالائق کے لیے لڑکی ڈھونڈنے نہیں  
 جانا پڑا اور اسے ورتا بھی کون بھلا۔“

”جی ابو جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“  
 وہ اسے چھپڑ رہے تھے اور وہی بھر کے چھڑ رہا تھا۔  
 ”ہاں واقعی! آپ ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ اس دو  
 لکے کے دکان دار کو جو باپ کے ساتھ کپڑوں کی دکان پر  
 بیٹھتا ہے۔ اسے بھلا مجھ جیسی لڑکی کہاں ملتی۔ میری  
 بد قسمتی ہے نا۔“

اس کی سوچیں خطرناک حد تک زہریلی ہو رہی  
 تھیں۔ کبھی خود پر ترس آتا، کبھی خود کو بد قسمت  
 سمجھتی اور کبھی بہت اونچا بٹھا جتی کہ۔۔۔  
 ”بھابھی! جلدی سے ہمارے گھر کی رونق ہمارے  
 پاس بھیج دیں، ہم سے انتظار نہیں ہو رہا اب۔“ اب  
 وہ حرا سے مخاطب تھے جو حنا کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی  
 تھیں۔

”ہاں ہاں بھائی صاحب! آپ کی امانت ہے۔ بس  
 کچھ دن انتظار کر لیں۔ باہی کے ساتھ آجائے گی آپ  
 کے پاس۔۔۔ پیپر وغیرہ تو بن چکے پہلے ہی۔“ حرا نے ہنسنے  
 ہوئے کہا۔

طوفان آکر جا چکا تھا۔ سب مطمئن تھے خوش تھے  
 سوائے اس کے۔ وہ خود کو بہادر سمجھتی تھی۔ اس لیے  
 ابھی تک روٹی نہیں تھی۔  
 ”زندگی تو میری برباد ہوئی ہے۔ سب ویسا ہی چل رہا  
 ہے۔ کسی کو اس سے کیا تعلق واسطہ۔“  
 منقی انداز میں سوچتے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا  
 تھا۔

\*\*\*

”کیا میرے چار بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی تم مجھ  
 سے اسی طرح شرمایا کرو گی۔“ اس کے گلاں گالوں کو  
 انگلی سے چھوتے اس نے اس کے کان کے پاس کہا  
 تھا۔

آج کل اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ  
 خوشی جس کا انتظار وہ چار سالوں سے کر رہے تھے۔  
 لندن آنے کے کچھ مینوں بعد ہی گئی تھی۔  
 ”کیا ہر لڑکی اس روپ میں اسی قدر خوب صورت

ہو جاتی ہے یا صرف وہ ہو گئی تھی۔“ وہ سوچتا۔ اس پر تو  
 نظری نہ تھرتی تھی۔

لندن آنے کے بعد ایک دو کمروں کا چھوٹا فلیٹ  
 انہوں نے مسجد کے قریب ہی کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ  
 مسجد جانے لگی تھی اور وہ عاطف کے آفس کے باہر  
 کے کام بنانے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی تعلیم زیادہ نہیں  
 تھی۔ صرف ایف اے تک ہی پڑھا تھا، مگر سیکھنے کی  
 لگن اور شوق نے اسے سمیز لگائی تھی۔ ان مینوں  
 میں اس کی شخصیت میں بہت سی ظاہری تبدیلیاں آئی  
 تھیں۔ جو عاطف کے بقول ضروری تھیں۔ شلوار  
 قمیص کے بجائے جینز پہننے لگا تھا۔ انگلیش کی شبہ تھی۔  
 مگر اب بہت اچھے طریقے سے بول لیتا تھا۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ میری قسمت کا  
 چمکتا ستارہ تم ہی تو ہو۔“ اس کے نم ہاتھوں پر گرفت  
 کچھ اور مضبوط ہو گئی تھی۔

\*\*\*

”آپ اب جو بھی کر لیں مجھے کہیں نہیں جانا، آپ  
 کی عزت بچ گئی سب کے سامنے، مگر اب۔۔۔“  
 خود سری اور پد تیزی کے ساتھ بولتی انہیں وہ کوئی اور  
 ہی منت لگی تھی۔

انسب اسی دن واپس چلا گیا تھا۔ حنا کو اپنے سرسالی  
 عزیزوں کے پاس جانا تھا۔ اس لیے وہ راولپنڈی چلی گئی  
 تھیں۔ ان کی واپسی میں ابھی پندرہ دن تھے وہ اسے  
 سمجھانے بیٹھی تھیں اور وہ جو اتنے دن سے خاموش  
 تھی۔ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ وہ حیران تھیں۔ اتنے  
 دن وہ اس کی کیفیات سے کس قدر بے خبر رہی تھیں۔  
 ”کیوں نہیں جانا تمہیں۔“ ٹھنڈے ٹھارے لہجے میں  
 دریافت کیا گیا۔

وہ چپ کھڑی فرش کریدتی رہی۔ ”اس لیے کہ وہ  
 لوگ مجھے پسند نہیں ہیں۔ میں اس شخص کے ساتھ  
 ساری زندگی نہیں گزار سکتی جسے میں ناپسند کرتی  
 ہوں۔“  
 ”کس ڈھٹائی اور بے شرمی سے تم اپنی پسند ناپسند



کی بات کر رہی ہو۔ جو تمہیں پسند تھا۔ اس نے تمہیں دھکا دیا اور جو تمہیں سرکا تاج بنا کر لے جا رہا ہے اسے تم پسند کرتی ہو۔“

ان کے انداز پر وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اتنے سخت الفاظ کی اسے توقع نہیں تھی۔

”کیا کچھ نہیں کیا اس دن سے تمہاری پچھو نے تمہارے لیے“ ایک سے بڑھ کر ایک کپڑوں کی شانیں گتے اتنے خوب صورت چولری سیٹ جہاں تمہاؤں کو ملتی ہو وہ وہاں ہاتھ رکھتی ہیں۔ تمہارے خسرے برداشت کر رہی ہیں کیسے چاؤ سے بھائی جان ہر روز تمہیں فون کرتے ہیں۔ چاہے تم بات کرو یا نہ کرو۔ انہیں ہزاروں میں نہیں لکھوں میں ایک ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اس وقت ہمارا ساتھ دیا جب ہمیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اور تم پھر بھی۔“

بولتے بولتے تھک کر وہ رو پائی ہو گئی تھیں۔

وہ سمجھتی تھیں وقتی کیفیت کے زیر اثر ہے۔ سامنے کا کچھ نہ کچھ تو اثر ہو گا اس پر، مگر وہ تو بالکل ہی پشیمانی سے اتر رہی تھی یہ سن کر چپ کھڑی رہی۔

”وہ وابہیات“ بے غیرت شخص جسے تم اپنی پسند کرتی ہو وہیں سے انکار کرنے کے بجائے یہاں تک آیا ہمارا تماشا بنانے۔ تمہیں تمہارے منہ پر دھنکار کرنا پسند کر کے چلا گیا اور تم ابھی بھی۔“ بولتے بولتے ان کا سامنا چڑھنے لگا۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں اس شخص پر جسے آپ ہی کا بیٹے کیا ہوا رشتہ تھا“ مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ”اس نے ان کی بات کی سختی سے تردید کر دی۔“

”اگر لعنت بھیج چکی ہو تو اللہ کی رضا سمجھ کر اس رشتے کو بھی قبول کر لو کہ یہی تمہاری قسمت میں لکھا تھا۔“

انہوں نے اس کا سر پکڑ کر چہرہ اوپر کر دیا۔ خود اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس دن سے اس کے دل و دماغ میں ایک کشمکش جاری تھی۔ بھی پچھو اپنی محنت لگائیں۔ بھی ضدی پن عود کر آتا تو مکمل لگنے لگتیں۔

وہ یہ بھی مانتی تھی کہ اس دن سے کس طرح وہ اس کے لاڈ اٹھارہی تھیں اور وہ بد تمیزی کرتی رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ کبھی شعلہ، کبھی جہنم کا سماراج لیے ہوئے غصہ آتا تو عجیب ہو جاتی اور سوچتی تو اپنی ہی باتوں پر دکھ ہوتا۔

”اگر وہ نہیں آیا تھا، بھاگ گیا تھا تو کیا ضروری تھا کہ آپ مجھے کسی بھی ایرے غیرے، تنہا خیرے کے ساتھ بیاہ دیتیں۔ یہ کوئی بادشاہ، شہزادی کی کمالی نہیں کہ صبح جو سب سے پہلے محل کے دروازے پر آئے گا اس سے شہزادی کی شادی کر دی جائے گی۔ کیا بھی پہلے کسی کی بارات واپس نہیں گئی یا ایسا انوکھا واقعہ کسی اور کے ساتھ نہیں ہوا۔“ اب وہ سننے لگی تھی۔

کئی دنوں کے آنسو تھے جو اچانک باہر نکل کر قطار در قطار گر رہے تھے۔ وہ خوب صورت تھی اور اسے اپنی خوب صورت کا احساس بھی تھا۔ پھر ہمیشہ سے فیضان کو ہی اس حوالے سے سوچا تھا۔ ایک دم یہ ساری کیا پلٹ اسے زور دینا کر گئی۔ اتنے دنوں کا بھر اغماء نکل رہا تھا۔

”وہ کوئی ایراغیو نہیں تمہاری پچھو کا بیٹا اور بڑھا لکھا قابل شخص ہے اور فیضان سے زیادہ ہی چنڈ سم بھی۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہوسا دیا۔

”بڑھا لکھا قابل شخص دکان پر ہی بیٹھے گا۔“ جل کر کہہ بھی دیا۔

”ان کا اپنا کاروبار ہے۔ کیا برائی ہے اس میں۔ بیٹا! اپنے محسنوں سے محبت کرتے ہیں۔ متغیر نہیں ہوتے۔“

وہ بھی تو خود کو یہی سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔

”اور اپنے پیارے سامنے اس طرح کی کوئی بات نہ کرنا“ وہ پہلے ہی بہت پریشان رہے ہیں۔ پھر تم ان کے غصے کو بھی جانتی ہو۔“

ان سے بات کر کے دل کی بے چینی کچھ کم ہوئی تھی، جب تک دوبارہ یہی کیفیت نہ ہوئی تب تک تو سکون ہی تھا۔ ان سے کچھ بھی کہے بغیر وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔ نہ جانے آنکھوں سے آنسو کب بہنا شروع

ہوئے۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

”اب بس بھی کرو اور کتنا خود کو پریشان کرو گی۔ کتنی اذیت دو گی۔“ تحریم اس کے آنسو پوچھتی اس کے سامنے کھڑی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”کیا کروں۔ میرے اندر کی کشمکش ہی ختم نہیں ہوتی۔ خود کے رویے جانے کا احساس اس قدر اذیت ناک ہے کہ۔۔۔ پچھو میری محنت ہیں مگر۔۔۔ انہیں کیا صرف وہی تھا میرے لیے اس دنیا میں۔“

وہ نہ جانے کس سے شکوہ کر رہی تھی اللہ سے اپنی بس سے یا خود سے۔

”مجھنے کی کوشش کرو، پچھو کو اگر اپنی محنت سمجھتی ہو تو انہیں بھائی بھی تمہارے محسن ہیں۔ اتنے ڈھنسیک، ذلیل، مینو، اچھی تعلیم، ان کو بھلا کس چیز کی کمی تھی، مگر انہوں نے صرف تمہارے لیے۔ اپنی ماں کی بات کی لالچ رکھی اور اتنے دن سے تمہارا رویہ کیسا ہے پچھو کے ساتھ۔۔۔ وہ شائیک کے لیے کتنی رہیں اور تم سرور کا بہانہ کر کے کمرے میں بند ہو گئیں۔ دوسروں کی نظر سے نہیں ان کو خود کی نظر سے دیکھو۔ وہ کتنی اچھی ہیں، تمہیں خود پتا چل جائے گا۔“

اچھی بہنیں خدا کی نعمت ہوتی ہیں اس کی بہن بھی اس کے لیے نعمت تھی۔ دونوں کی دوستی اتنی تھی کہ کبھی کوئی اور دوست بنانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ منت غصے کی کچھ تیز اور جذباتی تھی تو تحریم اس کے جذبات کو قابو کرنا جانتی تھی۔

”پلیز خود کو دلو، تاکہ پچھو کو انہیں بھائی کو کبھی اپنے فیصلے پر دکھ نہ ہو۔ تم بہت اچھی ہو، بس ذرا سی بے وقوف ہو۔“ تحریم نے اپنی لمبی انگلیوں کو ذرا سے اشارے کے لیے گول کیا۔

”اور انہیں بھائی اگر ماسٹر زکی ڈگری کے باوجود اپنے ابا کے ساتھ دکان پر جاتے ہیں تو یہ ان کا کیڑا کا ایک انداز ہے۔ جاب بھی ہو سکتا ہے، کرنے کا ارادہ ہو۔ اگر نہ ہوا تو تم بنو لینا“ آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔

ویسے بھی کوئی بھی کاروبار ہو پرنس تو پرنس ہی ہے اب امانت پچھا بھی تو لیدر کا پرنس کرتے ہیں اور نعمان بھائی اور فیضان بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔

”نام نہ لو اس کیلئے گا۔“ اس نے نفرت و حقارت سے سے کہا۔

”میں تو سمجھی اس فضول شخص کی محبت میں یہ سب کچھ کر رہی ہو۔ اگر محبت نہیں تو پھر کاہے کی پریشانی۔ اپنے بندے سے محبت کرنا، قسم سے اتنا ڈھنسیک ہے۔“

آنکھ دبا کر کہنے پر اس نے اس پر نکیہ پھینک دیا۔

”مروتہ۔“

مگر کچھ دن کے بعد پھر سے اس پر وہی کیفیت طاری ہونے لگی۔

”اگر تمہارے ارادے کی خبر تمہارے بابا کو ہو گئی تو وہ ہم سب کی۔“ حرا ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔

روئے صدیقی سامنے کھڑے کینے توڑ نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ قدم بڑھاتے وہ منت کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ سن اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ مگر اس میں ان کی آنکھوں میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ بہت دیر تک وہ کچھ بھی نہیں بول سکی۔

”میں لندن نہیں جانا چاہتی۔“ اس نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا تھا۔

”ٹھیک ہے حرا، اگر یہ لندن نہیں جانا چاہتی تو اسے کہیں اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لے، کیونکہ اب یہ اس گھر میں بھی نہیں رہ سکتی۔“

حکم دے کر وہ رے نہیں تھے۔ وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن چکے تھے۔ مزید کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے سامنے وہ جملہ بھی نہ جانے کیسے منہ سے نکل گیا تھا اور اب وہیں کھڑی آنسو بہاتے وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔



ان گزرے سالوں میں جہاں حسین نے اپنی محنت

لگن، تجربے اور قلیل سرمایے کو کام میں لاتے ہوئے لیڈر کا بزنس سیٹ کر لیا تھا، وہیں اس کا گھر دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے وجود سے پر رونق ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی محبت مثالی تھی۔ وہ ابھی بھی اس کے اظہار محبت اور التفات پر چھوٹی موٹی بن جاتی۔ فریال، رخ اور انسب زندگی کتنی خوب صورت تھی۔

”ساری عمر گزر گئی، ابھی تک تمہاری طرف سے اظہار محبت کا انتظار ختم نہ ہوا۔“ وہ اسے جگانے لگی تھی اس نے ہاتھ کھینچ کر اسے قریب کر لیا۔

”جناب آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ بیچے کب کے اسکول جا چکے ہیں۔“ اس کی گرفت سے نکل کر وہ پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”آج لیٹ جانا ہے آفس۔“ کسلندی سے کہتا وہ پھر سے بیڈ پر گر گیا۔ ابھی اس کا لٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”یار! یہ ہی کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“ وہ پھر سے اسے چیمپنے لگا۔

”کیا ابھی بھی اس کی ضرورت ہے۔“

”ضرورت تو ہمیشہ رہتی ہے اظہار کی، مگر تم بھی ایک زائد خشک ہو۔“ اس نے اس طرح منہ مچھا کر کہا کہ اس کا نفرتی قہقہہ بے اختیار ہی بلند ہوا۔

”شکر ہے تمہاری ہنسی تو سننے کو ملی ورنہ تو ہنسنے کے نام پر ایک لکیری ہونٹوں پر کھینچ جایا کرتی تھی۔“ وہ پھر سے شرم سے لگا۔

”اب اٹھ جاؤ، آج ہمارا امانت بھالی اور بچوں کو ریسیو کرنے کا ایئر پورٹ بھی جانا ہے آپ کو۔“ اس کو یاد دلا کر اس کا دھیان مکمل طور پر موڑ دیا۔

”ہاں بابا۔۔۔ تم چلو گی انہیں لینے۔“ وہ اس سے پوچھنے لگا ”آخر کو بہن تھی اس کی وہ بھی چھوٹی۔“

”نہیں! آپ لے آئیں، تب تک میں کھانا تیار کر لوں گی۔ پھر کچھ دن تک تو وہ ہمارے ہاں ہی ٹھہریں گی۔ فلیٹ میں جن چیزوں کی کمی ہوگی وہ خود دیکھ لیں گے۔“

ہمارا کو فیملی سمیت پاکستان سے یہاں بلانے میں اسی کا ہاتھ تھا۔ لیڈر کا بزنس روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔ ایسے میں نئے ورکرز کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، ہمارا اول روز سے اس گھر میں تنگ تھی۔ امانت اللہ پر ہاتھ لکھا شخص تھا، مگر نہ جانے جاب پر تنگ کر کام کیوں نہیں کرتا تھا، آئے دن ہمارا پریشانیاں اسے بھی پریشان کرتی رہتی تھیں۔ بچوں کے ساتھ نے اسے خود ترس اور زود رج بھی بنا دیا تھا۔ وہ جب فون کرتی ہمارے لگتی۔ اس نے حسین سے بات کی تھی اور حسین بھلا اس کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔ کئی مہینوں کی کوشش کے بعد وہ انہیں اپنی کمپنی کا ایئر پورٹ بنا کر لانے میں کامیاب ہوئی گیا تھا۔

اس کے اپنے کوئی قریبی رشتہ دار تھے نہیں بس یہ ہی سسرالی عزیز تھے جو اسے اپنی بیوی کی طرح بہت عزیز تھے۔ ویسے وہ نیکی کو پھیلائے کا قائل تھا، بہت پہلے اگر عاطف نے اس کے ساتھ نیکی کی تھی اور بغیر کسی صلے کے اسے یہاں سیٹ کروایا تھا تو وہ بھی کسی اور کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہتا تھا اور ہمیں سے اس کی بد قسمتی کا آغاز ہوا تھا۔

\*\*\*

”کبھی اتنا برا سفر نہیں گزرا، جتنا اب گزرا ہے۔“ ایئر پورٹ پر لینے والا انسب کئی سال پہلے دیکھے گئے انسب سے کتنا مختلف تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ وہیں کندھے جھک کر لا تعلق بھی ہو گئی تھی۔ پچھو سفر کی طوالت، دھند اور نہ جانے کن باتوں میں الجھی ہوئی تھیں اور وہ گاڑی کے ایک کونے میں بیٹھی باہر کی روشنیوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈنے کی کوشش

کر رہی تھی۔ کبھی اسے لندن گھومنے کا کتنا شوق تھا اور اب باہر دوڑتے بھاگتے، ملجے اندھیرے کتنے عجیب لگ رہے تھے۔ سچ ہے کہ ساری رونق، ساری خوب صورتی آپ کے اندر ہوئی ہے۔

”فریال اور رخ تو آئی ہوں گی اور لقمان، حسن

بیچے۔۔۔“

”ہاں سب ہی آئے تھے، پھر آپ کا انتظار کر کر کے لقمان اور حسن بھائی تو پہلے گئے، ہاں دونوں آپاں ادھر ہی ہیں۔“ اس کی بھاری گھبر آواز گاڑی کی خاموشی میں گونج رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اس کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔

سفر نے واقعی تھکا دالا تھا۔ پچھو کے شکوے، بجا تھے۔ تھے ہوئے اعصاب آرام مانگ رہے تھے۔ اس نے سر سیٹ کی پشت سے نکال دیا اس کی چوڑی پشت پر بیٹے دھیانی میں نظریں جمائے وہ اس کے اعتماد پر حیران تھی۔

”اتنا انتظار کروایا تو بس۔ اب تو انتہا ہو گئی۔“ فریال، میت سے ملنے ہوئے اس سے معصوم سا شکوہ کر رہی تھی۔

”ہمارا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ سوئے ہوئے بچوں کو چھوڑ کر ایئر پورٹ پہنچ جائیں۔ بس ابو نے انکار کر دیا کہ اگر کوئی روپا تو ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ وہ کسی کی چوکیداری نہیں کر سکتے اس وقت۔“ رخ کیا اسے لپٹائے لپٹائے ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔

”بھئی کوئی ہمیں بھی تو ہماری بیٹی سے ملنے دے۔“ طارق بھی کمرے سے نکل کر وہاں آن کھڑے ہوئے۔ گھر میں ہونے والے شور نے انہیں جگا دیا تھا۔ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ڈھیروں دعا مانگے ڈالیں۔

”جیتتی رہو، خوش رہو، آباد رہو، ہمارے گھر کی رونق بنی رہو۔“ سارے رستے جس بے زاری اور لا تعلق کامنظاہر اس نے پچھو سے کیا تھا، اس پر اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ حالانکہ گھر سے ارادہ کیا تھا کہ وہ اپنی سوچوں کو صبح صبح دینے کی کوشش کرے گی، مگر

گھوم پھر کے پھر وہی چیزیں دماغ میں آجائیں اور اس کا دماغ الٹ جاتا۔

”بیٹہ جاؤ منت۔“ پچھو نے ہی آگے بڑھ کر اسے صوفے پر بٹھایا تھا۔

”ہم دونوں کے سونے کا انتظام کرو تم دونوں۔ ایسا برا حال ہے کہ بیان سے باہر ہے۔“

حتا بیگم، فریال اور رخ سے مخاطب تھیں۔ منت کے ساتھ صوفے پر بیٹھے انہوں نے پاؤں اوپر کر کے رکھ لیے۔

”بیگم جہاز میں سفر کر کے آئی ہیں کہ گدھا گاڑی میں۔“ طارق کا چٹکھلہ سن کر سب ہنسنے لگے۔

”گدھا گاڑی ہی سمجھ لیں۔ اتنی دیر میں تو اگر گدھا گاڑی میں بھی بیٹھ کر آتے تو جہاز سے پہلے پہنچ جاتے۔“

”انسب! تم بھی بیٹھ جاؤ، اتنا منسوب ہو کر ہاتھ باندھے کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں۔“ طارق حسین نے انسب کے مسلسل ایک جگہ کھڑے ہونے کو مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔ جس پر فریال اور رخ آہی کا مجموعی قہقہہ اسے سٹپلے پر مجبور کر گیا تھا۔

”شروع ہو گئے ابو کے شوٹے۔“

اندر کی جانب جاتی رخ نے انسب کو دھکا دے کر اس کے برابر بٹھا دیا۔ سب بہن، بھائی شاید ایک دوسرے سے بہت فری تھے۔

”کچھ کھاؤ گی، بھوک تو نہیں لگی تمہیں۔“ حنا کے پوچھنے پر اس نے سر نیلی میں ہلا دیا تھا۔ خود کو ”کافینڈنٹ“ سمجھنے والی منت تھوڑی نورس تھی۔ وہ اس کے ساتھ جڑ کے بیٹھا تھا۔ فریال کے دھکے پر ویسے بھی وہ بمشکل سنبھلا تھا۔ پھر صوفے پر جگہ ہی تنگ تھی۔ ایک طرف پچھو پھیل کر بیٹھی تھیں تو ایک طرف حنا۔

”ای منت کا ڈریس اس کے واش روم میں لٹکا دیا ہے اور آپ کا ڈریس بھی، بس انھیں اور جا کر ریسٹ کریں، باقی سب صبح۔“ او منت! میں تمہیں تمہارا کرو گھا دیتی ہوں۔“ فریال نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

چھ سال پہلے دیکھی ہوئی فریال ابھی بھی ویسی ہی تھی۔ دو بچوں کے باوجود نازک اندام سی اپنی کزن اسے بہت بھائی تھی۔

”ابھی منت کو ہمارے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں لے جاؤ“ میں بھی آج اس کے ساتھ سوؤں گی“ پر اصرار نہ کرے پھر کل۔“ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا جسے سمجھتے اس نے سر ہلادیا۔

”آج تو تنہی ہوئی اتنی ہے کل ذرا اچھی طرح تیار ہوگی تو رخصت کروں گے اس کے کمرے میں۔“

ان دونوں کے جانے کے بعد انہوں نے آہستگی سے طارق صدیقی سے کہا تھا، جس کے جواب میں انہوں نے سر ہلادیا تھا۔

کچھ دیر موبائل پر کھیلنے کے بعد وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا تھا۔ زندگی میں اچانک آنے والا انقلاب اس پر اثر کر سکا تھا یا نہیں لیکن بہت کچھ بدل ضرور گیا تھا۔ بیو جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں اس کے کسرتی بازو نمایاں ہو رہے تھے گھڑی اور موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھتے امدادی میں سے کپڑے نکالتے شاور لیتے سارے کاموں کے دوران اس کا دھیان عجیب طریقے سے بٹا ہوا تھا۔ اس دن ساری چوچین کو سنبھالنے کے لیے جو کچھ اس کی ماں نے کیا تھا انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا مگر اس کے ذہن و دل میں نہ جانے کیسے عجیب و غریب خیالات آتے رہے تھے۔

صبح اور فریال کی طرح اس نے بھی اپنی شادی کے سارے اختیارات ماں باپ کو دے دیے تھے مگر بیڈ پر بیٹھ اس نے لیپ ٹاپ کھول لیا۔ نکاح کی تصویریں جو کچھ دن پہلے اسی نے سینڈ کی تھیں اس کے سامنے تھیں۔

”کیا وہ اسے نہیں سوچتی ہوگی بچپن کی مٹکی اوس۔“ اپنی کھینی سوچ پر لکنت سمجھتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ ساری سوچوں کو جھٹک کر خود کو ریٹائرس کرنے کی کوشش کی، ابھی اسے اور بہت کچھ سوچنا تھا۔



فیضی کے ساتھ میری کوئی رقابت نہیں تھی۔ نہ

ہمارا اسکول ایک تھا نہ گھر پاس پاس تھے اور نہ ہی ہمارے دلچسپیاں ایک جیسی تھیں مگر اس نے میری ایک کمزوری کو میرے لیے عذاب بنادیا تھا۔ میرے خیر خیر کرکے لے کر مذاق بناتے مجھے پھینٹتے وہ ہر حد پار کر جاتا مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ صرف اس ایک بات کی وجہ سے نفرت کچھ عجیب لگتا ہے نا مگر اس کی صرف اس بات سے نہیں اس کے ان سارے کرتوتوں کی بدولت جو گاہ بہ گاہ وہ مجھے بچاؤ کھانے کے لیے کرتا رہا تھا۔

پہلے پہل میرا خیال تھا کہ اس کے آنے سے مجھے ایک دوست مل جائے گا۔ میں اگلا تاہنا تھا اور وہ میرا خالہ زاد بھائی تھا۔ میرا دوست بن سکا نہ بھائی۔ جس طرح اس کے والدین بھی میرے والدین کے ہمدرد اور بی خواہ نہ بن سکے۔ میں اس سے کسی چیز میں پیچھے نہ تھا۔ بہترین اسٹوڈنٹ اچھی شکل و صورت کا مالک مگر میرا شرمیلہ پن ضرور ایسا تھا جو اس میں نہ تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتا تھا۔

ہمارے گھر میں ان کا آنا جانا تھا۔ میں اس کا سامنا کرنے سے کتر آتا تھا۔ میری لکنت، تھری کی بدولت تقریباً ختم ہو چکی تھی اور ڈاکٹر کے خیال میں ری سی کسرمی آنے والے سالوں میں پوری ہو جاتی مگر اس کی چھینچھان اور مذاق نے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔

وقت تھوڑا اور آگے گزرا، ہم تھوڑے بڑے ہوئے، میری اٹھان اچھی تھی۔ قدرنگت، ہر لحاظ سے میں اس سے بہتر تھا۔ امانت انکل کا رنگ گہرا سا لالہ تھا، اس لیے ان کی اولادیں بھی ایسی ہی تھیں مگر میری ساری خوبیوں پر میری ایک خامی حاوی ہو گئی تھی۔ وہ مجھے چڑاتا، مذاق اڑاتا، شرارتیں کر کے میرا نام لگا تا اور میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔

ایک بار خود کرنے پر اس نے میرا نام لگا کر مجھے

خوب ڈانٹ پڑوائی تھی۔ اسی طرح کے اور بہت سے واقعات میرے حافظے میں ابھی تک محفوظ ہیں۔

نیا نیا لڑکھن تھا۔ سب ہمارے گھر اکٹھے ہوئے تھے۔ لیونگ روم میں ایک طرف ہمارا آئی اور ای باتیں کر رہی تھیں اور ایک طرف ہم بچے بیٹھے تھے۔ میں کھیل میں شامل نہیں تھا۔ دونوں بھائی راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم سب کا دھیان ان کی طرف نہیں۔

”میں تو اپنے نسب کے لیے منت کو مانگ لوں گی“ مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ بہت پہلے سے سوچ رکھا ہے میں نے۔“

ای کی بات سن کر میرے اندر کچھ ہوا تھا۔ ماں وہ مجھے اچھی لگتی تھی، مگر وہ بڑی کس کو لگ سکتی تھی؟ یقیناً کسی کو بھی نہیں، میرے دل میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ نئی نئی جوانی اور نیا نیا اس کا خیال۔ میں کتنے دن تک اس کے خیالوں میں کھویا رہا تھا، لیکن ٹھیک ایک ہفتے بعد آئی نے مٹھائی بچھوائی تھی کہ فیضان کے لیے انہوں نے منت کو مانگ لیا ہے جہاں مجھے ایک دھچکا لگا تھا وہیں ابھی منہ کھولے کتنی دیر مٹھائی کا ڈبا پکڑے کھڑی رہی تھیں۔

فیضان یوں خوش تھا جیسے اس سے پہلے کسی خوشی دیکھی ہی نہ ہو، لیکن یہ خوشی اس لیے تھی کہ اس نے میرا رشتہ وہاں طے نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے جانے پر اس کی کینکلی سے مجھے کچھ اور بھی نفرت ہو گئی تھی۔

اس کی مٹکی کے بعد لڑکھن اور جوانی کا وہ بخار بھی اتر گیا تھا۔ پھر اس کے والدین نے جو کیا تھا اس کے بعد ان سب سے میری نفرت وچند ہو گئی تھی۔



لندن آنے کے بعد ہمارا امانت اور بچوں کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ ظاہری شخصیت کی تبدیلیاں اس قدر ٹھنڈا دینے والی تھیں کہ اگر مالی والا گاؤں کا کوئی شخص انہیں دیکھ لیتا تو پہچاننے سے انکار کر دیتا۔ سب سے بڑی تبدیلی امانت علی کی سوچ میں آئی تھی اور باقی تبدیلیاں اسی کی بدولت تھیں۔ اس نے ہمارے

بچوں میں آنے والی تبدیلیوں کو نظر انداز کیا تھا یا وہ خود ایسا ہی چاہتا تھا۔

ہمارے بڑے چاروں کی جگہ دوپٹا پھر پٹے کی جگہ گلے میں سینے والا اسکارف اور پھر گلے میں سینے والے اسکارف کی جگہ صرف الماری ہی رہ گئی تھی۔ شلوار قمیص کی جگہ جینز نے لی تھی اور بعد میں یہی جینز اسکن ٹائٹ میں تبدیل ہوئی تھی۔

اب یہ اور لقمان بڑے تھے۔ انہوں نے بھی ماں باپ کی طرح کھلے ہاتھوں اور کھلے دل سے ان تبدیلیوں کا استقبال کیا تھا اور فیضان بھی انہی کے پیچھے پیچھے تھا۔ دو تین سال کے اندر اندر ہی ان کا بوب و لوجر برٹش ہو گیا تھا۔ اردو کو انہوں نے دماغ کے ایسے حصے میں ڈال دیا تھا جہاں وہ ایک ناکارہ رڈی شے کی طرح اپنی بے وقعتی پر ماتم نہیں رہتی۔

حسین کی کمپنی ”حسینیز“ کی طرف سے ملنے والے پونڈ اسٹرنگ نے ان کے دن ہی نہیں دل بھی پھیر دیے تھے۔

جہاں تک ان تبدیلیوں کا تعلق تھا اگر وہ صرف ان کی ذات اور گھر تک محدود رہیں تو ٹھیک تھا، مگر ان کا دائرہ کار حنا کے گھر تک پھیل گیا تھا۔ ان کے کپڑوں، بولنے چلنے پر تنقید کی جاتی، طرح طرح کے مشورے دیے جاتے، ان کا مذاق اڑایا جاتا۔

”تبا! آپ کے ہاں اگر تو لگتا ہی نہیں کہ ہم لندن میں بیٹھے ہیں یا پاکستان میں، وہی پاکستان والا محول۔“ نہ جانے یہ طعنے یا تعریف، مگر بار بار سننے کو ضرور ملا کرتی۔

”تبا! کچھ تبدیلی لائیں اپنی سوچ میں۔ مجھے تو لگتا ہے وہی گھبرات میں بیٹھے ہیں آپ۔ کتنے سال ہو گئے مگر آپ نہ بدلیں بلکہ بچوں کو بھی ویسا ہی بنالیا اپنے جیسا۔“ ہمارے اپنے مشہور کنگ کے بالوں میں ہاتھ پھیرا، ایک تنقیدی نظر فریال اور سخی شلوار قمیص پر ڈالی اور اکڑ کر صوفے پر بیٹھ کر بہن کے سر پر لیے

ہوا ہو گئی تھی۔

اسب جلدی سے اندر چلا گیا۔ پاکستان میں بھی اسے ہی نشانہ بنایا جاتا، اگر کسی کو اس کی اس کمی کے بارے میں پہلے سے علم نہ ہو تا تو بھی معلوم نہ ہو سکتا، مگر فیضان وہاں جا کر منت کو اپنے ساتھ ملا لیتا اور خوب رگید اچاتا۔

”ساری رات سو نہیں سکی، بخار نے مت مار دی ہے اس کی، دوا دی تھی میں نے دو گھنٹے پہلے اب کچھ بہتر ہے، سو رہی ہے۔ جب تک سوتی ہے سونے دو، شاید موسم کی تبدیلی ہے یا تھکاوٹ سے یہ حال ہے، نازک بھی تو اتنی ہے۔“ حنا بیڈ روم کا دروازہ ہولے سے بند کرتے بیڑھیاں اتر کر کچے آ گئیں۔

”ہائو! ہائیں بھی ماموں کی دامن دیکھیں ہے۔“ پانچ سالہ سجان اوپر جانے کے لیے پرتول رہا تھا۔ ”دامن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ بھائی کے ساتھ کھیلو، پھر بعد میں دیکھتے ہیں دامن کو۔“ فرماں نے بیٹے کو ریاں کے ساتھ دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

”آپ نے کچھ ریٹ کیا یا نہیں۔“ رخ ان کے ہاتھ تھامے پوچھ رہی تھی۔  
 ”ہاں تھوڑا سوا سی ہوں اب چائے پی کر پھر لیٹوں گی،“  
 منت کو تمہیں فرماں دیکھ لیٹنا۔“  
 ”جی جی! دیکھ لیں گے۔ میں چائے لاتی ہوں۔  
 اب تھوڑا ریٹ کر لیں۔“

”انسب نہیں اٹھا ابھی تک اور تمہارے ابو۔“  
 ”ابو تو چلے گئے دکان پر ہاں انسب سو رہا ہے ابھی،  
 وہ کہاں اتنی جلدی اٹھتا ہے۔ بچوں نے صبح سے دماغ  
 کھالیا ہے۔ کبھی داسن، تو کبھی ہاتھوں اتنی مشکل سے  
 روک کے رکھا ہے۔“ فریال صبح مغز میں بچوں  
 کے ہاتھوں تنگ ہوئی بیٹھی تھی۔

ان کے بچے گھر میں اوروں کو لاتے تھے۔ اسکو لنگ تو انگلش ہی میں تھی، مگر وہ خود اس بات پر سختی سے کاربند تھیں کہ بچوں کی تربیت کی فزہ واری کسی اور جگہ پر آکر ساری کی ساری ماں باپ کے کندھوں پر آجاتی ہے۔ کئی سال اس جگہ پر رہتے ان کی سوچ بڑی گہری ہوئی تھی۔

ہمارے کافی کے تلخ گھونٹ کے ساتھ ان ساری باتوں کو بڑی مشکل سے حلق سے نیچے اتارا تھا۔  
 ”کچھ لوگ کولہو کے ٹیل کی طرح حسی زندگی ایک ہی جکر میں گھومتے گھومتے گزار دیتے ہیں۔“ سوچتے ہوئے انہوں نے بات بدل دی تھی۔ ”اگر وہ بدلنا نہیں چاہتی تھیں تو اس سے ان کی صحت پر کیا فرق پڑنے والا تھا۔“

سب سے زیادہ تنقید اور مذاق کا نشانہ انسب کو بنایا جاتا۔ قدرتی طور پر اس کی زبان میں ماحوس کی جانے والی لکنت تھی جو تھرپالی سے دور ہو چکی تھی، مگر اس کے اعتماد میں کمی اسی کی بدولت تھی۔ ایسے فیضان اور لقمان اس کا مذاق اڑاتے، انک ایک کربات کرتے اس کی نعل اتارتے، اسے چڑایا جاتا۔

”تم لوگ اندر آکر کھانا کھاؤ۔ امی بلا رہی ہیں تمہیں۔“

ہماچوں کے ساتھ حنا کی طرف آئی تھیں اور اس کا ان کو بلانا غضب ہو گیا تھا۔ فیضان بورہو رہا تھا اور اسے اپنی بوریست دور کرنے کا ذریعہ مل گیا تھا۔

”آہ آہ آہ آہ آہ“  
ایسے اس کے ساتھ بیٹنے لگی۔ انب کا چہرہ گرم ہو کر  
تپنے لگا۔ اب وہ زمین کو گھور رہا تھا۔ اس کی خود اعتمادی

”مبیٹھ جاؤ تم، بچوں کو سوخ دیکھ لے گی۔“ فریال چائے ان کے سامنے رکھ کر ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ ”بیگ کھول کر دیکھ لینا، کچھ شاپنگ میں نے ناوھر سے ہی کی تھی۔“ منت کے لیے کچھ زیور جو عیس پیلے بھی بتایا تھا اور کچھ کپڑے، اس کی الماری میں سیٹ کر دو اور ہال ایک بھاری کالم والا جوڑا ہے، وہ نکال کر الگ رکھ لینا۔“

حنا بیگم چائے پیتے پیتے اسے ہدایات بھی دیتی  
جاری تھیں۔ اکلوتا بیٹا اور اس کی شادی کے ارمان ان  
کے دل میں کس طرح ٹھاٹھیں مار رہے تھے، کوئی ان  
سے نہ جھٹاتا۔

”آپ بے فکر ہو جائیں، میں دیکھ لوں گی۔“ فریال نے انہیں تسلی دے کر منہ داری اٹھالی تھی۔  
”حسن اور لقمان تو انہیں گئے، آج شام اچھا سا کھانا تیار کر لے، تاہم دونوں ہمیش مل کے اور منت کو بھی تیار کر دیتا۔“

فریال سرہلاتی، مس بن رہی تھی۔  
 ”امی، آنٹی اور فیضان نے جو کیا، اچھا۔“ ایسے بھی کرتا  
 ہے کوئی اپنے سنگے رشتہ داروں کے ساتھ، ”غیر ہوں تو  
 اور بات ہے۔“ بہت دنوں سے ذہن دلی میں کھنکنے  
 والی بات آخر اس نے ماں سے کہہ ہی ڈالی تھی۔  
 ”بس بیٹا زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔“ وہ آہستہ  
 آہستہ تفصیلات اسے بتا رہی تھیں۔

بخار ایک نہ دو پورے چار دن لگا کر ختم ہوا تھا۔  
فیصل کے شوہر ڈاکٹر تھے، وہ ابھی انہوں نے ہی دی  
تھی۔ سواب بہتر تھی۔ پردیس کی بیماری نے اسے زود  
درج بنا دیا تھا۔ سب آئے، اس کے پاس بیٹھے، ادھر  
ادھر کی باتیں کرتے، اس کا دل بسلانے کی کوشش کی

عسکی اس کے پورے وجود میں بچے گاڑے ہوئے تھے۔ ستر پار کا کمرے کا لایا ہوا جائزہ ایک بار پھر سے لیا جانے لگا تھا۔ صاف ستھرا ہوا دار روشن کمرہ بید اور دو مشکل صوفوں اور ایک چھوٹی میز سے آراستہ۔ بڑی شیشوں والی کھڑکی جس سے باہر جھانکنے پر ہر ابھارا لالہ نظر آتا مگر دل پہ چھایا ہوا دم ختم ہونے کا نام یہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اپنی خاموش طبع تو ہرگز نہیں تھی جتنی یہاں آکر ہو گئی تھی۔ تحریم سے بات کر کے دل کو سکون ملا تھا۔

”ماما تم سے بات کرنا چاہتی ہیں اور یہاں بھی۔“ حکریم نے فون شاید منتقل کر دیا تھا۔ دوسری طرف سے ہیلو ہیلو سننے کے باوجود ابھی تک اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔

”گلتا ہے کوئی مسئلہ ہے، آواز نہیں آرہی۔ کالٹ کر دوبارہ کال ملاؤ۔“ ماما کی آواز سننے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

تحریم کی کال دوبارہ سے آ رہی تھی۔ فون سرے سے آف کرتے وہ گم صم بیٹھی شاید کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔

”قدیم کا دن ہی مقرر کر لیتے۔“ یہ دیکھ کر شوہر ناچار تھے، اسے سامنے بٹھا کر نہ جانے سب کون سی باتوں میں مصروف تھے۔ گولڈن اور ریڈ بھاری کام والا ڈریس پہنچو نے نہ جانے کب خریدا تھا۔ شاید تب ہی جب وہ ان سے مکمل اظہارِ اشتغاق کر کے سوگ منانے میں مصروف تھی یا کسی اور وقت بھر خال تھا۔ بہت خوب صورت، بیخ اور فریال نے اس کا میک اپ کرنے کی بھی کوشش کی تھی، مگر میک اپ کے نام پر صرف ایک لب اسٹک ہی لگوائی تھی اس نے سوہ بھی اگر تحریم کی طرف سے تازہ تازہ ڈوز نہ ملی ہوتی تو شاید ”یہ“ پکڑے بہنے سے بھی انکار کر دیتی۔ اب بابا، بابا سے تو ناراض تھی ہی، تحریم سے ناراض ہونا نہیں چاہتا تھا۔

”من اگر تم نے کوئی بے وقوفی کی تو مجھ سے دوبارہ بات کرنے کی ضرورت نہیں“ اب تو کچھ بیچور ہو جاؤ۔“ وہ فون پر کیا کچھ بولتی رہی تھی اس کا بس نہ چلتا تھا کہ فون کے اندر کھس کر اس تک پہنچ جائے اور دل غل درست کر دے۔

”سنتے بعد کی تاریخ رکھ لیتے۔ ہال کی بنگلہ تو ہو ہی جائے گی۔“ رخ کے شوہر کا اپنا شادی ہال تھا یہاں اس لیے کوئی مشکل نہ تھی۔

بھانت بھانت کے لوگ اپنی اپنی بولیوں میں مصروف تھے اس کا سروا دیتی دانتوں کی طرح جھکا ہوا ہی تھا مگر وہ سوچیں تھیں جو بغیر روک ٹوک کے وارد ہو رہی تھیں۔

”انسب کہاں ہے“ بھی کچھ تصویریں ہی ہو جائیں۔“

طارق صدیقی اپنی اولاد سے دوستوں کی طرح بات کرتے تھے۔ اب بھی تصویریں لینا انہیں ہی یاد آیا تھا۔

”انسب انسب۔ اب اب بھی جاؤ۔ کہاں ہو بھی۔“

وہیں سے آواز لگاتے وہ کتنے عجیب لگتے تھے۔ اپنی ساری سوچیں ایک طرف رکھ کر اس نے اس مضمری فیملی کو دیکھنا شروع کر دیا۔ پیچھا اور کومہ کر کے اسے آوازیں دے رہے تھے۔ پہلی بار ہی آئی تھی۔ اس نے پیچے سر جھکا لیا۔ اچانک احساس ہوا تھا کہ اس بے وقوفی نہ سمجھ لیں۔ اول روز کے بعد سے اس نے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس نے بھی اس کا حال احوال پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

”اب ابھی چکو۔ دولہا صاحب کے ”فشن“ ہی ختم نہیں ہو رہے۔“

وہ بیڑھیوں کے قریب کھڑے پھر سے آوازیں دینے لگے۔ جب اس نے اسے بیڑھیوں سے پیچھے اترتے دیکھا تھا۔ آف وائٹ شلوار قمیص میں وہ تیزی سے اتر رہا تھا۔

”اب بیڑھ بھی چکو، کتنا ملو گے سب سے۔“ لقمان

کی سرگوشی، سرگوشی تو ہرگز نہیں تھی، کیونکہ سب کو سنائی دے گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیڑھ گیا۔

”تارو بھی تصویریں۔ دولہا کا رخ روشن آخر نظر آ ہی گیا۔“

طارق صدیقی ایک بار پھر ایکشن میں تھے۔ نہ جانے انہوں نے طعنے کہا تھا یا مزاحیہ، بہر حال اسے ایک بار پھر سے ہنسی آگئی تھی۔ اتنے دنوں کے بعد وہ اس موڑ سے باہر نکلی تھی اور یہ سب کتنا اچانک ہوا تھا۔

”جیتے رہو، خوش رہو دونوں۔“ پیچھو نے دونوں کے سروں پر پیار دے کر ایک ایک گلاب جامن ان کے منہ میں ڈال دی۔

”ولمن یہ جو صاحب! ناہر پار مجھ سے ہار جاتے ہیں۔“ سبحان اس کے سامنے کھڑا اسے بتا رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے سر ہلادیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا بول رہا تھا بلکہ سب ہی اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بھی چونچل موڑ میں تھا۔ اگر خاموش تھی تو صرف وہی بھی بانی تو پھلی منڈی گرم تھی۔

”ہم تو اب نماز پڑھنے جا رہے ہیں، تم اٹھو ولمن کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔“

رخ کو ہوا کا بے حد تکیہ اپنا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ باقی سب بھی نماز پڑھنے جا چکے تھے۔ کمرے کی خوب صورتی اور خوبانگی دیکھ کر وہ ٹھک کر رک گئی۔

”ابو اور لقمان بھائی نے مل کر سجایا ہے۔“

رخ اسے بتا کر اب الماری کھول رہی تھی جہاں اس نے اس کی چیزیں سیٹ کی تھیں۔ کمرے کے کولوں میں جلتی موم پنیاں، دروازے سے بیڑ تک بنا پھولوں کا راستہ، بیڑ پر پھولوں سے بنادیا، خود اس کا دل ایک دم اس خوب صورتی کا اسیر ہوا تھا۔ رخ اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

”من انسب کو بھیجتی ہوں۔“

جاتے جاتے وہ شرارت بھری مسکراہٹ اس کی طرف اچھال گئی تھی اور انسب کا ذریعہ اسے ہوش میں لے آیا تھا۔ دل ایک دم ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا۔

”انسب انسب۔ انسب یہ ناہم۔“ اس نے دانت کچکائے۔

کمرے کی ساری خوب صورتی اس ایک نام نے سیاہ کر دی تھی۔ الماری سے اپنے لیے ساہو بیک سوٹ منتخب کر کے وہ ہاتھ روم میں گھس گئی۔ بہت دیر تک شور لینے کے بعد باہر نکلی۔ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے کرم کا مساج کرتے اچانک اس کی نگاہ اپنے عکس پر جا ٹھہری تھی، بڑی بڑی شرمیلی آنکھیں، خوب صورت نازک ہونٹ، کھڑی ناک، نازک صراحی جیسی گردن، گلابی رخسار، لمبا قد، کپڑوں کی جاکتی تھی، مگر کی جاچکی تھی۔ اس نے لمبا سانس بھرتے برش ڈرائنگ ٹیبل پر پھینک دیا۔

جس شخص کے حوالے سے وہ اس کمرے میں موجود تھی اسے کبھی قابل اعتناء نہ سمجھا تھا اور جسے اس نے اپنے جیسے کی وجہ بنا لیا تھا اس نے اسے جنم میں دھکیل دیا تھا۔ ”فیضان“ بغیر آواز کے اس کے لبوں نے جنبش کی۔ کیا یہ زندگی تھی۔ ایک گہری ٹھنڈی سانس بھرتے وہ مڑی، اسی وقت وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

اسے اس طرح بغیر دروازے کے دیکھ کر جہاں ایک ٹائیپ کے لیے وہ ٹھکا تھا وہیں وہ بھی بدحواس ہوئی تھی۔ سامنے بیڑ پر کھڑا عروسی ڈریس الماری میں پینگ کرنے کے لیے پکڑ لیا۔

”کچھ دیر کے لیے ہی سہی۔ تم سے اتنا انتظار بھی نہ ہو سکا کہ جس شخص کے حوالے سے تم اس کمرے میں موجود ہو اس کے لیے تیار۔“ اس کے اس حلیے پر اس کی سوچ عجیب تونہ تھی۔

نہ جانے اسے اس طرح سر جھاڑ منہ پہاڑ دیکھ کر دکھ کیوں ہوا تھا۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

بعض چیزیں واقعی اتنا بھاری بوجھ ہوتی ہیں کہ جتنی جلدی ان سے چھٹکارا پایا جائے اتنا ہی اچھا ہوتا

ہے۔ وہ عین اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، انداز نمایت سنجیدہ اور گھبراہٹا تھا۔ اشارہ اس کے ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کی طرف تھا۔ اس کے کھین شیوہ چرے پر نازہ شیوہ کی پٹلاہٹ تھی۔ جڑے بچھنے ہوئے اور کالی آنکھیں گھبرے پانیوں جیسی تھیں۔ ایک لحظے کو وہ واقعی شرمندہ ہوئی تھی اور حیران بھی۔

”کیا یہ وہی انسب تھا۔“

ایک قدم مزید بڑھا کر اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ٹھنڈے ہاتھ بھاری مردانہ ہاتھوں کی گرمی سے جیسے ٹھنڈے لگے تھے۔ سائڈ ٹیبل کی دروازہ کھولتے دو بھاری نگہن اس کے ہاتھوں سے ہوتے اس کے ہاتھوں میں منتقل ہوئے تھے۔ انداز میکا کی اور ردیو ٹک تھا، جسے وہ ابھی تک دو انسب سمجھتے ہوئے کسی خاطر میں نہ لارہی تھی۔ وہ غلطی باندھے اس کی آنکھوں میں ٹھنڈے کی کوشش کر رہا تھا۔ سراسیمہ ہو کر اس نے ہاتھ ہینچ لیے اس کے سگتے ہاتھوں کا لمس اس کے چہرے تک کو وہ کا گیا تھا۔ اس کی انڈی۔

”کیا یہ بھی امی نے دیے ہیں۔“ اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

ایک تہی ہوئی خشمگین نگاہ اس پر ڈالتے وہ ہاتھ روم میں بند ہو گیا۔ ایک مسخرانہ ہنسی ہنستے وہ جیسے جانی دشمن کو زیر کر کے آئی تھی۔ کمرے کے ازسرنو جائزے نے جہاں اسے خائف کیا تھا وہیں پریشان بھی کر دیا تھا۔ اتنا بڑا بیڈ روم صوفے کے وجود سے خالی تھا بیڈ کے آگے پرا کاؤچ، دو سنگل صوفے اور چھوٹی چھوٹی سائڈ ٹیبلوں کا جگہ پر سونے کے خیال پر اس نے لعنت جھینپی تھی۔ اب اس کے قدموں میں سونے سے تو رہی۔ بالی باہر کے بیڈ روم نہ جانے کس کس کے تھے۔ ایک ہی حل تھا اس کے آنے سے پہلے پہلے کبل اوڑھ کر بیڈ کے ایک کونے میں سوجانے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

”وہ ابو مس منت مجھے تاثر دینا چاہتی ہیں کہ ان



کے لیے میری اہمیت صفر ہے، حالانکہ جانتی نہیں کہ میں آپ کو صفر جیسی اہمیت بھی دینے سے قاصر ہوں۔ جس شخص سے آپ وابستہ رہی ہیں اس کا نام ہی مجھے اذیت دیتا ہے اور آپ تو بے اس نے سر جھٹک کر سب سوچوں کو بھی جھٹکنے کی کوشش کی تھی۔

بیز کا دوسرا کوٹا آباد کرتے اس نے دوسری طرف پلے کبل کو چنداں اہمیت نہ دی تھی۔ اسے ابھی بہت سا کام کرنا تھا۔ اس لیے اس قسم کے فضول کاموں کے لیے اس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ لیپ ٹاپ کھول کر لاگ ان کرتے وہ مصروف ہو چکا تھا۔ بہت بہادر اور پُر اعتماد ہوتے ہوئے بھی وہ تھوڑا ڈری ہوئی بھی اور پھر نہ جانے کب نیند کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔

\*\*\*

فیضان کے ساتھ مل کر میرا مذاق بنانے والی منت حادثاتی طور پر میری زندگی میں شامل ہو چکی تھی۔ بیڈ کے دوسرے کونے پر موجود وہ لڑکی بھی فیضان کے ساتھ منسوب رہی تھی، مجھے یہ بات بھلائے نہ بھول رہی تھی۔ شاید میں بھول بھی جاتا اگر اس کا رویہ کچھ بہتر ہوتا مگر وہ تو ازل روز سے ”سوک“ منہ ماری تھی۔

اسے میری اور مجھے اس کی زندگی کا حصہ زبردستی بنایا گیا تھا۔ شاید وہ مجھے ابھی تک وہی دتو، جھینو اور رک رک کر بولنے والا کم اعتماد انسب سمجھتی تھی جو اس کی باتوں سے خائف ہو جایا کرتا تھا۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی تھے۔ رشتہ بھی وہیں تھا اور ہم بھی۔ اگر اسے میری پروا نہیں تھی تو میں کون سا اس کے عشق میں فنا ہو رہا تھا۔ گزریے وقت نے جہاں اور بہت سی تبدیلیاں پیدا کی تھیں میری ذات بھی ٹکڑی ٹکڑی تھی اور اس میں سراسر میری اپنی کوششوں کا دخل تھا۔

رات بیت گئی تھی۔ اسے بیت ہی جانا تھا۔ خنکی نے اچانک ہی دھوا دھوا لولا تھا۔ ٹیرس کا روزا زہر مند کرتے میں اندر آگیا، جہاں وہ آرام سے سو رہی تھی۔ نیند تو

میری بھی بہت اچھی تھی۔ دو جانی دشمن ایک چھت کے نیچے ایک بیڈ کے مختلف کونوں میں مزے کی نیند سو رہے تھے۔

یہاں دل نہ لگنے کی وجہ اس کی عدم دلچسپی تھی۔ پچھو پچھا اس سے باتیں کرتے، فریال اور سن کر چہرے جاچکی تھیں۔ مگر ہر روز فون کیا کرتیں، مگر اس کی خاموشی ختم ہونے میں نہ آتی۔

پچھو اس کو زبردستی مخاطب کرتیں۔ پرانے قصے سناتیں۔ پچھا اپنے دن کی روداد سناتے اور وہ ہوں ہاں کرتے سنتی رہتی۔ انسب کے معمولات وہی تھے جن میں اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہ آیا تھا۔ رات دیر تک بیٹھ کر ٹک ٹک کرتا دیر سے سوتا، دیر سے اٹھتا اور کام پر چلا جاتا۔ اگر اس نے اسے اس کی اوقات میں رکھا تھا تو وہ بھی اسے چنداں اہمیت نہ دیتا۔ سارا دن اور بچے کے چکر لگاتی، تحریم سے بات کرتی، ٹاما کی آواز سننے فون بند کر دیتی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ پچھا اور پچھو سے باتیں کرنے لگی تھی، جیسی وہ تھی نہیں کتنی دیر ایسی دن کے رہ سکتی تھی۔

\*\*\*

”مجھے نہیں معلوم کہ کسٹم والوں نے ہماری لیدر گڈز کیوں پکڑی ہیں مگر ایک بات تو طے ہے کہ ہمارے لیے ایک بڑی مشکل کھڑی ہونے والی ہے۔ اگر مال چھڑوایا جائے تب بھی اور اگر وہ اسے کلیئر کرنے سے انکار کر دیں تب بھی مگر ابھی مسئلہ یہ نہیں ہے۔“

اس سات منزلہ عمارت کے چوتھے فلور کے تیسرے کمرے میں حسین بے چینی اور پریشانی کے عالم میں چکر کاٹ رہا تھا۔ ایک طرف کڑا امانت اس کی پریشانی کو اس کے وجہ چرے پر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر سے بند کر لیا۔

حسین ایک بار پھر بولنے لگا تھا۔

”مسئلہ تو پاکستان کا وہ آرڈر ہے جو پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہے، وعدے کے باوجود ہم ان کمپنیوں کو مال

پہنچانے میں ناکام رہے ہیں۔ اب وہ ہماری پہلے کی ساکھ کی بدولت اگر ہمارے آرڈر کو اسی طرح ساتھ لے کر چل رہے ہیں تو ہماری خوش قسمتی ہے ورنہ۔۔۔

بہر حال میں یہاں کسٹم کے معاملات دیکھتا ہوں، آپ پاکستان جائیں اور جو بھی مسائل ہیں انہیں فی الفور حل کرنے کی کوشش کریں۔“

اس کی آنکھیں بولتے ہوئے بھی گہری سوچ میں ڈوبی دکھائی دیتی تھیں۔ چاروں طرف سے مشکلات نے جیسے ایک دم دھوا دھوا بول دیا تھا اور وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ گزریے سالوں میں ایسی کسی مشکل سے واسطہ نہیں بڑا تھا، مگر اب۔۔۔

”آپ فکر نہ کریں حسین بھائی، آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

امانت علی کے من کی مراد جیسے بر آئی تھی وہ یہی تو چاہتا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے امانت اس کے ساتھ تھا، ہر چیز کے بارے میں جانتا تھا۔ پچھلی بار بھی تو آرڈر کی ساری تفصیلات وہی طے کر کے آیا تھا اور یہیں سے حسین کی بد قسمتی کا آغاز ہوا تھا۔ دونوں کے درمیان ہم زلف کا رشتہ حسین کے لیے اہمیت رکھتا ہو یا نہیں، لیکن امانت بلاوجہ ہی مقابلے بازی کا شکار ہوا تھا۔ امانت کے جذبات کبھی بھی حسین تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ مگر اس کی اتنی ترقی نے امانت کے دل میں عجیب طرح کے جذبات بھر دیے تھے۔

اگر حسین اس وقت اپنی سوچوں میں گم سامنے پڑی میز کو گھور نہ رہا ہوتا تو امانت کے ہونٹوں پر آنے والی مکارانہ مسکراہٹ سے کچھ نہ کچھ جان ضرور جاتا۔

\*\*\*

”اچھا بیٹے، میں جاری ہوں، اتنی چھٹیاں ہو گئیں، اب تو بچے بھی مجھے یاد کر کے تھک گئے ہوں گے۔“

حنا خاتون سر پر چادر جماتے اس کے سامنے کھڑی اسے بتا رہی تھیں۔ اس نے ان کے خوب صورت چہرے پر نظریں جماتے سر کے اشارے سے جی اچھا کہا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھیں، اس کی نظریں ان ہی پر جمی

رہیں۔

”اگر انسب یا اس کے ابو آئیں تو کھانا نکال دینا“ چاول تو بنے ہوئے ہیں، صرف گرم کرنے ہیں۔“ اس نے ایک بار پھر سے سر ہلا دیا۔

دروازہ خود کار لاک سے بند ہو گیا تھا۔ اس نے کسلندی سے ٹانگیں پھیلا لیں۔ کیسی عجیب بات تھی، لندن اگر جیسے وہ گاؤں میں آگئی تھی۔ وہی ماحول، کتنا عجیب تھا سب اس کی پچھو چھا صدیقی قریبی مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ شام دو گھنٹہ وہ مسجد میں گزارتیں، بہت پہلے وہ اس مسجد سے اپنے روزگار کے لیے وابستہ ہوئی تھیں اور اب اسے کار خیر سمجھتے ہوئے ابھی تنگ ساسی پر کار بند تھیں۔

پچھا طارق حسین کی فنیسی کپڑوں کی دکان تھی۔ لندن ساؤتھ ہال کا یہ علاقہ جس میں زیادہ تر ایشیائی آباد تھے۔ خوب پر رونق رہتا۔ پچھا ابھی خوش رہتے گاؤں سے آنے کے بعد انہوں نے یہاں روزگار تو ڈھونڈا ہی تھا، بہت سی دوسری دلچسپیاں بھی ڈھونڈ لی تھیں۔ گاؤں کے حقے کی جگہ شیشے کے حقے لے لی تھی۔ شیشے کا نیا نازک حقہ وہ کبھی کبھار بی گڑ گڑاتے یا شاید دکان میں اپنا شوق پورا کر لیتے ہوں گے۔ فریال اور سن دونوں شادی شدہ تھیں۔ ہنسنے یا دہنسنے بعد بچوں کے ساتھ چکر لگاتیں، دونوں کے دو، دو بچے تھے۔ دونوں بڑھی لکھی تھیں اور اسکول میں جاب بھی کرتی تھیں۔

یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک تھا، لیکن جوں ہی اس کی سوچ انسب کی طرف جاتی اسے غصہ آنے لگتا۔ (ایم۔ اے انگلش کرنے والی بیوی ورنہ کی بہترین اسٹوڈنٹ کے لیے یہی کپڑے بیچنے والا دکان دار ہی رہ گیا تھا۔ اس کی سوچیں زہر پٹی ہو جاتیں۔) اول روز والی (میں جہیں نہیں جانتی، کچھ نہیں سمجھتی۔) کیفیت ابھی تک برقرار تھی۔

گھر اس کی سوچ سے بڑھ کر خوب صورت اور بڑا تھا۔ کئی گھرے، بہترین فرنیچر، بڑا لان، آنے سے پہلے اس کے ذہن میں ٹک و ٹک دو کمروں کا فلیٹ گھوم

جاتا، جیسا کہ اس نے لندن کی رہائش کے متعلق پہلے سے سن رکھا تھا، مگر یہاں سب اس کی سوچ کے الٹ تھا۔ کبھی اسے تحریم کی باتیں یاد آئیں۔  
”ویل منز اور سافٹ اسپون سے ہیں انب بھائی۔“

دوسروں کے لیے تو وہ شاید سافٹ اسپون ہی تھا، مگر اس پر عجیب طفرے تیر رہا تھا۔ خیر وہ بھی کون سا کم کرتی تھی، وہ خود سرتھی۔ اس کی تھک کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ باہر تو دونوں عموماً (سب تھک ہے) کی ایکٹنگ کرتے بائے جاتے اور کمرے کے اندر بھی بھاری کشتی پھرتی رہتی۔

اس کی اپنی طبیعت میں عجیب طرح کا پچھتاوا بہت جلد ناراض ہو جاتی۔ جلدی مان بھی جانی، حالانکہ وہ گھر میں سب سے بڑی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر وہ ایسی ہی تھی۔ عجیب وغریب شخصیت کی مالک۔ کبھی پچھو پڑے طرح پیار آتا، پچھو پڑے ہی سنتے سنتے کتنی دیر گزر جاتی اور بھی ہر چیز سے دل اوب جاتا۔ کبھی بچوں میں سارا سارا دن گزار دیتی، تو کبھی ایک منٹ کے لیے بھی وہاں کھڑی نہ ہوتی۔

وہ جیسے تھا۔ اسے اس بات سے کوئی انکار نہ تھا، مگر اس دل کا کیا کرتی جو اس کی طرف مائل ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ اسے وہی دلو، جھینڈو انب سمجھتی تھی۔ جو اس کے قریب تک آنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔

\*\*\*

”تم کیا سمجھتے تھے کہ تم وہاں میرا تماشا بنا کر چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے تو میں وہیں تمہارے نام پر بیٹھی رہوں گی، سڑتی رہوں گی، دیکھو یہیں آگئی ہوں۔ میں اور بہت خوش ہوں۔“ ایک ہی سانس میں جملے بولتے اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔

بچن میں چائے بناتے بناتے اسے نہ جانے کیا ہوا تھا۔ وہ فیضان جسے نفرت سے سوچتے اس کا گریبان پکڑنے کی خواہش تھی۔ آج اچانک اس کا نمبر سامنے آنے پر اس کا نمبر ملا بیٹھی تھی۔ وہ اسے بتانا کیا چاہتی

تھی، خود اس بات سے لاعلم تھی۔  
”بس یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا تم نے یا کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو۔ ویسے بھی میں شادی کے نام پر ایک اور ”ماں“ پالنے کا قائل نہیں، ایک ہی بہت ہے میرے لیے۔ جب شادی کے بغیر ہی معاملات حل ہو رہے ہوں تو شادی نام کا پھندا گلے میں ڈالنے کی ضرورت کیا ہے۔“

اس کی مکروہ آواز نے دوسری طرف کی خاموشی کو توڑا تھا اور توڑتی چلی جا رہی تھی اور وہ جوں کے نہیں خانے میں اس کی معذرت، شرمندگی کی خواہش رکھتی تھی اس کی بے شرمی، ڈھٹائی اور بے غیرو دیکھتے وہیں سن کھڑی رہ گئی تھی۔ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”لیزا اور میں ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے بغیر عرصے سے لیوگ ریلیشن شپ میں ہیں۔ نہ وہ میرے معاملات میں دخل دیتی ہے نہ میں اس کے سارا قصور میری ماں کا ہے جو یہاں کی ہر چیز کو سینے سے لگا کر اس کی چیز کو برا سمجھتی ہے۔ باہر بار نہیں بتانے کی کوشش کی مگر تم۔ اور میری ماں اگر زہر کھانے کی دھمکی دے کر پاکستان نہ لے جاتی۔“ وہ نہ جانے کیا کیا کہتا جا رہا تھا۔

”تم اس قدر گھٹیا ہو گے اس کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔“ چائے ابل ابل کر اودوں کے اوپری حصے میں پھیل چکی تھی، مگر اسے اور گرد کا ہوش ہی کب تھا۔

”اس قدر گھٹیا!!“ اس کا جاتی قہقہہ اسے فون کے اندر سے کان پھاڑتا سنا لی دیا تھا۔

”اگر تمہارے ساتھ شادی کر لیتا لیذا کو بھی ساتھ رکھتا تو پھر اچھا ہوا کیا؟“ یہی محبت کرتی ہو جھجھکے۔  
”ہاں آواز کرتے نہایت عامیانہ انداز میں کہا گیا تھا۔ جیسے وہ محبت کرنے والوں کے درمیان راز و نیاز چل رہے ہوں۔“

”محبت اور تم سے۔“ اس نے ایک طرف تھوک دیا۔

”مجھے صرف اپنے شوہر سے محبت ہے۔“ کمزور لہجے اور بے یقینی کے ساتھ شاید وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس پر اس کا قہقہہ پہلے سے بھی بلند آہنگ تھا۔  
”تمہارا شوہر؟ ماں پتا چلا تھا۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ۔“  
رازداری سے کہتے اس نے آواز کو بالکل ہلکا کر کے جیسے کان سننے کے لیے قریب کیا تھا۔ ”وہی شخص جو دوسروں کی آنکھوں میں دیکھ کر بات تک مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ وہی شوہر ہے نا تمہارا۔ تو کیا اتنا حوصلہ ہے اس میں کہ دیکھے بغیر ہی۔“

اس کے کان کی لوں سرخ ہو گئیں۔ سارے جسم کا خون جیسے چرے پر اٹھا ہو گیا تھا۔ اس کی معنی خیز بات نے اسے جیسے چلنے جنم میں دھکیل دیا تھا۔ اس شخص کی خباثت سے وہ پہلے کیوں کر لاعلم رہی تھی۔  
”جو اس بند کو گھٹیا نہیں انسان۔“

مغالطات کا ایک طوفان زبان پر آنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے فون بند کر کے میز پر رخ دیا۔ لمبے لمبے سانس لیتے اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ آنسو نہ جانے کہاں کہاں سے اڑ کر آرہے تھے۔ کرسی پر گر کے وہ پچھلیوں سے رو رہی تھی۔

”کیا یہی وہ شخص تھا جس کے لیے لعنت ہے تم پر فیضان، لعنت۔“ اس کے مکروہ اور گھٹاؤنے کردار کو سوچتے ہوئے اسے اس سے نفرت ہو رہی تھی، بلکہ وہ خود سے بھی نفرت ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کیا اس نے اس شخص کو سوچا تھا۔ ایک بد کردار شخص جس کا مکروہ اور مخ شہدہ چہرہ اس کے سامنے تھا اس کی گندی زہیت اور اس کی باتیں اس کے دماغ میں چکرائی رہیں۔

وہاں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ پہلے پہل اسے اپنے فون کرنے پر بچھتا ہوا تھا، مگر شاید یہ ہی بہتر تھا، کیونکہ اس کے فون کرنے سے دل میں ذرہ برابر بھی اس کا خیال نہ رہا تھا۔ اس کا اعتماد اس کی وجاہت اس کی شخصیت سب کچھ اس کے کردار کی آلودگی سے آلودہ ہو گیا تھا۔ وہ شخص نفرت کیے جانے

کے قابل تھا۔

\*\*\*

”آپ کا جو آرڈر آیا ہے اس میں کچھ ایسے کیمیکلز پائے گئے ہیں جو انسانی صحت کے لیے مضر ہیں، ان کی ہم پڑ تال کر رہے ہیں۔ آپ کا سامان تب تک کلتھو نہیں کیا جائے گا۔ جب تک یہ معاملہ مکمل طور پر حل نہ ہو جائے۔“ سامنے کھڑے آفیسر نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ یہ ایک بڑا آرڈر تھا اور اس کے اندر مضر صحت کیمیکلز کا ہونا صرف آرڈر کے لیے ہی نہیں کمپنی اور اس کی ساکھ کے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا تھا۔

”مگر اس سے بھی بری اور بڑی خبر یہ ہے کہ آپ کی کمپنی اس معاملے کے حل ہونے تک ورکنگ پوزیشن میں نہیں ہوگی۔“

وہ ڈولتے قدموں سمیت گاڑی تک پہنچا تھا۔ کافی دیر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اس نے کچھ سوچنے کی کوشش کی۔ ابھی بج ہی تو امانت علی سے اس کی بات ہوئی تھی۔ وہاں کا آرڈر بھیجا چکا تھا اور ابھی بھی کڑی گئی تھی۔ اس کا حال بھی وہی ہونے والا تھا جو پہلے والے کا تھا یا۔ کمپنی ورکنگ پوزیشن میں نہیں تھی تو یہ آرڈر۔

گاڑی چلاتے ہوئے اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان ساری سوچوں نے اسے اس قدر تھکا دیا تھا کہ وہ صرف اور صرف آرام کرنا چاہتا تھا۔ اسی آرام کی خواہش میں اس کی آنکھیں ایک سیکنڈ کے لیے بند ہوئی تھیں اور وہ سامنے سے آئی گاڑی دیکھ نہیں پایا تھا۔ ایک دھماکے کو سنتے اس کا دماغ ڈوبن تارکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

\*\*\*

اس نے اسے کچن ٹیبل پر سر رکھے روتے دیکھا تھا، وہ اس کی آمد سے بے خبر پچھلیوں سے رو رہی تھی۔ فون پر ہونے والی گفتگو اس نے بلا ارادہ سنی تھی۔ دروازے کی چابی گھر کے ہر فرد کے پاس تھی اس لیے

اس کے اندر آنے کا اسے علم نہیں ہو سکا تھا۔ وہیں رک کر اس نے چپ کر دیا یا ویسے ہی چلے جانے کے بارے سوچا۔ پھر دیر کھڑا سوچتا رہا اور پھر اس کے حال پر چھوڑ کر ان ہی قدموں واپس چلا گیا۔ ستر تھا کہ اسے خود سے سوچنے، فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے غبار نکل گیا تھا۔ یقیناً اب بہت کچھ بہتر ہونے والا تھا۔

\*\*\*

”آہ! میں آپ سے معافی مانگتے آئی ہوں۔ بغیر کچھ بھی کئے مجھے معاف کر دیجیے۔“ ہمارے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

وہ جو اس کے آنے پر حیران تھیں وہیں کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور چہرے پر ندامت کا غبار چھایا ہوا تھا۔

”جس اولاد کے لیے سب کچھ کیا، اس نے دھوکا دے کر ثابت کر دیا کہ جو کچھ بوسمیں گئے وہی اصل کاٹنی پڑے گی۔ سوچا تھا فیضان کی شادی کر کے اسے اس کی حرکتوں سے باز رکھ سکیں گے اور لقمان کے ساتھ کاروبار میں۔ مگر۔۔۔ رندھی آواز میں جملہ مکمل نہیں کر سکی تھیں۔

حنانے آگے بڑھ کر انہیں بیٹھے کا اشارہ کیا، مگر انہوں نے انکار میں گردن ہلا دی۔

”نہیں، میں رک نہیں سکتی۔ بس آپ معاف۔۔۔ شرمندگی سے جھکا سر کچھ اور بھی جھک گیا۔

”میں نے معاف کیا۔“ حنان کے منہ سے سنتے ہی وہ روتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

”حنان! ان لوگوں نے سب کچھ کھالیا، تم لوگوں کو گھر سے بے گھر کر دیا، کاروبار پر قبضہ کر لیا اور تم نے پھر بھی ان سے ملنا نہ چھوڑا۔“

رضیہ آپالندن سے ماچسٹر منتقل ہو چکی تھیں۔ لندن آنے پر انب کی شادی کی مبارک باد دیتے آنے پر انہوں نے ہما کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خود

پر قابو نہیں رکھ پائی تھیں۔ انہوں نے حنا اور طارق حسین کو گاڑوں سے بلوایا تھا۔ ان دونوں سے خاص الفت رکھتی تھیں وہ اونچی آواز میں بول رہی تھیں۔ منت کے قدم دروازے سے اندر آتے وہیں جامد ہوئے تھے۔

”مجھے تو ابھی تک یاد ہے، کیسا مشکل وقت کا نام نے اور تمہاری اولادوں نے۔ طارق بے چارہ زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا، بچے ابھی کسی قابل نہ تھے۔ کاروبار پر ہنونی نے قبضہ جمایا، بن کو بھی شرم نہ آئی، اسے سمجھاتی۔ احسان کا بدلہ دھوکے اور فریب سے دیتے پہلی بار دیکھا۔ کیسے لوگ ہیں، پھر اسی شکل و صورت کے ساتھ آجاتے ہیں۔“

لگی لپٹی رکھے بغیر بولنے والی رضیہ آپا کے متعلق اس نے پچھلا سے سنا تھا۔ دونوں پچھلا پہلے لیڈر کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ وہ جانتی تھی، پھر بڑے پچھلا کا کاروبار ایک سیلنڈر کی وجہ سے ٹھپ ہو گیا تھا۔ مگر اندر کی حقیقت اسے آج معلوم ہوئی تھی۔

”عرصہ ہو گیا آہا! اس بات کو ہم بھول بھال بھی گئے، چھوڑیں آپ بتائیں، آپ کا کیا حال ہے، بچے کیسے ہیں؟“

حنان یکم نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کا دھیان کسی اور جانب لگانے کی کوشش کی۔

”کیسے بھول جاؤں؟ میرا بھائی، زمینیں بیچ کر اس نے سارا کا سارا سرمایہ یہاں لگا دیا تھا۔“ رضیہ آپا نے پچھلا کو بھائی بنا رکھا تھا، یہ بھی وہ جانتی تھی کیسے کیسے راز منکشف ہو رہے تھے۔

”گھڑیا کا تائیں، آپا کیسی ہیں، اس کے بچے کیسے ہیں، ہمیں ہے یا وہ بھی ماچسٹر چلی گئی۔“ حنا آخر ان کا دھیان بنانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

”ہاں وہ بھی ماچسٹر چلی گئی۔ میاں کی جاب جو وہاں ہو گئی تھی تو یہاں رہ کر کیا کرتی۔“

وہاں سے قدموں کو موڑتے بہت سے پردے آنکھوں سے مٹے تھے۔

چھوٹی پچھلا کا ہر سال پاکستان کا چکر لگانا بے دریغ

پیشہ خرچ کرتا، شوخیوں بڑی پچھلو اور ان کی اولادوں کی برائیاں مذاق دینا تو سب ہونے کے طعنے جاہل کہہ کر مذاق اڑایا جاتا۔ اونچی حرکت اور وہ خود بھی تو کسی حد تک اس سب میں شامل رہی تھی۔ لوگوں کے چروں پر بڑے نقاب سرک گئے تھے اور اسے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

”ہی! کیا کرنے آئی تھیں آنٹی یہاں۔“ بچن میں سالن گرم کرتے اس نے اسے پہلی بار اونچی آواز میں بولتے سنا تھا۔

”تمہاری شادی کی مبارک دیتے آئی تھی، صرف دو منٹ کھڑی رہی، پھر واپس۔“ ساری عمر وہ اپنی بہن کے لیے خود کو مجرم سمجھتی رہی تھیں۔

”میں نہیں دیکھتا ہوں تو میرے اندر دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ کیسا مشکل وقت تھا وہ ابو کی دوائی کے پیسے نہ تھے۔ ہماری رہائی کے اخراجات، وہ ساری کسمپرسی یاد آجاتی ہے دیکھتے ہی۔ ویسے تو انہوں نے فراڈ کے ثبوت چھوڑے ہی نہیں تھے اور اگر کچھ تھے بھی تو آپ کے اور ابو کے رویے کی بدولت۔ جب انہوں نے کوئی شرم نہیں کی تو آپ نے کیوں لحاظ رکھا بہانے کا۔“

”ہم نے سب کچھ لاندہ پر چھوڑ دیا نسب۔“ ان کے ایک جملے نے اسے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

آہستہ آہستہ اس پر سارے راز فاش ہوتے چلے گئے تھے۔ امانت پچھلانے کس طرح ”حسینہ“ کی جڑیں کاٹنے خود کی بد رکھنی بنائی تھی۔ اگر بڑی پچھلو نے پاپا سے ذکر بھی کیا ہو گا تو اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی، ویسے بھی شروع ہی سے اس کی ساری کی ساری توجہ چھوٹی پچھلو اور ان کی اولاد کے لیے تھی۔ وہ اس کے لیے ایک ماڈل تھیں، پھر فیضان کے ساتھ عرصہ منگنی رہی تھی دل خود بخود اس کے لیے نرم ہوتا چلا گیا تھا اور اب ہر راز سے پردہ اٹھ گیا تھا۔

بڑی پچھلو اور پچھلا کس قدر صابر اور اچھی طبیعت کے تھے، ان کے ساتھ رہنے پر اس پر منکشف ہو گیا

تھا۔ احساسات بدلے تھے، حقائق سامنے آئے تھے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ اس کا اٹھنا اس کا بیٹھنا بات کرنے کا انداز، ہر چیز تو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ بھی کھینچ رہی تھی۔

”جسوال سنگھ کے بڑے بھائی کی شادی کتنی برات دور جاتی تھی تو ٹرین میں جانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔“ طارق حسین کو فیسے سنانے کا شوق تھا، ابھی بھی وہ منت کے شوق اور اشتیاق کو دیکھتے ہوئے چائے۔

بنو کر اسے اپنے سکھ دوست کا پراقتصد سنا رہے تھے۔ ریڈ سوٹ میں ان کے ایک طرف بیٹھی وہ چائے پینے کے ساتھ ساتھ انہیں سن رہی تھی۔ ایک طرف چٹختی حنا بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھیں، حالانکہ یہ قصہ انہوں نے کئی بار سن رکھا تھا۔ اس نے انہیں بیڈ روم کے سامنے بنے ٹیرس سے دیکھا تھا۔ آج کل اس کی دلچسپی ہر چیز میں محسوس کی جاسکتی تھی۔ صوفے پر پاؤں اوپر کیسے اس کا اشتیاق قابل دید تھا۔

”ٹرین کے اس ڈبے میں جہاں باپنی لوگ بیٹھے تھے، جسوال رش کی بدولت نہ بیٹھا، ٹرین کہیں رکی تھی، کوئی پھوٹا اسٹیشن تھا۔ ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔

لڑائی ہو گئی لڑائی ہوئی۔ جسوال سمجھا کہ اس کے بھائی کی لڑائی ہو گئی۔ سکھ تھا نا، بارہ تو ویسے ہی بچے رہتے ہیں ان کے۔“ بات سنانے سنانے وہ خود ہی ہنسے تھے۔ وہ بھی آکر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ پوری طرح ابو کی طرف متوجہ تھی۔

”بارش کے دن تھے، اس کے ہاتھ میں لمبی کالی چھتری تھی، اس نے آؤ دیکھنا، تاؤ، باہر نکل کر لڑائی والی جگہ کی طرف دوڑ لگادی۔ جہاں دو افراد باہم برسر پیکار تھے۔“

وہ تھوڑی دیر رکے۔

”ان کو الگ کرتے اس نے زور سے چھتری ایک کے منہ پر ماری۔ اس کی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ بعد میں پتا چلا لڑائی کسی اور کی ہو رہی تھی۔ قریب ہی پولیس کے جوان کھڑے تھے۔ انہوں نے سنگھ کو پکڑ لیا۔ بھائی بے چارہ جس کی شادی پہلے ہی بڑی

مشکل سے چالیس سال کی عمر میں ہو رہی تھی۔ اسے اپنی بڑائی کے کہیں شادی ہی نہ رک جائے۔  
 ”کیوں میرے دیوانے پیچھے نہ گیا۔“  
 (کیوں میری شادی کے پیچھے نہ گئے ہو۔)  
 ان کا سنانے کا انداز اس قدر مزے کا تھا کہ اس کی آنکھیں اور ہونٹ دونوں ہنس رہے تھے۔ اس ہنسی نے اس کے گلابی چہرے کو مزید گلابی کر دیا تھا۔ آنکھوں سے پانی نکل نکل کر شفاف گالوں کو بھگور رہا تھا اور شاید پہلی بار اسے اپنی توجہ اس پر سے ہٹائی، اس قدر مشکل لگی تھی۔

”پھر شادی ہوئی کہ نہیں۔“  
 اسے جان لینے کی جلدی تھی۔ آنکھیں صاف کرنے پر اس نے اسے سامنے بیٹھے دیکھا تھا۔ بظاہر لا تعلق نظر آتے طارق حسین کی طرف مکمل متوجہ۔  
 ”ہاں شادی تو ہو گئی پر جہول شادی ایڈینڈ کرنے کی بجائے جیل میں بند رہا۔“

اس لیونگ روم میں اپنائیت کا جو احساس اس نے محسوس کیا تھا وہ کبھی کہیں بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے گھر میں بھی ایک ٹکلف کی فضا ہر وقت برقرار رہتی تھی۔ محبت اور سادگی کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا اسے یہیں آکر پتا چلا تھا۔

\*\*\*  
 لاہور میں وہ دیر سے ہی اٹھا کرتی تھی مگر یہاں آکر معمولات تھوڑے بدلے تھے، کبھی دیر سے جاگتی، کبھی جلدی جاگ جاتی۔ حنا پھونکنے سے کبھی کچھ کما نہیں تھا، مگر انسب تو دیر سے ہی اٹھتا تھا۔ نہ جانے رات رات بھر جاگ کر کیا کرنا رہتا تھا، رات کے کسی پہر آنکھ کھلتی تو اسے لب ٹاپ پر مصروف ہی دیکھتی۔  
 ”پیارے مجھے ایسے شخص سے بچانا چاہتے تھے جو عورتوں کے پیچھے بھاگتا نہ رہے تو اب اس کے بھی تو وہی کر توت ہیں۔ ساری ساری رات جاگ کر اگر چیٹنگ نہیں کرتا تو کون سے وظیفے کیا کرتا ہے بیٹھ کر۔“  
 ابھی بھی اس کی ٹک ٹک سے آنکھ کھلی تھی۔

سو نے کی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ جل کر سوچتے اس نے ذرا سا کمبل ہٹا کر دیکھا۔  
 نہ جانے کس بات پر مسکرا رہا تھا، کچھ دیر وہ اسی طرح اسے دیکھتی رہی۔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے لب اب مسکرا رہے تھے۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے پہ چھائی ہلاکت کچھ اور ہی کہانی ساری تھی۔ اس کی سوچیں آتش فشاں کی طرح اس کے اندر آگ لگا کر بھسم کر رہی تھیں۔  
 ”کیا یہ ٹک ٹک بند نہیں ہو سکتی۔ دل غم یک گیا ہے میرا اسے سن سن کر۔“ جل کر آخر کمرہ ہی دیا تھا اس نے۔ نہ جانے وہ میلی لکڑی کی طرح کیوں سلگ رہی تھی۔

کمبل سے باہر نکلا چہرہ تھوڑے بکھرے بال اور ادھ کھلی آنکھیں وہ لگتی دیر سب کچھ چھوڑ چھاڑ اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ کٹھن صلی بی کی طرح دانت چیکچکا رہی تھی۔ وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

دانت تو ایسے نکلے پڑے ہیں جیسے ہفت اقلیم ہاتھ آگئی ہو۔ وہ بھی اسے ٹھوڑے ہوئے سوچے جاری تھی۔

اس کے مسکرانے یا نہ مسکرانے سے میرا کیا تعلق۔ اس کی سوچ اسے تسلی دے رہی تھی یا غم غلط کر رہی تھی۔

”سوری میرا نہیں خیال کہ یہ آپ کو ڈسٹرب کرتی ہوگی، کئی بار سوچا لیپ ٹاپ بدل لوں مگر اس کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ ہر بار ٹاپ دیتا ہوں۔“

وہ اس سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے ان کے درمیان بڑے دوستانہ تعلقات چلے آ رہے ہوں۔ اس کا معذرت خواہانہ انداز خلاف توقع ہی تھا، اس لیے وہ کر وٹ بدل کر خاموش ہو گئی تھی۔

”کل ہی چھینچ کر لوں گا۔ دراصل دوسرے لیپ ٹاپ یہ کام ہی نہیں ہوتا۔“ اس کی آواز اس کے پیچھے سے ابھری تھی۔

”ہاں بڑا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہو نا جو کام اوجھڑا گیا تو ”سیا پے“ میں پڑ جاؤ گے۔“ تب کر اس پر

وہ حرف سمجھے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔  
 آج کل پچھلے کے استعمال شدہ لفظ اس کے دماغ میں چکراتے رہتے۔ سیا پے والا لفظ بھی اس نے ان ہی سے سنا تھا۔ آنکھیں بند کرنے پر بھی نیند نہیں آتی تھی۔ حالانکہ اب وہ کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔  
 ”مگر کچھ نہیں کر رہا تو کیا کر رہا ہے؟“ گھبراہٹ میں وہ اٹھ بیٹھی، عجیب مشکل تھی۔  
 ”کیا ہوا؟ نیند نہیں آ رہی۔“ اس کی گھیسر آواز پر وہ جلدی سے چپل پہن کر کھڑی ہو گئی۔

اس طرح اور مشکل تھی اس طرح اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا اور اسی نے اسے کمرہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا، مگر کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا گیا تھا۔ وہ نہ جانے کب اس کے پیچھے چلتا اس کے پاس آ گیا تھا۔

”میں کسی اور کمرے میں چلا جاتا ہوں، تم سو جاؤ۔“ وہ ابھی تک اس کا بازو پکڑے اسے روکے ہوئے تھا۔

”میں پانی پینے جا رہی ہوں۔“ اس کی مکمل توجہ ساری نہیں جاتی، بے اعتنائی برداشت نہیں، نہ جانے وہ چاہتی کیا تھی، بازو چھڑا کر اس نے قدم آگے بڑھایا۔

”پانی بہ رکھا ہے۔“ اس نے اس کے ہاتھ کا منہ بند کر دیا تھا۔ ابھی شام ہی میں تو خود پانی کا جگ بھر کر رکھا تھا اس نے۔ اس نے ایک نظر چمک پر ڈالی اور دوسری اس کے شرمندہ چہرے پر، وہ واقعی اس کی نیند خراب کیے جانے پر شرمندہ تھا۔

”میں کافی پینا چاہتی ہوں۔“ نظروں کے ارتکاز پر اس نے رخ موڑتے سمسناتے ہوئے کہا تھا۔

نی الوقت وہ اس کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ابھی تک تو وہ یہی سمجھے بیٹھی تھی کہ وہ اسے نظر انداز کر رہی ہے۔ اسے اہمیت نہیں دیتی اور یہ کہ وہ اتنی اہمیت ہی نہیں رکھتا کہ اسے۔ لیکن آج اس کی اس سوچ کی لٹی ہو گئی تھی۔ وہ مرد تھا۔ اختیار رکھتا تھا اور

اہمیت بھی رکھتا تھا، اگر چاہتا تو اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ باہر نکل کر کتنی ہی دیر وہ لاؤنج میں بیٹھی رہی، کافی پینے کو کس کا فر کا پل چاہ رہا تھا، مگر زمانہ گلے پڑ گیا تھا سو اب بتائی پڑ رہی تھی۔

”کیا وہ اس دلو بے اعتماد و کلان دار سے خائف ہو کر کمرے سے بھاگ آئی تھی۔ اپنی کلاس کی سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ، جس کی خوب صورتی محسوس کر دینے والی تھی۔ وہ اس شخص کے سامنے بے بس ہو رہی تھی۔

\*\*\*  
 طارق حسین کی زندگی اس خوف ناک ایکیسیڈنٹ کے بعد کئی مہینے اسپتال اور پھر گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ”حسین“ کے سارے معاملات امانت علی کے ہاتھ آ گئے تھے۔ وہ جو پہلے سے کسی موقع کی تلاش میں تھا، اس ایکیسیڈنٹ نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ چوری جیسے رجسٹر ہونے والی اس کی لیدر کمپنی ”حسین“ کے بند ہونے کی بدولت سارے کے سارے آرڈرز ملنے کے بعد سب کی نظروں میں آ گئی تھی۔ اکاؤنٹ کے سارے معاملات اسی کے سپرد تھے۔ اس نے کمپنی کا پیسہ اپنی کمپنی میں ایسے والا تھا کہ بستر پر طالع حسین کو کالوں کلن خبر نہ ہو سکی تھی۔

حسین کے علاج اور کمپنی کے کھاتے کلینر کرنے کے لیے قرض لینا پڑا تھا، جو بعد میں مکان بیچ کر ادا کرنے کی بدولت حسین، حنا اور بیٹے دوبارہ اسی دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں آ گئے تھے جو بہت پہلے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ بیٹے ابھی چھوٹے تھے، کچھ کرنے کے قابل نہیں تھے اور حسین مکمل طور پر بیوی کی تنخواہ پر گزارہ کرنے پر مجبور تھا۔

یہ وقت حسین اور اس کی فیملی کے لیے امتحان ثابت ہوا تھا۔ سب کچھ گوانے کے باوجود حنا کی حوصلہ مندی، صبر اور قناعت اسے بھی جینے کا حوصلہ دیتے، اسے اپنے مکمل ٹھیک ہونے کا انتظار تھا۔ جب وہ دوبارہ سے کام کرنے کے قابل ہو جائے تو امانت اور ہما کو ابھی تک اپنا خیر خواہ ہی سمجھتے تھے اور آخر وقت

تک ایسا ہی رہتا اگر اس کی ملاقات فدا حسین سے نہ ہو جاتی۔

”فیکٹری سے تمہارا پتالے کریہاں پہنچا ہوں“ عرصے بعد پاکستان آیا تو تم سے ملنے کو دل چاہا، بس تھوڑی دیر دھوپ کرنی پڑی۔“

طارق حسین ٹھیک ہونے کے بعد ج سوال نگلے کے ساتھ اس کی دکان پر بیٹھنے لگا تھا جو ساؤتھ ہال میں تھی۔ ج سوال نگلے انڈیا سے فنیسی کپڑے منگوا رہا تھا اور اس بار اسی کے کہنے پر طارق حسین پاکستان سے کپڑے لینے آیا تھا۔

اب وہ ایک عام شخص تھا جسے فیکٹری کے مالکوں سے ملنے نہیں دیا گیا تھا، مگر فدا حسین اس فیکٹری کا مینجر تھا جو رٹائر ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ طارق کے اچھے تعلقات رہے تھے۔ فدا اس کو گھر کے اندر لاتے تھوڑا خائف تھا، مگر اب اسے اس طرح ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی، جس طرح وہ اس وقت ڈرتا تھا، جس وقت طارق کے آرڈر کو خراب کیا جاتا تھا۔ اپنے دل پر دبا ہوا اس نے طارق کو حقائق بتا کر رو کر لیا تھا۔

”مانت علی نے تمہارے سارے کاروبار کو تباہ و برباد کر دیا، وہ تمہارا رشتہ دار تو تھا ہی آستین کا سانپ بھی نکلا، جس نے تمہیں ڈس لیا۔ وہ تمہارے ایکسیڈنٹ سے بہت پہلے اپنی کمپنی رجسٹر کروا چکا تھا اور پھر یہاں تمہارے آرڈر میں ایسے اجزاء جو خطرناک تھے اسی کے کہنے اور لالچ دینے پر استعمال کیے گئے تھے۔“

فدا حسین سر جھکائے اس پر سارے راز کھول رہا تھا۔ دل کے درد سے بچ جانے والا فدا اپنے دل کا بوجھ لٹکا کر رہا تھا اور طارق پریشانی، حیرت، افسوس اور یقینی کی کیفیت میں گھر آس کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی یقین کر رہا تھا۔

”بھلا کوئی شخص احسان کا بدلہ بددینا ہی دھوکے اور فریب کی صورت میں کیسے دے سکتا ہے۔“ لندن جانے کے بعد فدا کی کئی ساری باتیں

تحقیقات سے ثابت ہو گئی تھیں۔ کاروباری حلقے پہلے ہی اس راز سے واقف تھے جس سے وہ ایک عرصے تک ناواقف رہا تھا۔ جتنا کہ سب کچھ بتاتے جتنا دیکھی وہ تھا اس سے زیادہ جتنا تھی۔ کیونکہ اس کا رشتہ بہن کے حوالے سے نازک تھا۔

”اب میں طارق سے کیسے نظریں ملاؤں گی کہ میری بہن اور بہنوئی نے ایسا کیا۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو مجھے ساری زندگی طے دے کر چھٹی کر دیتا، مگر طارق نے چپ سا دھلی تھی۔“

طارق اور لمانت کی آخری ملاقات خود انہی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی جہاں لمانت نے طارق کی باتوں پر اسے دھکے دے کر اپنے دفتر سے باہر نکال دیا تھا اور انہی ایک دھوکے باز شخص اور اس کی اولاد سے نفرت کرنے لگا تھا۔

باپ کی بے عزتی اسے راتوں کو پریشان کر دیتی۔ ایک مہینے شخص کی کمینگی اور دھوکے بازی نے اس کے ہنس کھ باپ کو سنجیدی کے لہوے میں غلو ف کر دیا تھا۔ اس نے ”نسب نامہ“ کے نام سے بلاگ لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ بلاگ عموماً ”فیملی، کنڈز“ ریلیشن“ کے ٹاپک پر لکھا کرتا، مشورے دیتا۔ آہستہ آہستہ اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تھی اور وہ ایک مشہور بلاگر بن چکا تھا۔

اس کا بلاگ معلومات کا خزانہ ہوتا۔ لوگ اس سے طرح طرح کے مشورے مانگتے، اس کے بلاگ پر تبصرے کرتے، یہی بلاگ اس کی کمائی کا ذریعہ بھی بن گیا تھا۔ اس نے ان ہی بیویوں سے گھر گاڑی طارق کی دکان خریدی تھی اور ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کی کوششوں سے طارق حسین کی جس مزاج پھر سے لوٹنے لگی تھی۔

”تو یہ تھا تمہارا وہ کام جو تم آجھی رات تک بیٹھے بیٹھے کیا کرتے تھے۔“

ٹیس پر سرگرم پھونکنے کے بعد وہ ہاتھ روم میں گھس گیا اب وہ چندہ بیس منٹ لگا کر باہر نکلتا۔ تیار لیتا، برش کرتا، اتنے عرصے سے کمرے میں ہونے سے

وہ اس کے معمولات سے تو واقف ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے بیڈ کے سائڈ پر رکھا لیپ ٹاپ اپنے سامنے کرتے اس کی مصروفیت سے آگاہ ہوتے وہ حیران تھی۔ بلاگ لکھتے لکھتے وہ اٹھ کر گیا تھا۔

”نسب نامہ“ اس کے سامنے تھا۔ اس کے فالوئرز کی تعداد دیکھ کر اس کا سانس اور کا اور اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ وہ روزانہ کی بنیاد پر بلاگ لکھنے والا ایک بڑا بلاگر تھا۔ اسکول ڈاؤن کرتے اس کے مشورے لوگوں کی تحسین لوگوں کے کہنے اس کے سامنے آتے چلے گئے۔ اس کا بلاگ معلومات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ حیرت کی انتہا گمراہیوں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی اور ابھر کر ڈوب رہی تھی۔

فیضان کی رذالت اور کمینگی نے اسے اس کی طرف مائل کیا تھا۔ پھر رضیہ آئی کی باتوں سے وہ پچھتا پچھو اور اس کے صبر جو صلے اور احسان کی قائل ہوتی چلی گئی تھی اور آج اس کی ذہانت اور اعتماد نے اسے چاروں شانے جت کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ لیپ ٹاپ پلائے ساکت تھے اور آنکھیں گہری سوچ کی غماز لگا سا کھٹکا ہوا تھا۔ جلدی سے لیپ ٹاپ رکھتے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ لپٹے، کبل خود پر اوڑھتے، اس نے کبل کی بنی جھری سے اسے باہر آتے دیکھا۔

تو لیے سے بال رکڑتے وہ رفیم چھڑک رہا تھا۔ بلا کا نفاست پسند شخص تھا۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور نی شرٹ میں رات کے ایک بجے سوئے کی تیاری ہو رہی تھی۔ چوری چوری اسے دیکھتا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ چوڑے شانے، الباقہ وہ بہترین شخصیت کا مالک تھا۔ پسلیاں تو فکریا ہر آتے دل پر ہاتھ رکھتے اس نے کوٹ بدل لی۔ لائٹ بند کر کے اب وہ بیڈ پر آکر لیٹ گیا تھا۔ لال بھجوا کا چہرے پر پھیلی نرم گرم مسکراہٹ اندھیرے میں جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

”تو مس منت! تم ایک دکان دار کو دل دے ہی بیٹھیں۔“ سوچتے ہوئے اسے ہنسی آئی تھی، مگر ہنسی کا ارادہ موقوف کرتے۔ وہ پھر سے اسے سوچنے لگی تھی۔

\*\*\*

پکنک کا پروگرام اچانک ہی بننا تھا۔ رخ نے بچوں کے ساتھ اچانک دھواوا بولا تھا اور اب انہی کی طبیعت صاف گر رہی تھی۔

”عرصہ ہو گیا تمہاری شادی کو نہ تم خود باہر نکلتے ہو نہ اسے لے کر جاتے ہو نہ جانے کیسی عجیب طبیعت ہے تمہاری، باہر نکلو، گھومو پھرو، کسے کچھ دکھاؤ، کیا گھر میں بند رہے گی؟“

فریال کو فون کیا تھا، مگر وہ اپنی مصروفیت کی بدولت آنے سے قاصر تھی۔

”تم کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، تیار ہو جاؤ جلدی سے۔“ اس نے منت کو اس کے کمرے کی جانب دھکیل دیا۔ آج وہ کسی کی سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ حد سے زیادہ باتونی اور شرخ تھی۔

”امی، ابو آپ بھی چلیں۔ یہ دونوں ایسے ہی نکلیں گے ورنہ تو گھر میں ہی پڑے رہیں گے۔“ انہی بھی کچھ دیر کے لیے منظر سے غائب ہوا تھا۔

پری کی فراک کے بٹن بند کرتے اس نے طارق حسین اور حنا کو مخاطب کیا۔ طارق حسین نیو پیپر پڑھ رہے تھے اور حنا اون سے مظہر بن رہی تھیں۔

”تمہارے بہانے نکل رہے ہیں، وہ دونوں ہم بوڑھوں کو چھوڑو۔“

طارق حسین نے عینک کے اوپر سے جھانکتے اسے تکیہ کی تھی۔

”آج اگر تمہارے ہاتھ میں موبائل دیکھنا تو اسے دریائے فیض میں پھینک دوں گی، ایک بھی لمحہ سوچے بغیر۔“ بیو جینز اور گرے شرٹ میں بلیک کوٹ کے ساتھ اس کا موبائل اس کے ہاتھ میں دیکھ کر رخ نے اسے دھمکایا تھا۔

”ٹھیک ہے امی، ٹھیک ہے۔“ اس نے جلدی سے موبائل جیب میں ڈال لیا۔

”منت! آتم آگے بیٹھو۔“ پچھلا دروازہ کھولتے منت کے ہاتھ رک گئے۔ وہ گاڑی اشارت کیے اس کے بیٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

”ماموں! ہم آؤں کریم کھائیں گے اور جوس بھی



جیسے گے۔“ وائیم اپنی فرمائش نوٹ کر رہا تھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ سفید اور نیلے رنگ کا امتزاج لیے اسٹائلیش سوٹ میں وہ خاموشی سے رخ اور بچوں کو سن رہی تھی۔

”ہم صرف آؤں کریم کھانے اور ہائیڈ پارک میں پھرنے تک تمہارے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد ہم چلے جائیں گے، تم دونوں لندن میں کم ہو جانا۔“

بڑی رازداری سے انب کے کان کے پاس منہ لاکر اسے بتاتے وہ ان سے زیادہ پرجوش تھی۔

”تو پہلا پڑاؤ ہائیڈ پارک ہے۔“ انب بے اشت سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے گاڑی پارک کرنے تک وہ دونوں بچوں کے ساتھ آگے نکل چلی تھیں۔ نرم پتیلی دھوپ اور شفاف سڑکیں سب کچھ کتنا جھلا لگ رہا تھا۔

”جج ہے کہ سارے موسم دل کے موسم ہی سے نمو پاتے ہیں۔ فوارے سے نکلنے موتیوں کو ہاتھ پر سینٹے“ رخ کے ساتھ ساتھ چلتے باتیں کرتے بچوں کو تیلیوں کے پیچھے جھگٹے دیکھ کر اس کا دل ایک دم ہلکا جھلکا ہو گیا۔ نہ جانے ان خوب صورتیوں کو دیکھتے کتنا وقت گزر گیا تھا۔

”ہم یہاں سے واک کرتے گھر تک جائیں گے۔“ رخ بچوں کی انگلیاں پکڑے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کا گھر یہاں سے قریب تھا، اس لیے بے فکری تھی۔

”ہمارے ساتھ ہی رہو، شام میں میں خود چھوڑ جاؤں گا۔“ انب نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں تو اس ساری سیر کے دوران اس کی باتیں سنتے ہاں میں ہاں ملاتے رہے تھے۔

”بس ہمارا ساتھ میں تک تھا۔“ ڈرامائی انداز میں کہتے اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔

”دیرائے لعین پر جانا، گارڈز کی تبدیلی دیکھنا۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے واک کرنا۔“ وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ منت نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

”تنی شاعری کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب دیکھ

لیں گے۔“

انب نے اس کے مزید فری ہونے سے پہلے اللہ حافظ کہہ دیا تھا۔

رخ اور بچوں کے اترنے کے بعد گاڑی میں ایک دم خاموشی چھا چکی تھی۔ وہ دونوں کبھی کبھار ہی ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے تھے۔ اب بھی وہ سیدھا دیکھتے ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ اپنی انگلی میں پستی انگلی کو بلا وجہ تھما رہی تھی۔ اس کی انگلیوں کی حرکات اس کی بے چینی ظاہر کر رہی تھیں۔ گاڑی میں مردانہ پرفیوم، ایئر فریشر اور سکرٹ کی لمبی جلی خوشبو اس کے حواس پر سوار ہو کر گاڑی کی خاموشی کو مزید پراسرار بنا رہی تھی۔

”کہاں چلیں؟“

بات انب نے شروع کی تھی، اس کی انگلیاں اسٹیرنگ و ہیل پر مضبوطی سے جمی تھیں اور آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔

”جہاں دل چاہے لے چلیں، ویسے بھی آپ تو دوسروں کو مشوروں سے نوازتے ہیں۔“ اس کے ہونٹوں نے نامحسوس انداز میں جنبش کی تھی اور سر ”کہیں بھی“ کے انداز میں ہل گیا تھا۔

”یہ آکسفورڈ اسٹریٹ ہے، یورپ کی مصروف ترین شاپنگ اسٹریٹ۔“ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لوگوں کا جھوم ارد گرد چلتی گاڑیاں، سبز خلیں، لیکن اس کی نگاہیں تو اس جوڑے پر ٹھہر گئی تھیں جو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ٹھنڈوں پر بیٹھا وہ لڑکا جو اس خوب صورت لڑکی کو پروپوز کر رہا تھا۔ وہ دونوں بھی اس دائرے کا حصہ بن گئے جو دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ پرجوش ہوتے اس نے انب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاں وہ خوش تھی، بہت خوش۔ انب نے حیرت سے اپنے ہاتھ پر مضبوطی سے جے اس کے نازک ہاتھ کو دیکھا اور ایک نظر اس کے پرجوش چہرے کو دیکھا وہ دنیا و مافیہا سے بے گانہ لگ رہی تھی۔ لڑکی نے اس کا رو بول اس کا پھول پکڑ کر قبول کر لیا تھا۔ ہاتھ پکڑ کر چلتے گاڑی میں آکر بیٹھے وہ دونوں ہی جیسے بے خود تھے۔

دیرائے لعین پر وائفلن بجانے والے بوڑھے کے پاس رکتے پھولوں کا تاج سر پر سینٹے اس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے دیکھتے پہلی بار کم ہوا تھا۔ اس کی خوب صورتی سر پر جڑ کر پڑتی تھی اور انسان کو کسی قاتل نہیں رہنے دیتی تھی، وہ بھی نہیں رہا تھا۔ پلو شاہوں اور ملکاؤں کی اس سرزمین پر آنے والی شہزادی اس کی دھڑکنیں تک چرالے گئی تھی۔ سر پر جلتنگ بجانے والی باریش سے بچنے کے لیے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر دونوں نے خاموشی سے باریش کو دینا اسکرین پر گر کر دیکھا تھا۔ بغیر کچھ بولے وہ اس بحر میں گم تھے۔

بناجھم بیل میں ہونے والی گارڈز کی تبدیلی دیکھتے وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ وہیں اسے فیضان اپنی طرف آتا دیکھا، اس کے ساتھ چلتی نیم عریاں لڑکی۔ اس نے نگاہیں پھیر لیں۔ ساتھ کھڑے انب نے بھی اس کی نظروں کا تعاقب کرتے انہیں اپنی جانب آتے دیکھا تھا۔

”لیزا، تمہیں بہت شوق تھا نا اس لڑکی کو دیکھنے کا۔ یہ ہے میری وہ کزن جو شادی کے بعد بھی مجھ پر فدا ہے۔ دیکھی ہے تم نے ایسی محبت۔“ اس نے ساتھ کھڑی لیزا کو لو فرما کر انداز میں آنکھ ماری۔ لیزا اس کو اوپر سے نیچے تک گھور رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر انب کی جانب دیکھا۔

وہ خشمگین لگا ہوں سے انہیں گھور رہا تھا۔

”ویسے مجھے اس کے ساتھ تمہاری شادی کا بے حد افسوس ہے، بہت افسوس۔“ اس نے پیچ پیچ کرتے جیسے غم کی اتھاہ گراہیوں میں ڈوبنے کا اظہار کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر انب کی جانب دیکھا، وہ کچھ بولنا کیوں نہیں۔

”مگر پہلے پتا ہوتا کہ تمہاری شادی۔ اس سے ہو جاؤ گی تو کبھی واپس نہ آتا، خود ہی شادی کر لیتا تم سے۔“ اس نے جیسے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ سنجیدگی کے لہاوے میں لپٹی نفرت اہل اہل کر باہر آ رہی تھی

اور ہونٹ تسمخزانہ انداز میں ہنس رہے تھے۔

”کب تو اس ہند کو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ جانے کے قابل نہ رہو۔“ انب غر کیا۔

”واہ، تم تو بول بھی سکتے ہو اور وہ بھی رکے ب‘ ب‘ ب‘ بغیر۔“ لالی بجاتے وہ منہ کھول کر ہنسنے لگا۔

”چلو منت، اب میری ایک پریشانی تو دور ہو گئی۔ اب یہ بول لیتا ہے ایک جیلے میں۔“

ایک قدم آگے بڑھاتے وہ منت کے قریب ہوا، اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اس کے سر پر بچے پھولوں کے تاج کو چھونے کے لیے اس کا ہاتھ آگے بڑھا، مگر چھونے سے پہلے ہی اس کا ہاتھ آہنی ہاتھ کی گرفت میں تھا، جسے پوری قوت سے دباتے انب نے اپنا پورا غصہ اس پر نکال دیا تھا۔ آہنی گرفت میں اس کی انگلیاں چبکی تھیں۔

”یو ہا شڑ۔“ چھوڑو مجھے۔“ اپنی پوری قوت صرف کرنے کے باوجود وہ اپنا ہاتھ چھڑا نہیں سکا تھا۔

”اگر میں نے دوبارہ تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو اپنے یا اپنے گھر والوں کے قریب دیکھا تو۔۔۔“ لالی کے جیلے اس کے ہاتھ نے اس کی زبان میں ادا کیے تھے۔

مغلظات کا ایک طوفان اس کے منہ سے فوارے کی طرح پھوٹا تھا۔ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے دباتے وہ پتھر کھائے ہوئے کتے کی طرح بھونکتے ہوئے اس پر جھپٹا، مگر درمیان میں لیزا آگئی تھی۔

”فیضی، فیضی۔“ تبدیل ہونے والے گارڈز اور ہنسی آ رہے تھے۔ لیزا اسے چھینچ کے لے جانے لگی۔

انب کے ساتھ کھڑی تھر تھر کا پتتی منت نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔



علامہ خان

## پہلے کون

”ارے نہیں نہیں میری بیگم جاب نہیں کرتیں  
بھی، ٹوٹی ہاؤس وانف ہیں۔“  
جاوید لاؤج میں دوسری بار چائے، پیتے  
ہوئے، صوفے پہ نیم دراز دو شین سیدھے ہاتھ کی  
کھنی کے نیچے تو ایک کمر کی طرف — پاؤں  
صوفے کی کھنی پہ رکھے پرسکون انداز میں اپنے  
دوست سے موبائل پہ گفتگو میں مگھوٹا، جبکہ پاس ہی  
اتوار کے دن کا فرما سی ناشتہ یعنی حلوہ پوری وہ بھی

گھر کی بنی ہوئی کی مہک پھیلی ہوئی تھی، تو سامنے  
میز پہ اخبار کے تقریباً سارے صفحات اپنی قسمت پہ  
دور ہے تھے۔  
”ہاں، تم جب چاہو آ جاؤ یا، میری بیگم کے  
ہاتھ میں جادو ہے جادو، ایک بار کھاؤ گے تو یاد  
کرو گے۔“  
”اچھا، آج آؤ گے؟“  
”چلو آ جاؤ بس پھر۔“

”یار! مجھے لندن کے متعلق تمہارا تھمس نہیں  
سننا، تمہارا کوٹ چلا ہے۔“ کاش کہ وہ اپنی سوچ کو  
لفظوں کا روپ دے سکتی۔  
”گھڑی ابھی کتنی دور ہے۔“ اس سے پوچھتے  
ہوئے اس نے بازو اپنے گرد لپیٹ لیے۔ دانت اب بچ  
رہے تھے۔  
”میں بھی تھوڑی دیر لگے گی۔“ اسے جواب دے کر وہ  
اپنا کوٹ اتارنے لگا۔

”شاید خیال آ ہی گیا جناب کو۔“ اس کے ہاتھ سے  
کوٹ چھین کر پہننے اس نے ایک بار بھی تو کوٹ لینے  
سے منع نہیں کیا تھا۔ وہ اپنا موبائل بھی اس کے اندر  
سے نکال نہیں پایا تھا۔ اس کا تھقبہ بڑا جان دار تھا۔  
سٹیٹا کر رک کر وہ اس کو دیکھنے لگی۔  
”ہم ستر سکون زندگی نہ شخصیت کی محتاج ہوتی ہے،  
نہ شکل صورت کی اور نہ ہی دولت کی۔ ہاں ابھی  
انسان ہی زندگی کو بہتر اور پرسکون بناتے ہیں۔“ اس  
کے سامنے کھڑا اس کی آنکھوں میں جھانکنے والا شخص  
رشتوں کی اہمیت کو جانتا تھا۔ ان کی حفاظت کر سکتا تھا  
اور اس کے کردار کو اس نے ایک جھپٹے آئینے جیسا پایا  
تھا۔ اسے اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں تھی۔  
”چلیں۔“ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے اس نے کہا  
تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ گھر پہنچ کر اسے ماما پاپا  
کو فون کرنا تھا۔ اپنی بد تمیزیوں کی معافی مانگنا تھی اور  
اس شخص سے بہت کچھ کہنا تھا جو اس کے ساتھ بیٹھا  
خواہ مخواہ مسکرا رہا تھا۔  
اور مسکراتو وہ بھی رہی تھی۔

بعض باتیں اور چیزیں سامنے ہوتے ہوئے بھی  
ہماری نظروں سے اوچل رہتی ہیں، مگر اب سارے  
دھندلے منظر صاف تھے، راستہ واضح تھا، دینڈا اسکرین  
پر گرتی بوند بوند بارش دل کی دھرتی کو سیراب کر رہی  
تھی۔



”جو اس کر رہا تھا ایسا کچھ نہیں۔ اس کی خیانت۔“  
”مجھے معلوم ہے۔ کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں  
ہے۔“ اسے چلنے کا اشارہ کر کے وہ چلنے لگا۔  
”ساری عمریں باپ کے ساتھ میری بحث جاری  
رہی کہ انہوں نے اتنی آسانی سے اپنا حق کیسے چھوڑ  
دیا، کیسے قبضہ کرنے دیا، ہر چیز چھوڑتے ہوئے کھو کا دینے  
والوں کو کچھ نہیں کہا، مگر اس کا اور اک تو اب ہوا ہے  
کہ دھوکا قریب اور حرام لوٹ کر آپ کے پاس واپس  
آتا ہے۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بول رہا تھا۔ اور وہ پوری  
طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔

”المانٹ انکل نے قریب اور دھوکا دیتے اپنے  
محسنوں کو بھی نہ چھوڑا۔ کاروبار ہتھیالیا۔ ہم پاپی پاپی  
کے لیے ترستے رہے تو ان کے ساتھ کیا ہوا۔“ وہ غلط  
بھر کو ٹھہرا۔ اس کی طرف دیکھا اور پھر سے چلنے لگا۔

”ان کی اولاد حلال اور حرام کی تمیز بھول گئی۔ لقمہ  
نے انکل کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر کاروبار پر  
قبضہ جمایا اور اب وہ دونوں میاں بیوی محتاجوں جیسی  
زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور فیضان حلال رشتہ بنانے  
کے بجائے وہی تعلق حرام طریقے سے جاری رکھے۔  
لیزائے گلزاروں پہ پل رہا ہے، شراب، جوا، عورتیں،  
ایسی کون سی برائی ہے جس سے وہ بچا ہوا ہے۔“

اس بات کی توجہ خود گواہ تھی، وہ برائی کو برائی کہاں  
سمجھتا تھا۔ دھڑلے سے اعتراف کرتے اسے ذرا برابر  
بھی تو شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ  
چلتے اس کی خود گواہی سننے وہ اس قدر کم تھی کہ سردی کا  
احساس ہی نہ ہو سکا۔ مگر اب وہ کچھ بڑھ چکی تھی۔

”ساری ہیرو والی خصوصیات کے باوجود ابھی تک  
جھوٹے منہ بھی مجھے کوٹ آفر نہیں کیا۔“ اس نے  
گیلے ہوتے کوٹ کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھا تھا۔  
”مجھے سردی لگ رہی ہے۔“ منہ کے اتکا کھنے کے  
باوجود وہ کچھ بھی پین کر نہیں آئی تھی، نہ کوٹ، نہ  
سو پٹر۔

”لندن کی دھوپ اور بارش ایسی ہی ہوتی ہے۔“

”ہاں ہاں بھابھی اور بچوں کو بھی یاد سے لانا۔“  
 ”ارے بتانا تمہاری بھابھی کی کوئی خاص  
 مصروفیت نہیں ہے وہ کیوں برا مانیں گی؟ پورا دن گھر  
 پہنچ تو ہوتی ہیں۔“

”اب دیکھو تم اجنبیت برت رہے ہو یا! آخر میں تمہارا بچپن کا دوست ہوں، اتنا حق ہے میرا۔“

”بس بس زیادہ ہیر و پیر کی ضرورت نہیں اب۔“

”میں انتظار کر رہا ہوں، ایک اتوار تو ملتا ہے جو اپنا ہوتا ہے، اس دن کوئی اپنا مل جائے تو سونے پہ سہاگنہ ہو جائے۔“

”ہاں یہ کی نامات، ڈن ہوا پھر۔“  
”کچھ لانے کی ضرورت نہیں جگر۔ تیرا ہی گھر ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، اللہ حافظ“  
لاؤںج کے در و دیوار کے ساتھ ٹھن نے بھی یہ  
ایک طرف گفتگو چکن میں برتن دھوئے ہوئے بغور سی  
اور ایک چھکی سی مسکان لیوں پہ سج گئی۔  
”بے شک میں ایک ہاؤس وانف ہی تو ہوں،

ورنگ وومن نہیں، پورا دن صرف گھر ہی تو دیکھنا ہوتا ہے ساتھ تین بچوں کو اور سسرال میںکے کا آنا جانا بس اور کسی قسم کا کام نہیں کرنا پڑتا، واقعی میں خوش نصیب ہوں جو جاوید نے جاب نہیں کرنے دی لیکن ہوسکتا ہے اگر کرنے دیتے یا میں نہیں کام کرنی تو شاید ان ہی سب کاموں کے تیس پینتیس ہزار مل جاتے ساتھ ایک میڈل بھی ورنگ وومن کا، واقعی معاشرے میں، میرا مقام ایک باعزت عورت کا ہے، جو اپنے گھر میں سکھ سے میاں بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ تو کیا ہوا جو ایک تو ابھی اس کا اپنا نہیں۔

تو کیا ہوا جو ہفتے کے باقی دنوں کے بعد ایک اتوار کو بھی آرام میں نہیں اور نہ ہی اس ایک لفظ سے مستفید ہو سکتی ہوں کچھ چھٹی ہے،

چمن نے دوپہر کے لیے بریانی بنانے کے

”کیا بچوں والی باتیں کر رہی ہوں تم بھی شمن۔ یہ کوئی وقت ہے ایسی بحث کا یا تم کوئی نئی نئی بات یاد آئی ہو جو ہر نئے حاضرین لگتی ہے، ایک اتوار میں بھی حادثہ تو کوئی طوفان نہیں آجائے گا؟“

حد ہو گئی سالوں بعد کوئی دوست کے نام پر گھر آ رہا ہے، نیگم صاحبہ کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔ جاوید بیڑاڑتے ہوئے بانیگ کی چابی ڈھونڈنے میں مصروف سا ہوا۔

”تو آپ کو مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا کوئی پروگرام سیٹ کرتے ہوئے، آخر میں بھی ٹھکر کا حصہ ہوں، فرد ہوں اور وہ سوکا لفظ ’ہاؤس وانف‘ بھی ہوں۔“ من نے ایک دم چڑکے ریک سے بانیٹ کی چابی اٹھا کے جاوید کے سامنے پھینچتے ہوئے کہا۔ ”بیک بک کراؤتم سے جتنی مرضی، ایک اتوار کا دن ملتا ہے مجھے، اس میں بھی آدھا تم سے بحث میں نکل جاتا ہے۔“

”تو یہ آپ کو خیال کرنا چاہیے کہ“ ایک۔ اتوار کا دن ہوتا ہے آپ کے پاس اپنی فیملی کے لیے جس میں آدھا دن سو کے اور آدھا دن منت ساجت میں نکال دیتے ہیں آپ۔“

شمن نے بھی اچھی طرح پچھلے ہفتے کا غصہ باہر نکالتے ہوئے آئندہ کھانے کی کوشش کی۔  
 ”اچھا میڈم شمن، آپ فرمائیں کیا منع کروں فیصل کو؟ اور کیا بول کے منع کروں آج میری بیگم نے اپنے میکے جانا ہے تو ہمارے گھر کر فیو ہے، کوئی نہ آئے، بس شادی کو گیارہ سال ہی تو ہوئے ہیں۔  
 لیکن ہماری بیگم کا دل ابھی بھی اپنے میکے میں ہی ہے۔“

جاوید کا نہ صرف لہجہ خراب ہو چکا تھا بلکہ اب وہ عورتوں کی طرح طعنے دینا بھی شروع ہو چکا تھا۔

”آپ سے تو بات کرتا ہی ہے کارہونی جا رہی ہے، کبھی تو ہمیں مسئلے کا حل نکالا کریں بجائے طعنے دینے اور بات کا جنکڑ بنانے کے۔“ مین ہاؤس پستی کچن کی طرف چلی گئی اور حادید کے ماتھے کے ان

گنت بل بتا رہے تھے اس ہفتے بھی امی کی طرف جانا کھٹائی میں ہی پڑ گیا ہے۔

”ایک پستی کا دن ملتا ہے وہ بھی اس عورت کے چکر میں ضائع ہو جاتا ہے۔“ جاوید نے بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر جانے میں عافیت جانی۔

”فیصل مناسب نہیں لگتا تو ار کے دن کسی کے گھر لے چہ جانا، ایک بار پھر سوچ لیں آپ“ مہوش نے دبے دبے لہجے میں تیسری بار اپنی بات دہرائی۔

”ایک تو میں تمہاری بحث کی عادت سے بہت چڑھتا ہوں مہوش! جب بتا رہا ہوں، اتنے مان سے بلایا ہے اس نے تو اب کیا کہوں یہ کہ میری بیگم کیونکہ ایک ورلنگ وومن تھا تو ان کا خیال ہے جیسے وہ اتوار کو مکے جانا فرض سمجھتی ہیں اسی طرح تمہاری بیوی بھی سمجھتی ہوگی، تو ہم پھر کبھی مل لیں گے۔“

”تو غلط کیا ہے اس میں؟“ مہوش نے برامانتے ہوئے کہا اور کچن کی طرف رخ کیا۔

”ارے بابا، اس کی بیوی ہاؤس وانف ہے،

پورا دن گھر پہ ہی ہوتی ہے، ضروری ہے کہ اسے تنہا ہی طرح ایک اتوار ہی ملتا ہو، میکے جانے کے لیے۔“

”لیکن پھر بھی، گھر کے پچاس کام رکے ہوتے ہیں، میرے بھی اتنے کام پینڈنگ ہیں، آپ کو معلوم تو ہے، مہوش کی پوری کوشش تھی آج کا دن کہیں آنے جانے میں ضائع نہ ہو، بلکہ وہ آج نئے آنے والے مہمان کے لیے کچھ شاپنگ کرنے کے ساتھ، گھر کی ضروری صفائی بھی کر لے اور ملے انصاف شام میں آنے والے پورے ہفتے کے لیے مین چار ساکن بھی پناے کے فریز کر سکے۔ کیونکہ روز بیات بجے جب وہ فیصل کے ساتھ گھر واپس آئی تھی تو تیارہ کھانا پکانا اس کی ہمت سے آگے کی چیز ہو جاتی تھی، جب چھوٹا بھی ممکن نہیں تھا کہ فیصل کی خواہ سے مکان کا کرایہ ادا کرنے کے بعد صرف

ابن قتيبة

# UHU<sup>®</sup> Super glue

www.uhu.com  
facebook.com/uhuupakistan

”خیر میں گاڑی دھلوا کے لاتا ہوں۔ جب تک یہ چھوٹے چھوٹے کام نمٹنا لو اور تیار بھی ہو جاؤ۔“ فیصل نے بلند آواز میں گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے مہوش کوتاہی کی اور بڑبڑاتے ہوئے باہر کی راہ لی۔ ”اب یہ عورتوں کی طرح بیڈکی چادر میں نہیں ٹھک کر سکتا میں۔ ایک ہی چھٹی کا دن ملتا ہے وہ بھی بیگم کی چیخ کی نذر ہو جاتا ہے۔“ ☆

## مکمل ٹاول

تاجد نگاہ پھیلے کھیتوں پہ اتری دھند کو صبح کی نرم کرنوں نے عجیب اسرار بھرا حسن عطا کر رکھا تھا۔ پرندوں کی چکار، چکی کی گھول اور فضا میں گھلتی تازہ روٹیوں کی مہک زندگی کے بیدار ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

کچے آنکھوں میں عورتیں اپنے گھر والوں کے ناز خڑے اٹھارہ بیٹھیں اور بے چارے کنوارے کسی نازنین کے ہاتھوں کے نرم لچھے دار پرائیڈ اور محبتوں سے بلو کی گئی کسی کا ارمان دل میں بسائے، تند وروالی ماسی زیتون کے سخت کھر درے ہاتھوں کے موٹے موٹے پرائیڈ کھانے یہ مجبور

## مہوش افتخار





"اچھا بزرگو، میں چلا۔" صفائی ختم کر کے اس نے صحن سے ہی اندر بیٹھے خادم کو آواز لگائی اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں سے نکل کے اس کا رخ اپنے گھر کی طرف ہو گیا تھا، جو اس گاؤں کی آخری دو گلیوں میں موجود گھروں میں سے ایک تھا۔

گھر میں آ کر وضو کر کے اپنے دھیان میں اٹھ کے پلٹا تو اپنے پیچھے اپنی بیوی کو کھڑا دیکھ کے لکھ بھر کو ساکت رہ گیا۔

"ناشتہ بڑا واں؟" (ناشتہ بناؤں؟) اس نے

سپاٹ لہجے میں استفسار کیا تو اسے چند لمحے لگے اس بات کا یقین کرنے میں کہ اس کی بیوی نے کچھ نہیں دیکھا۔

"میں کی کچھ رٹی آں؟" (میں کیا پوچھ رہی ہوں؟) وہ ماتھے پہ پل لے لیا۔

"ہاں۔" وہ اپنی گھبراہٹ چھپاتا، تار پہ جھولتے تو لیے کی طرف بڑھ گیا۔ ہاتھ منہ خشک کرتے ہوئے اس نے دزدیدہ نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا جو چھپر تلے سے باورچی خانے میں، مٹی کے چولہے کے سامنے جا بیٹھی تھی۔ سکھ کا سانس لیتے ہوئے وہ بھی وہیں چلا آیا تھا۔

"کی گل اے اپنی چپ کیوں ایں؟" (کیا بات ہے۔ اتنی چپ کیوں ہو؟) اس کے مقابل چوکی سنبھالتے ہوئے، اس نے ایک گہری نظر اپنی بیوی کے چہرے پہ ڈالی جو خلاف معمول خاموشی سے اس کے لیے روٹی بنا رہی تھی۔

"تیوں کی تو جا کے کھے پاڑیں سراج وی تے ساڑے دی۔" (تمہیں کیا۔ تم جا کے مٹی ڈالو، اپنے سر میں بھی اور ہمارے بھی۔) روٹی پہ نظریں جمائے وہ سچ کے بولی تو وہ بے اختیار الجھ گیا۔

"اوکھ پتا دی تو چلے؟" (ہاں جیسے تجھے تو کچھ پتا ہی نہیں۔) اس نے

چمک کے ہاتھ میں پکڑا بیٹن چٹا۔ "آیا تھا تیرا ماما (ماموں)۔ دس گلاں کڈ کے (گالیاں نکال کر) گیا اے۔ تجھے دی اور مجھے دی۔"

"نا ماسے کو کیا تکلیف اٹھی ہے؟" اس نے تیوریاں چڑھائیں۔

"وہی جو سب کو ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تیری اس دیوانگی کا کیا علاج کروں۔ او جھہ کیا کم تھا ہمارے منہ پہ کالک تھوپے کے لیے جو تو اب روز ان مسلوں (مسلمانوں) کا کھڑا ہوئے (پوچھنے) پہنچ جاتا ہے؟ تیری کیوں مت (عقل) ماری گی اے

کبیرے؟" مارے بے بسی کے اس کی آواز جھنجھلا اٹھی تھی۔

سکبر سنگھ نے ایک خاموش نظر اس کے جھلائے ہوئے چہرے پہ ڈالی۔

"دیکھ بلوتے۔۔۔۔۔" (دیکھنے کی مجھے نہیں تھی لوڑ (ضرورت) ہے کبیرا یہ۔ یہ پیش دیکھ۔" اس نے اس کے پگڑی میں چھپے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پگ (پگڑی) یہ کڑا دیکھ۔" اس نے اس کی کلائی تھامی۔ "تو کیوں پل گیا ایں کہ تو کون ایں؟" (تم کیوں بھول گئے ہو کہ تم کون ہو؟)

"او میں کج نہیں پلا (نہیں بھولا)۔ گل صرف انی اے (بات صرف اتنی ہے) کہ مجھے شاہ صاحب کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ان کی خدمت کر کے سکون ملتا ہے۔ اور پھر وہاں کرو جی نے بھی تو کہا ہے تاکہ اچھی مت (عقل والی بات) جہاں سے بھی ملے سمیٹ لینی چاہیے۔ اب اس میں کون سی گناہ والی بات ہے؟"

"گناہ والی نہ سہی شرمندگی والی بات ضرور ہے۔ ہم سب بھی ان کی عزت کرتے ہیں لیکن تو نے تو حد نہ کا (ختم) دی ہے۔ سارا خاندان تھو تھو کر رہا ہے۔ گردوارے کی میزبیاں ویلے دے ویلے (وقت

کے وقت) چڑھنے والا روز سستی سویرے (صبح سویرے) دربار پہنچا ہو، تو لوگ تو کہیں گے نا کہ دچوں (درحقیقت) مسلمان ہو گیا ہے۔"

"ایویں کہیں گے۔۔۔ اور ایک بات بتا۔ میں مسلمان ہوں یا سکھ مروں، کسی کو کیا تکلیف ہے؟ یہ میرا اور میرے رب کا معاملہ ہے۔"

"جی نہیں۔ یہ میرا اور میرے اکو اک پتر (بیٹے) کا وہی معاملہ ہے۔ یہ ہماری نسل، ہمارے دھرم کا وہی معاملہ ہے۔" بلونت گورتیز ہوئی۔

"ہاں تو جا نبھا اپنا دھرم۔ لیکن میرے معاملے میں کسی کو بولنے کی لوڑ نہیں (ضرورت نہیں)۔"

"چنگا فیر (ٹھیک ہے بھر)۔ مگر میرے پتر کو دوبارہ اپنے ساتھ وہاں لے کے نہ جائیں۔" وہ تنک کے بولی تو کبیر کے چہرے پہ غصہ پھیل گیا۔

"وہ میرا پتر، میری نسل ہے۔ میں اسے جہاں چاہوں گا وہاں لے کے جاؤں گا۔ تو برداشت کر سکتی ہے تو کر۔ نہیں تو اپنے چاچے کے گھر چلی جا۔" آنکھیں نکالتا وہ ایک جھٹکے سے اس کے سامنے سے اٹھ گیا تو اس کے لہجے کی بیگانگی بلو کو ایک لمحے کے لیے ساکت کر گئی۔ کاش کہ ماں باپ کا مان بھر اس پر اس کے سر پہ قائم ہوتا تو وہ اپنی ذات اور اپنی بات میں جھوٹا وزن پیدا کرنے کو ہی یہ گھر چھوڑ جاتی۔

لیکن اب تو وہ تنکے سے بھی زیادہ ہلکی اور بے وقعت تھی۔ بھائی کوئی تھا نہیں۔ بس بہنیں ہی بہنیں تھیں۔ جو دور قریب اسی کی طرح اپنی اپنی زندگیوں میں کھپی بیٹھی تھیں۔

کم مائیگی کا احساس اس کی آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ پلو میں منہ دیے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

☆☆☆

"صف بی بی، چائے کے لیے یہ والا سیٹ ٹھیک رہے گا؟" ملازمہ ہاتھ میں آف وائٹ رنگ کا کپ

اٹھائے کچن میں مصروف صدف کے پاس آئی تھی۔ اس نے پل بھر کو نظر اٹھائی۔

"ہیچ! ارے نہیں فضلی۔ وہ جو شاہ بی بی نے نیا سیٹ منگوایا ہے نا، وہ نکالو۔" اس کی ہدایت پہ جہاں فضیلت سر ہلاتی وہاں پٹی بھی وہیں اندر آئی معصومہ شاہ کے کیوں پہ بڑی استہزائیہ مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔

"نیا نکالو یا پرانا، نتیجہ تو وہی نکلتا ہے۔" "اللہ نہ کرے بھر جانی۔" صدف نے ناگواری سے انھیں ٹوکا۔ معصومہ نے بغور دیورانی کا انداز

ملاحظہ کیا اور سلیب سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئیں۔

"جب انسان نے گل ہی ایسے کھلا رکھے ہوں تو اللہ کیا کرے میری بہن۔" وہ سینے پہ ہاتھ باندھے خطا اٹھاتے لہجے میں بولیں۔ تو صدف اس فضول گوئی پہ انھیں دیکھ کر رہ گئی۔

"استغفار۔" یہ آواز بلند کتنی وہ سامنے رکھی مرغی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تمہارے استغفار پڑھنے سے کیا فرق پڑتا ہے بی بی۔ دعا کرو خدا آنے والوں کی عقل پہ پردہ ڈال دے، تاکہ وہ اس گناہوں کی گھڑی کو ہمارے سروں پہ سے اتار لے جائیں۔۔۔ اس کی خاطر کیسا کڑوا کھوٹ پینا پڑا ہے اس کے بھائیوں کو، یہ وہی جانتے ہیں۔ یہ پہلی لڑکی ہوگی اس خاندان کی جس کے لیے باہر کے سیدوں میں رشید دیکھا جائے گا۔ کیونکہ خاندان میں تو اسے کوئی پوچھنے کو تیار نہیں۔" ان کی بات نے صدف کو سرتاپا سلگا کے رکھ دیا۔ لیکن بظاہر اس نے گل سے سر اٹھایا۔

"سوائے آپ کے بھائی کے، جو اس گناہوں کی گھڑی کو اپنے سر پہ لادنے کے لیے سالوں سے بے چین پھر رہے ہیں۔" صدف کے بیٹھے طنز پہ معصومہ گڑبڑا کے سیدھی ہو گئیں۔

"میرے بھائی کی منگ تھی زرناب۔ جسے چاہا جی نے اپنی ضد میں آکر توڑا۔ ارے یہ تو ہاشم کی شرافت اور نیکی کی انتہا ہے جو وہ اس لڑکی کے ایسے کرکوت کے باوجود اسے اپنے نام کی چادر پہنانا چاہتا ہے، صرف اس لیے کہ وہ ہمارا اس اونچے نام و مقام والے خاندان سے بدنامی کا یہ داغ نہیں دیکھ سکتا۔ مگر نہ جی۔ اس کی قربانی کی تو کوئی قدر ہی نہیں۔ باہر کی خاک چھانسنے پر اترا آتی ہیں یہ ماں بیٹیاں۔" انھوں نے تقریر سے سر جھٹکا۔

"تو کون کہہ رہا ہے انھیں اتنی بڑی قربانی دینے کو؟ ایک بیوی کو تو وہ خیر سے فارغ کر چکے ہیں۔ اب بچوں کا احساس کرتے ہوئے کوئی نیک شریف سی ماں لائیں۔" صدف کے استہزائیہ انداز پر معصومہ نے پہلو بدلا۔

"ویسے بھی ٹوٹی وہ چیز ہے بھر جائی جو کبھی جڑی ہو۔ تایابی نے تو زرناب کے لیے ہاشم بھائی کا رشتہ کبھی قبول ہی نہیں کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ تائی جی بھی اس رشتے کو جوڑنا نہیں چاہتیں، جسے ان کے مرحوم شوہر نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ زرناب کو بھلانا شاید ہاشم بھائی کے بس میں نہیں۔" اس نے آخر میں اپنا لہجہ قصداً نرم آمیز بنایا تو معصومہ کے سر پہ لگی اور پیروں پہ بھی۔

"ہونہہ! بڑی حور پری ہے نا تمھاری زرناب جو میرا شہزادوں جیسا دور اسے بھلا نہیں پایا۔ اٹھائیس سال کی ہو چکی ہے، وہ بھی اور تم بھی۔ ہم دو بچوں کی ماں ہو اور وہ اب تک در بدر خاک بسر۔ اور ان شاء اللہ اسی طرح رہے گی۔ تاوقتیکہ یہ لوگ ہاشم سے معافی نہیں مانگتے اور اپنی غلطی کا ازالہ نہیں کرتے۔" ان کا لہجہ اب مغرور ہو چلا تھا۔

"خدا سے ڈر کر بات کریں بھر جائی۔ آپ کی اپنی بھی ایک نہیں دو دو بیٹیاں ہیں۔" صدف کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

اپنی عزیز ازجان سہیلی جو اس کی تایا زادی نہیں بلکہ نندہ بھی تھی، اس کے لیے یوں منہ بھر کے بربادی کی بددعا نہیں سننا، اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"خبردار! جو میری بیٹیوں کا مقابلہ اس بے شرم۔۔۔"

"معصومہ! زبان سنجال کے بات کرو۔" یک لخت کچن میں بی بی نور بانو کی سخت آواز گونجی تو دونوں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں ان کی ساس کھڑی تھیں۔ لیکن مقابل بھی معصومہ شاہ تھیں، دو دھاری تلوار۔ مجال ہے جو اپنے الفاظ پہ ذرا سی بھی گھبراہٹ یا ندامت محسوس ہوئی ہو۔

"ہونہہ! ہم زبان تک سنجالیں اور آپ سے ایک بیٹی نہ سنجالیں گی۔ کیا کہنے بھی۔" وہ تیر چلائی، تنگنائی ہوئی ان کے پاس سے گزر کے باہر نکل گئیں تو صدف نے گھبرا کے اپنی تائی جی کی طرف دیکھا جن کا چہرہ اس وار پہ سفید پڑ گیا تھا۔

وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی تھی۔

"تائی جی۔ پلیز تائی جی۔" ان کی آنکھیں ہینکتی دیکھ کر اس نے سرعت سے انھیں خود سے لگایا تھا۔ اور وہ بے اختیار ہنسنے کے رو پڑی تھیں۔ صدف نے نچلا ہوا دانتوں تلے دبائے بہ مشکل تمام اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا تھا۔

"صبر تائی جی۔ صبر!" اس نے ان کی پشت سہلائی تھی۔

"ہور کتنا صبر کروں پتر۔ یہ آزمائش تو میری جان لے، لے گی۔" وہ کہتے ہوئے بولیں تو صدف نے ان کو زری سے خود سے ملچھو لیا۔

"اگر آپ نے ہمت ہار دی تو زری کی ڈھال کون بنے گا تائی جی؟" اس نے ان کے ہاتھ تھامے۔ "ہم سب کو، خاص کر زری کو ابھی آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ بس اللہ سے دعا کریں کہ وہ زرناب کا برا چاہنے والوں کو اس کی ایسی خوشیاں

دکھائے کہ وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں۔"

"آمین۔ شہد آمین۔" وہ دل کی گہرائیوں سے گویا ہوئی تھیں۔ "جاؤ جاؤ کے زرناب کو دیکھو، تیار ہوئی ہے یا نہیں۔"

"ابھی جاتی ہوں۔ آپ بھی کپڑے تبدیل کر لیں۔" وہ دھیرے سے مسکرائی تو بی بی نور بانو اک بوجھل سانس لیتی اپنے کمرے کی چل دیں۔

صدف سڑھیاں چڑھ کے اوپر زرناب کے کمرے میں چلی آئی۔

"زری کی بچی! تم ابھی تک فریش بھی نہیں ہوئیں۔" تیز قدموں سے چلتی اس نے آگے بڑھ کے بیڈ پہ نیم دراز زرناب پہ سے چادر کھینچی تو اس نے تیزی سے آنکھوں پر رکھا بازو دھرایا۔

"کیا تکلیف ہے تمھیں؟"

"یہی کہ فوراً سے پیشتر اٹھو اور ہاتھ روم جاؤ۔ آبی کا فون آیا ہے، وہ لوگ بس آدھے پونے ٹھٹھے میں بیٹھنے والے ہیں۔"

اپنی بہن، شفق کا حوالہ دیتے ہوئے، وہ زرناب کی الماری کی طرف پلٹی تو وہ آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی جھکی جھکی سی نگاہیں کھڑکی سے جھانکتے نیلے آسمان پہ جا ٹھہریں۔

"یہ والا کیسا رہے گا؟" چند لمحوں کی چھان پھانک کے بعد وہ سرخ اور سفید استرجاج کا ہلکی سی کڑھائی والا سوٹ لیے اس کی طرف مڑی تو زرناب کی بے تاثر نظریں صدف کے چہرے پہ آٹھ ٹھہریں۔

"کوئی فائدہ ہے اس سب کا؟" اس نے ساٹ لہجے میں سوال کیا تو صدف کا رنگ ایک پل کو ہیکا پڑ گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ خود کو سنبھالتی ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھی۔

"کیوں نہیں؟ تم کو دیکھ کر بھلا کون کا فرانکار کر سکتا ہے؟"

"مگر میرے بارے میں سن کر ضرور انکار کر سکتا

ہے۔" اس نے لحظہ بھر کو رک کر صدف کی آنکھوں میں دیکھا۔ "ہمیشہ کی طرح۔"

"ایسے مت کہو۔" صدف بے بسی سے اسے دیکھتی اس کے قریب آ بیٹھی۔ "اللہ نے چاہا تو اب کی بار ایسا کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ آبی کی بہت اچھی سہیلی کی نیکی ہے۔ اسلام آباد کی روشن خیال اور پڑھے لکھے سید لوگ ہیں۔ وہ نہ تو ہمارے کسی ملے والے کو جانتے ہیں اور نہ ہی انھیں کسی سنی سنی ثنائی فضول گوئی سے کوئی سروکار ہے۔"

"جب میرے اپنے خاندان والوں کو ان فضول باتوں سے سروکار ہو سکتا ہے تو غیروں کو کیوں نہیں؟"

"انھیں کچھ پتا چلے گا تب ناں۔"

اس کی بات پہ زرناب زہر خند سا مسکرائی۔ "بے فکر رہو۔ جنھوں نے ہر مرتبہ یہ کارنامہ انجام دیا ہے ناں۔ وہ اب کی بار بھی یہ کام احسن طریقے سے کر لیں گے۔"

"ہاں تو کرنے دو۔" صدف نے تیوریاں چڑھائیں۔ "بات اس بار آبی کے ہاتھ میں ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ اگر ایسی کوئی ذلت ہوئی بھی تو وہ سب سنبھال لیں گی۔ اللہ نے چاہا تو منہ ٹوٹ کر رہ جائے گا، معصومہ اور اس کے کہنے بھائی کا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے زرناب کا ہاتھ تھاما۔ "تم بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور دعا کرو کہ اگر اس رشتے میں تمھاری بھلائی ہے تو یہ کام ضرور ہو جائے۔ جانتی ہو بہت مشکل سے وہاں شفق نے سلمان بھائی کو اور یہاں تائی جی، شاہ بی بی اور امی نے مل کر قاتل کیا ہے بھائی اور صبور کو، ورنہ یہ لوگ خاندان سے باہر کے لیے کہاں ماننے والے تھے۔"

"کیا ضرورت تھی اتنے پاپڑیلنے کی۔ شاہ بی بی بھی تو ہیں ناں۔ ان کی طرح میری بھی زندگی کسی طور گزر رہی جائے گی۔" اس نے سر جھٹکا۔

193 2018

"شاہ بی بی کے پاس ماں باپ کے بعد پیرسید نظر حسین شاہ جیسا بھائی تھا۔ جنھوں نے ہر آن انھیں دنیا کے سرد گرم سے محفوظ رکھا۔ انھیں بوجھ بھگنے کی ایسے ویسے کے حوالے نہیں کیا۔ تمھارے پاس تاکی جی کے بعد یہ مان ہے؟" صدف نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو زرتاب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"وہ تو بس ایک ہی تھے۔ ان جیسا دوسرا بھلا کہاں سے لاؤں۔" اس نے سسکی لی۔ "لیکن میں اپنے دل کا کیا کروں صدف؟ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میری ہمت جواب دے جائے گی، میرے اندر اتنی ویرانی ہے کہ اب کسی کے ساتھ کی کوئی تمنا نہیں رہی۔ جبکہ دوسری طرف اماں جان کی پریشانی دیکھتی ہوں تو اپنا آپ ان کا مجرم لگنے لگتا ہے۔ تب دل کرتا ہے کہ خود کو ختم کرنے میں ایک لمحہ نہ لگاؤں۔" نڈھال سے انداز میں کہتے ہوئے اس نے اپنا سر بیڈ کی پشت سے ٹکا دیا تو صدف نے محبت سے اس کا ہاتھ سہلایا۔

"جب تک تم نئے خوابوں اور نئی خوشیوں کو اپنے اندر جگہ نہیں دو گی، یہ ویرانی کیسے تمھارا پیچھا چھوڑے گی۔"

"کیسے جگہ دوں؟ یہ احساس کہ کسی کی زندگی محض میری وجہ سے داؤ پر لگادی گئی، مجھے سکون سے جینے نہیں دیتا۔" اس کی آنکھیں یکا یک جھللا اٹھیں۔ "بارہ سال گزر گئے ہیں اس بات کو۔ لیکن مجھے آج بھی وہ دن نہیں بھولتا جب اس حویلی میں ایک قیامت برپا ہوئی تھی اور اس قیامت نے میری ذات کی دجیاں بکھیر دی تھیں۔ میرا وقار، میرے ماں جانے مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھین گئے۔ میں اپنے نقصان کو کس طرح فراموش کر دوں صدف؟" وہ گھٹنوں پہ پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی اور صدف اس کے دکھ میں ڈوبے وجود کو بے بسی سے تکی لب کاٹ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

گاؤں کی فضا میں آج خوب رونق تھی۔ اور اس خوشی کا مرکز سفید حویلی تھی۔ جس کے وسیع و عریض صحن اور باغ میں آج سارے گاؤں والوں کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گاؤں نور والاں (ایک خیالی نام ہے) اور اس سے ملحقہ علاقے کی جان سفید حویلی اور اس سے منسوب پیر نظر حسین شاہ کا گھر اندھا تھا۔ وہ گھرانہ جو اپنے دامن میں ہدایت اور نور کے بہت سے مستر حوالے لیے ہوئے

سفید عمامہ، سفید لباس اور سیاہ ڈاڑھی سے سجا سرخ و سفید چہرہ جس پہ اتنی حلاوت اور سکون تھا کہ دیکھنے والوں کی نظر بندھ سی جاتی تھی۔ بات کرتے تو ایک ایک لفظ اتنی نرمی اور تاثیر لیے ہوتا کہ سننے والوں کے دل میں اتر جاتا۔

آج سے تیس برس پہلے جب وہ محض بائیس سال کے تھے تب اپنے والد صاحب، پیرسید اسماعیل حسین شاہ، کی وفات کے بعد انھیں اپنے خاندان میں چلنے والی اس گدی کا سجادہ نشین مقرر کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان سے بڑے ایک بھائی اور تایا چچا کے بیٹے بھی موجود تھے۔

لیکن یہ ان کے گھرانے کی ایک اعلا روایت رہی تھی کہ انھوں نے ولایت سے جڑے اس منصب کو، جس کا تعلق درحقیقت صرف اور صرف "ہدایت" اور "قرب الہی" سے ہوتا ہے، بادشاہ وقت کا تخت نہیں بننے دیا تھا۔ اس گدی پہ ہمیشہ وہی بیٹھا تھا جو صرف حسب و نسب کی حد تک قابل احترام نہیں بلکہ علم و عمل میں بھی اپنی مثال آپ ہوا کرتا تھا۔ اور جس میں اپنے نیک اور برگزیدہ باپ دادا کے روحانی اوصاف کو، اپنی ذاتی ریاضت، عبادت اور اللہ سے اپنی منگلی کے بل پہ خود میں زندہ رکھنے کی لگن ہوئی تھی۔

پیرسید اسماعیل حسین شاہ کے بعد ان کے خاندان میں یہ ذہن، یہ لگن صرف سید نظر حسین شاہ

میں تھی۔ اسی لیے سب کی باہمی رضامندی سے انھیں اس منصب پہ فائز کر دیا گیا تھا۔ جس کے بعد تو وہ گویا خود پہ دہری ذمہ داری محسوس کرنے لگے تھے۔ کیونکہ ان کا ہر عمل اب ان کے چاہنے والوں کے لیے تقلید کا باعث تھا۔

وہ گاؤں کے ہر فرد کو، خواہ وہ بوڑھا تھا یا جوان اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔ یہی وجہ تھی کہ نور والاں کے دس کوس آگے اور دس کوس پیچھے ان کا نام نہایت عقیدت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے گاؤں میں مقیم چند غیر مسلم گھرانے بھی ان کی بے حد عزت کیا کرتے تھے۔

یہ ان کی بے پناہ شفقت اور اچھائی کا ہی اعجاز تھا جو کبیر سنگھ نامی سکھ نوجوان، ان کا کچھ ایسا گرویدہ ہوا تھا کہ ان کی جانب کھنچا چلا آنے لگا تھا۔ اس کی اس محبت کو شاہ صاحب نے بھی بہت خلوص سے قبول کیا تھا۔ وہ ان کے پاس ہوتا تو ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام اپنے ہاتھ سے انجام دینے کی کوشش کرتا اور وہ اسے ہرگز نہ ٹوکتے۔

وہ ان کا جمع کا خطبہ سننے کے لیے مسجد میں آ بیٹھتا اور وہ اسے کچھ نہ کہتے۔ یہاں تک کہ اس نے دربار (حویلی) سے متصل وہ جگہ جہاں شاہ صاحب بیٹھا کرتے تھے) کی صفائی بھی خود ہی اپنے ذمے لے لی تھی اور شاہ صاحب نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ان کے اس رویے کو دیکھتے ہوئے کسی میں بھی اتنی اہمیت نہ تھی کہ وہ کبیر سنگھ کو کچھ کہہ سکتا۔

آج کے اس خوشی کے موقع پہ بھی وہ ہر کام میں پیش پیش تھا۔ آج شاہ صاحب کے سب سے بڑے بیٹے، سید مختیار حسین شاہ، اور ان کے بیٹھے، سید حاذق رجب شاہ، کے انٹر میں کامیاب ہونے کی خوشی میں سارے گاؤں کو ظہرانے پہ مدعو کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں ان کے خاندان والے اور دوست احباب بھی شامل تھے۔ ہر طرف خوب

رونق تھی۔ ایسے میں کبیر سنگھ کا یوں دربار کے مصاحبین کے ساتھ ساتھ رہنا شاہ صاحب کے دور دراز سے آئے کئی مہمانوں کے لیے حد حیرانی کا باعث تھا۔ مگر انھیں کسی کی حیرت کی مطلق پرواہ نہ تھی۔

"کبیر! باہر جا کے کھانے کا نیا سلسلہ شروع کرواؤ۔" وہ کچھ دیر پیشتر آنے والے چند مہمانوں کو مشروب دے کے پلٹا تو شاہ صاحب اپنے مخصوص نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ان کے لہجے کی حلاوت آنے والوں کو حیران کر گئی۔

کبیر سنگھ اثبات میں سر ہلاتا باہر کی جانب بڑھ گیا تو شاہ صاحب کے شہر سے آنے والے ایک مرید کے لیے مزید خود پہ قابو پانا ممکن نہ رہا۔

"اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں شاہ صاحب؟" وہ مؤدب انداز میں بولا تو ان کے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لیکھی مشال

مخمسہ نگار عثمان

مکمل ناول کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے



ملک بھر کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

قیمت - 500 روپے

فون نمبر:

32735021

37/37 بازار، کراچی

چہرے پہ شفیق ساناثر پھیل گیا۔

"پوچھو عثمان۔"

"یہ آدمی تو سکھ لگتا ہے شاہ صاحب۔ پھر یہ یہاں آپ کے پاس۔۔۔۔۔" وہ جھجک کے خاموش ہو گیا تو پیر سید نظر حسین شاہ کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سکھ ہے تو کیا ہوا۔ محبت اور عقیدت کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے عثمان۔ اور دلوں کے سودے بڑے ہی عجیب ہوا کرتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شاہ صاحب لیکن آپ اتنی پاک صاف ہستی اور یہ طہارت و پاکیزگی کی ہر شرط سے بے بہرہ ایک غیر مسلم۔ معذرت کے ساتھ لیکن آپ کو اس سے جن نہیں آتی؟"

"جن؟ میں اس سے کیسے گھن کھا سکتا ہوں عثمان۔ ہم کیسے کیسے گناہوں میں تھڑکے اپنے بساند بھرے وجود لیے اللہ عزوجل کی پاک و معتبر ہستی کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس نے ہم سے کبھی گھن کھائی ہے؟" انھوں نے مسکرا کے انتہائی نرمی سے استفسار کیا تو اس کا سر میکا کی انداز میں لفی میں ہل گیا۔

"پھر بھلا میں اس کا ایک عاجز اور گنہگار بندہ ہو کے یہ متکبرانہ حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟" وہ دھیرے سے بولے تو سوال کرنے والے کی نگاہ بے اختیار جھک گئی۔ "تم سب تو مجھ سے اپنی محبت کے اظہار میں مکمل طور پہ آزاد و خود مختار ہو۔ مگر یہ شخص جب

جب اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے یہاں آتا ہو گا اسے یقیناً بہت سی باتیں سنی پڑتی ہوں گی۔ اپنے لوگوں کی خطائی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہوگا۔ لیکن پھر بھی اس کے قدم پیچھے نہیں ہٹتے۔ کیوں؟ کیا مل جاتا ہے اسے یہاں سے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ پھر میں کیسے اس کے اس درجہ غلوں اور بے لوث محبت کی قدر نہ کروں؟ کیسے اس بات کو بنیاد بنا کے اسے جھڑک

دوں، اس کا دل تو زردوں کہ وہ ایک غیر مسلم ہے۔ مجھ سے تو اپنی پاکیزگی کا ایسا زعم نہیں دکھایا جائے گا۔" دھیرے سے کہتے وہ خاموش ہوئے تو اس شخص کا ہاتھ ان کے گھٹنوں پہ آٹھرا۔

"آپ نے تو مجھے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا شاہ صاحب۔" وہ شرمندہ سا گویا ہوا تو پیر سید نظر حسین شاہ کا ہاتھ اس کے شانے پہ آٹھرا۔

"میری ایک بات یاد رکھنا عثمان، تمہارا اپنی زبان سے کروایا گیا تعارف تو لوگوں کو بھول سکتا ہے لیکن تمہارا وہ تعارف جو تمہارا کوئی نیک عمل کسی سے کرواتے گا، وہ مقابل کو کبھی نہیں بھولے گا۔ لہذا اپنے صاحب ایمان ہونے کو اپنے اچھے عمل سے ثابت کرو۔ کسی کو کمتر گردان کے نہیں۔" وہ شفقت سے گویا ہوئے تو سننے والے کا دل جیسے پانی بن کر بہنے لگا۔

"پھر بھی تمہاری تسلی کے لیے میں یہ ضرور بتانا چاہوں گا کہ کبیر ایک نہایت حساس انسان ہے۔ وہ یہاں کے آداب سے بہ خوبی واقف ہے۔ اس لیے وہ بنا غسل کے بھی یہاں قدم نہیں رکھتا۔" ان کی آخری بات پہ اس کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا تھا۔ جسے شاہ صاحب نے قصداً نظر انداز کر دیا تھا۔

"لو اب اپنا منہ میٹھا کرو۔" انھوں نے مسکرا کر اس کا دھیان بنایا تو وہ اپنے سامنے رکھے شربت کی طرف متوجہ ہو گیا جو کبیر سنگھ اسے پیش کر کے گیا تھا اور جسے پینے میں اسے اب کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

ملک کے مابہ ناز سیاست دان کے نجی فارم یاؤس میں رنگ و نور کی بڑی خوبصورت سی محفل بھی تھی۔ جس میں ان کی پارٹی کے سب ہی اہم اراکین شامل تھے۔ اس دعوت کا اہتمام خاص طور پہ سید بختیار حسین شاہ کے اعزاز میں کیا گیا تھا، جنھوں نے

حکومت وقت کی پارٹی میں شامل ہونے کے بجائے ان کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے نہ صرف اپنے سیاسی کیریئر کا باقاعدہ آغاز کیا تھا بلکہ ان کی پارٹی کو بھی پنجاب کے ایک اہم حلقے کی طرف سے مستحکم بنا دیا تھا۔

"ان سے ملیں شاہ جی۔" پارٹی لیڈر خود بختیار شاہ اور ان کے چھوٹے بھائی سید صبور حسین شاہ کو لے کر اپنے اہم مہمانوں سے ملوارے تھے۔

"یہ ہیں ہمارے بہت بڑے کرم فرما جسٹس نصیر احمد۔" لفظ کرم فرمانے بختیار شاہ بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔ بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے جج صاحب کا مصافحے کے لیے بڑھایا گیا ہاتھ تھام لیا تھا۔ جو دوسرے ہاتھ میں تھامے گلاس کے باعث اس وقت خاصی ترنگ میں تھے۔

"بڑے عرصے سے خبریں گرم تھیں آپ کے حوالے سے شاہ صاحب۔ اچھا ہوا جو آپ نے چندوں کا وہ ٹولا جو ان نہیں کیا۔" انھوں نے بے تکلفی سے آنکھ دبا کر بختیار شاہ قبچہہ لگا کے ہنس پڑے۔

"ڈوبتے جہاز میں بھلا کون سوار ہونا چاہے گا نصیر۔" پارٹی لیڈر نے ہنستے ہوئے جج صاحب کا شانہ تھپتھپایا تو ان کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"جس ٹھوڑا سا انتظار اور، پھر ہمارا وقت شروع ہوگا۔ عیش ہی عیش۔ مویں ہی مویں۔" وہ بے ربط سی ہنسی ہنسے تو صبور شاہ نے حفا اٹھاتی نظروں سے انھیں دیکھتے ہوئے اپنے گلاس سے چسکی لی۔ اور معذرت کرتا اپنے کزن کی طرف چلا آیا۔

"انسان کو اپنی عمر دیکھ کر چڑھانی چاہیے۔" متخرا نہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جسٹس نصیر کی طرف اشارہ کیا تو سب ہی قبچہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"جس حساب سے تو پینے لگا ہے ناں، تیرا بھی اس عمر میں یہی حال ہونے والا ہے۔" اس کے ماموں زاد فر شاہ نے ہنستے ہوئے اس پہ چوٹ کی تو سب کا قبچہہ ایک بار پھر گونج اٹھا۔

"بھابی سے سبق سیکھ۔ کبھی لگایا ہے انھوں نے کسی ایسی ویسی چیز کو منہ؟" اس نے صبور شاہ کا شانہ تھپتھپایا۔

"سب کے اپنے اپنے نشے ہیں لالے۔ مجھے اگر پینے کا شوق ہے تو انھیں طاقت کا نشہ ہے۔ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید طاقتور بنا چاہتے ہیں۔ دیکھ نہیں رہے، آج کیسا سرور بھرا ہے ان کی آنکھوں میں۔" اس نے مسکرا کر بھابی کی طرف دیکھا تو خاموش کھڑے ہاشم شاہ کی کینہ تو نظریں دور کھڑے بھونکی پہ جاٹھریں۔

پیر سید نظر حسین شاہ کی اولاد کس قدر مطمئن اور خوش تھی۔ ان کی آرزوئیں اور خواہشیں وقت کس طرح ایک ایک کر کے پوری کر رہا تھا۔ اور ایک وہ تھا جس کے دل کی ناشادگی کا کسی کو احساس ہی نہیں تھا۔ سلگتے ہوئے اس نے ایک تھکھونٹ اپنے اندر اتارا تھا۔

"ارے ہاں یاد آیا۔" فخر نے صبور شاہ کی طرف دیکھا۔ "ساہیوال والی اس زرعی زمین کا کیا بنا؟" "ہار دی ہے محترم نے۔" ہاشم نے نگاہوں کا زاویہ بدلتے ہوئے استہزاء سے انداز میں لقمہ دیا تو فخر کے ساتھ ساتھ باقی سب کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیا؟ یہ کب ہوا صبور؟" خود پہ سب کی نظریں پاکے صبور شاہ شرمندہ ہو گیا۔

"اوہ یار۔ بس بازی لگ گئی تھی۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگایا۔ اس کی سبکی ہاشم کے اندر خندک سی اتار گئی۔

"کتنی عجیب بات ہے ناں، چاچا جی کو جو کیڑے کبھی مجھ میں نظر آیا کرتے تھے، آج وہ سب

کے سب ان کے اپنے لاڈلے میں بھی پڑ چکے ہیں۔۔۔۔۔ او بھائی، کچھ تو اپنے باپ کی لاج رکھ لے۔ "طنز کے تیر چلاتے ہوئے اس نے آخر میں قصداً اپنے لہجے کو دردستانہ بنایا تو فخر خٹساف سے صبور کو دیکھنے لگا، جس نے اتنی قیمتی زمین محض چند گھنٹوں میں گنوا دی تھی۔

"اچھا اب زیادہ ڈرامے نہ کر۔" اس کی نظروں سے جھینپ کر صبور شاہ نے ایک دھبہ نخر کو رسید کی تو وہ گہری سانس لیتا ہوا نظروں کا زاویہ بدل گیا۔

مناسب رشتہ نہ ملنے پر، ان کے باپ کی دہلیز یہی بوڑھا کر دیا تھا۔ جس کا شاہ صاحب کو بے حد قلق تھا۔ وہ اس بے چارے پندے کے شروع سے ہی خلاف تھے۔ جس کا شرعاً کہیں کوئی حوالہ نہیں ملتا تھا۔

کے دو سال بعد ان کی اکلوتی بیٹی زرناب کی پیدائش ہوئی تھی جو اس وقت آٹھ برس کی تھی۔



مخالفت کی ہمت صرف ان کے بڑے بھائی سید رجب حسین شاہ میں تھی۔ جنہوں نے نہ صرف اپنی ناگواری کا گرج برس کے اظہار کیا تھا بلکہ اپنی اکلوتی بیٹی، معصومہ، کو بھی اس سب کا حصہ بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"اوہو۔ یہ تو اچھی بات نہیں۔ میری بیٹی کی پڑھائی کیسی جارہی ہے؟" انہوں نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

"بہت اچھی۔ پتا ہے کل مس نے ٹیٹ لیا تھا اور میرے ٹیٹ میں سے ٹیٹ آئے ہیں۔" اس نے فخریہ انداز میں بتایا تو شاہ صاحب نے اس کا گال چوم لیا۔

"شاباش۔ بس ایسا ہی اچھا اچھا پڑھتا ہے آپ نے۔" وہ اس کی مزید گٹ پٹ سننے میں لگن تھے جب برآمدے کا دروازہ کھول کے شاہ بی بی باہر آئی تھیں۔ زرناب کو باپ کی گود میں بیٹھا دیکھ کے وہ مسکراتی ہوئی ان دونوں کے پاس چلی آئی تھیں۔ بڑی بہن کو اتار دیکھ کے شاہ صاحب ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم آپا۔" انہوں نے پیار سے اپنے بھائی کا شانہ تھپتھپایا تھا۔ "کتنی بار کہا ہے نظرا میرے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔ تمہارا مرتبہ بدل چکا ہے۔"

"میرا اصل مرتبہ اپنی ماں بہنوں کی عزت میں ہے۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئے تو شاہ بی بی کی آنکھوں

میں ان کے لیے محبت کا سمندر ٹھٹھکیں مارنے لگا۔ ان کی بیبی بائیں تو انہیں اس خاندان کے دیگر مردوں کی مختلف بنائی تھیں۔ شاہ صاحب کی ذات اس گھرانے کے لیے سچ معنوں میں رب تعالیٰ کی خاص رحمت تھی۔

"سلامت رہو۔ اللہ کبھی کوئی غم نہ دکھائے

میرے ویر (بھائی) کو۔" وہ پاس رکھی کرسی پر بیٹھیں تو شاہ صاحب بھی دوبارہ بیٹھ گئے۔ زرناب ان کی گود سے اتر کر اندر بھاگ گئی تھی۔

"پرسوں رجب آیا تھا میرے پاس۔ وہ چاہتا ہے کہ اب معصومہ اور بختیار کی شادی کر دی جائے۔" ان کی بات پر شاہ صاحب نے گہری سانس لی۔

"میرے خیال میں اگر دو سال ٹھہر جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اصل میں، میں چاہتا ہوں کہ بختیار کا کسی انجینیئرنگ کالج میں داخلہ ہو جائے۔ اس عرصے میں وہ اپنی ذمہ داریوں کو بھی سمجھنے کے قابل ہو جائے گا۔"

"سو تو یہ لیکن تم جانتے ہو کہ اس کا پڑھائی کی طرف بالکل رجحان نہیں۔ رہی ذمہ داریاں تو وہ جب تک اس پہ ڈالی نہیں جائیں گی، اس کے مزاج کی لاپرواہی نہیں جانے والی۔ اس لیے بہتر ہوگا اگر تم اس کا گھر بسا دو اور اسے زمین داری کی طرف لے آؤ۔" وہ رساں سے گویا ہوئیں تو سید نظر حسین شاہ خاموش ہو گئے۔

شاہ بی بی کی بات اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ لیکن وہ اس ملال کا کیا کرتے جو ان کے اندر اپنے بیٹے کے مستقبل کو لے کر اٹھنے لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اسے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے انسان کے روپ میں دیکھنے سے خواہش مند تھے۔ مگر بختیار حسین نے نہ صرف انہیں تعلیمی میدان میں مایوس کیا تھا بلکہ مزاج و اطوار میں بھی وہ ان کے بالکل برعکس تھا۔

"میں ایک بار اس سے بات کر لوں۔ پھر آگے اس کا نصیب۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولے تو ان کے چہرے کی افسردگی شاہ بی بی کا دل دکھ سے بھر گئی۔ انہیں سمجھنے کے حوالے سے اپنے بھائی کی آرزوؤں کا یہ خوبی تھا۔ لیکن اسے چراغ تلے اندھیرا کہا جاتا یا پھر سید بختیار حسین کی بد

نصیبی کہ وہ اتنے مثالی باپ کا فرزند ہو کے بھی ان کی خوبیوں سے فیض یاب ہونے سے محروم رہا تھا۔

"اللہ یہ پھر وسرہ رکھو نظر۔ اس نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے تسلی آمیز انداز میں ان کا ہاتھ تھپتھپایا تو شاہ صاحب دھیرے سے مسکرا دیے۔

"کیوں نہیں آپا۔ وہی تو ہمارا والی وارث ہے۔"

"بے شک۔" شاہ بی بی کے منہ سے بے اختیار تانہ نکل گیا تھا۔

"آئیں چل کے ناشتہ کرتے ہیں۔" اپنے مخصوص پرسکون انداز میں کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو شاہ بی بی بھی دھیمی سی مسکراہٹ لیے ان کے ساتھ چل پڑیں۔

☆☆☆

آسمان بھی اگر معصومہ شاہ کے سر پہ آگرتا تو شاید انہیں اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی کر لڑکے والوں کے مثبت جواب سے ہوئی تھی۔ شوق کی سیلی کی ٹیلی کو نہ صرف زرناب بے حد پسند آئی تھی بلکہ انہوں نے دو دن بعد ہی ان سب کو اسلام آباد اپنے گھر بھی مدعو کیا تھا۔ ان کے پیغام نے حویلی میں خوشی کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ بی بی نور بانو کا تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہا تھا۔ انہیں یہ پڑھے لکھے اور نفیس طبع لوگ پہلی ملاقات میں ہی اپنی بیٹی کے لیے بہت اچھے لگے تھے۔

شاہ بی بی، صدف اور بی بی حور (شفیقہ اور

صدف کی والدہ) کی خوشی کا بھی اپنا ہی ایک عالم تھا۔ صرف ایک زرناب حسین شاہ تھی جس کے اندر اس خبر نے کوئی اپجیل نہیں مچائی تھی۔ وہ خالی آنکھوں اور پھٹکی سی مسکراہٹ سے ان سب کی خوشی دیکھتی رہی جو اسے بے حد عزیز تھے۔ بختیار شاہ اور صبور شاہ کا رد عمل بھی ایک

عجیب سی ٹھنڈک لیے ہوئے تھا۔ انہیں اس بات کا تمام زیادہ تھا کہ وہ خاندان سے باہر بیٹی دے کر سب کی باتوں کا نشانہ بننے والے تھے۔ اور اس احساس کو معصومہ کے کیلئے حملے مزید ہوا دے رہے تھے جو پچھلے دو دن سے جلے پیر کی بی بی کی گھوم رہی تھیں۔

زرناب حسین شاہ کو اپنے تمام تر غرور سمیت اپنے بھائی کے قدموں میں گرے دیکھنا ان کی خواہش سے بڑھ کر ان کی ضد تھی تب ہی تو وہ آج تک ہر ممکن طریقے سے اس کے لیے آنے والے رشتوں میں روڑے لگاتی رہی تھیں۔ مگر اس بار ان کا داؤ چلانا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ لوگ نہ تو ان کے خاندان کے تھے اور نہ اس علاقے کے اور نہ ہی ان کی جان پہچان کے جو وہ ماضی کی کسی بات کا تجسس پھیلا کے کوئی رخنہ ڈال سکتیں۔ تب ہی تو اس رشتے کا انجام بخیر ہوا تھا۔

"میں سوچ رہی تھی خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگے گا۔ آخر کو وہ ہماری شوق کی سیلی بھی تو ہے۔" بی بی نور بانو نے اپنی نند اور دیورانی کی طرف دیکھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم شوق سے کہہ کر اسلام آباد سے اچھا سا ٹک اور پھول لے لیں گے۔" صدف خوشی سے چمکی۔ شوق اپنے شوہر سنان کی جاب کی وجہ سے اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ "لے آئے ایک تے مچھل کی ہوئے (لو یہ ایک اور پھول کیا ہوئے)۔ بندہ اپنے بانوں کے پھلوں کے ٹوکے لے کے جائے۔"

ان کی بات پر صدف نے پشیمانی پہ ہاتھ مارا۔

"نہیں تائی جی! پھلوں کا آج کل کوئی فیشن نہیں۔"

"لو دوسو۔ ہن بھلاں دے وی فیشن ہون لگے نے۔" (لو بتاؤ۔ اب پھلوں کے بھی فیشن ہونے لگے ہیں)۔ وہ ہنستے ہوئے شاہ بی بی اور بی بی حور (شفیقہ) کی طرف پلٹیں تو وہ دونوں بھی ہنس پڑیں۔

"اور یہ ہم کہاں سے آگیا بیٹا جی؟" شاہ بی بی ہنستے ہوئے صدف سے مخاطب ہوئیں۔ "صرف ہم تینوں اور شوق جانے گی۔"

"کوئی نہیں۔" وہ بدکی۔ "میرا جانا از حد ضروری ہے۔ زرناب کی پسند ناپسند صرف مجھے پتا ہے۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر اتر آئی۔

"اللہ نے چاہا تو بہترین جوڑ ہوگا۔" شاہ بی بی نے بے ساختہ دعا کی تو سیرھیاں اتر کر نیچے آئی معصومہ کے لبوں پہ استہزائے مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اور اگر بہترین تو کیا؟" بہتر بھی نہ نکلا۔۔۔ تو؟ "ان کی آواز پہ سب ہی نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔ معصومہ نے شانوں کو خفیف سی جنبش دی۔ "اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ آخر کو وہ غیر ہیں۔ اب ہمیں کیا معلوم کتنا بچ بول رہے ہیں اور کتنا جھوٹ۔" وہ مسکرائی ہوئی صوفی پہ آ بیٹھیں تو شاہ بی بی نے ایک تلخ نظر جھنجھکی کے چہرے پہ ڈالی۔

"تو بھتیجا اور صورت کس لیے ہیں۔ وہ پتا کروائیں گے ناں۔" شاہ بی بی نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

"ہونہہ! اسے کہتے ہیں گھر کی نعمت چھوڑ کے غیروں کی جوتیاں سیدھی کرنا۔ خیر ہمیں کیا۔ آپ لوگوں کے نصیب میں ہی شاید خواری ہے۔۔۔ کون کون جا رہا ہے؟" انھوں نے بھڑاس نکال کے اچانک موضوع بدلا تو صدف کا دل چاہا کہ پاس پڑا گل دان اس عورت کے سر پہ دے مارے۔

"ہم تینوں اور شوق۔" شاہ بی بی نے قصداً صدف کا نام لینے سے گریز کیا۔

"کیوں؟ میری ماں آپ لوگوں کی کچھ نہیں لگتی؟" معصومہ نے ماتھے پہ بل ڈالے استفسار کیا۔ شاہ بی بی نے ایک نظری بی بی نور بانو کی طرف دیکھا۔ اور پھر گل سے گویا ہوئیں۔

"جب تک بات طے نہیں ہو جاتی، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ معاملہ گھر والوں تک محدود رہے تو بہتر ہوگا۔"

"یعنی مرحوم سید جب حسین شاہ کے بیوی بچے اب آپ لوگوں کے لیے باہر والے ہو گئے ہیں۔ واہ! کیا کہنے ہیں آپ کے شاہ بی بی۔" معصومہ جلیبلا کے سیدھی ہوئیں۔ ان کا انداز کوثر شاہ کا چہرہ سرخ کر گیا۔ وہ بہت دیر سے ان کی فضول گوئی برداشت کر رہی تھیں۔

"یہ دن تم لوگوں نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے خود دیکھا ہے۔ ہمیں الزام دینے کے بجائے بہتر ہوگا اگر تم سب اپنی بدینیں صاف کرلو۔"

"یعنی ہم بدینت لوگ ہیں؟" معصومہ نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے دو بد سوال کیا۔

"بالکل ہو۔" شاہ بی بی، مطلق پرواہ کیے بنا پرسکون انداز میں گویا ہوئیں تو صدف کا دل اندر تک ٹھنڈا ہو گیا۔ لبوں پہ جھپٹتی مسکراہٹ دہاتے ہوئے اس نے معصومہ شاہ کی طرف دیکھا جو اس کرارے جواب پر غصے سے چہرے کو دیکھنے کی تھیں۔ جلیبلا تے ہوئے انھوں نے کچھ کہنے کے لیے لب داکے ہی تھے کہ شاہ بی بی کی تنبیہ نے ان کی زبان نالو سے لگا دی۔

"اس سے پہلے کہ میں آج اگلے پچھلے سارے حساب برابر کر دوں اپنے کمرے میں جاؤ! اور معصومہ اس کھلی بے عزتی پہ سرخ چہرہ لیے، دھم دھم کرتی اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی اور گھر کی تینوں خواتین، مع بنی سنوری، ہنستی مسکراتی صدف کے، ذرا نیور کے ہمراہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی تھیں۔

"یہ من مانی آپ لوگوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔" کھڑکی میں کھڑی معصومہ شاہ نے غصہ سے گیٹ سے باہر نکلتی گاڑی کو دیکھا۔ اور پھر پلٹ کر چادر لپیٹتی ہوئی نیچے چلی آئی تھیں۔

"حق نواز گندی کڈ۔" (حق نواز گاڑی نکالو۔) ان کی غصیلی پکار پہ جہاں چوکیدار کے ساتھ مصروف ملازم لوکھا کر ان کی طرف بھاگا تھا وہیں اپنے کمرے میں گم سم سی بیٹھی زرناب بھی چونک اٹھی تھی۔

آج دوپہر میں جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ صدف کے ذریعے اس کے علم میں آچکا تھا۔ تیز قدموں سے کھڑکی کی طرف آتے ہوئے اس نے باہر دیکھا تھا جہاں معصومہ شاہ بے چینی سے ٹپکتے ہوئے موبائل پہ کوئی نمبر ملتا رہی تھیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی میں سوار ہوئی تھیں اور حویلی کا بڑا سا گیٹ پار کر گئی تھی۔

ان کے منظر سے بیٹے ہی زرناب نے ایک بوجھل سانس لیتے ہوئے اپنا سر کھڑکی سے نکال دیا تھا۔ وہ بنا بتائے بھی ان کی منزل کا پتا خوب جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

دس سالہ اجیت سنگھ نے نوالہ چباتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اسکول سے لوٹا تھا۔

"بے بے۔"

"ہاں" بلونے ہاتھ میں دبے کرتے پہ سے نظریں ہٹائے بنا جواب دیا۔ وہ بے ساسی کے تہوار کے لیے اپنے لاڈلے کے کرتے پہ کڑھائی کا شوق پورا کر رہی تھی۔

"میں روٹی کھا کے حویلی کھینے چلا جاؤں؟"

"میں لٹاں توڑ دیڑیاں نہ!" (میں نے ٹانگیں توڑ دینی ہیں) سر اٹھاتے ہوئے اس نے بیٹے کو گھورا تھا۔

"بے بے" اجیت ٹھنکا۔ "تو نے کل بھی مجھے نہیں جانے دیا۔ صورت شاہ دودن بعد واپس شہر جانے والا ہے۔"

"بوت (بہت) اچھی گل (بات) اے۔ جان چھٹے گی ساڑی (ہماری)۔" بے زاری سے سر جھٹکتی وہ کرتے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ "تیرا پیو کی کھٹ اے سوا پانز نوں۔" (تمہارا باپ کیا کم ہے ہمیں بے عزت کروانے کو۔) ماں کی ڈانٹ پہ اجیت نے منہ بسورتے ہوئے سامنے رگی ٹرے دھکیل دی۔

"جا۔ نہیں کھانا روٹی۔" مگر بلونے سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اپنی دھمکی بے اثر جانی دیکھ کے اجیت نے سرے سے ٹھنکنے لگا تھا۔

"بے بے" اچھے کیا ہو گیا ہے۔ تو اب کیوں مجھے حویلی نہیں جانے دیتی؟ صورت شاہ روز مجھے بلاتا ہے۔ "باپ کے ساتھ حویلی جاتے رہنے کی وجہ سے اس کی اور شاہ صاحب کے چھوٹے بیٹے صورت کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ جس میں پھر رفتہ رفتہ اجیت کے باقی دوست بھی شامل ہو گئے تھے۔

اب سارے بچے مل کر کھلا کرتے تھے۔ "اجیت مجھے تنگ نہ کر۔" بلونے ٹانگا اٹھاتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

"بے بے میرے سارے دوست مجھے بلا رہے ہیں۔" وہ ماں کے قریب کھسک آیا۔ "اچھا آج جانے دے۔ فیر نہیں (پھر نہیں) جاؤں گا۔" وہ التجائیہ انداز میں بولا تو بلونے تنک کے نظریں اٹھائیں اور اس کے معصوم چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی اس کا دل پتچ گیا۔

"اچھا چلا جائیں۔ لیکن پہلے روٹی ختم کر۔"

"کر لی۔" وہ خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اجیت!" لیکن وہ ماں کی پکار ان سنی کیے باہر بھاگ گیا تھا۔

گھر سے نکل کے اس کا رخ حویلی کی طرف تھا جس کی باہر والی بچی سڑک پہ اس کے سارے دوست کرکٹ کا میدان سجائے اس کے منظر

203 2018

ماہنامہ شعل مارچ

202 2018

ماہنامہ شعل مارچ

202 2018

ماہنامہ شعل مارچ

202 2018

تھے۔ اس کے آتے ہی کھیل زور و شور سے شروع ہو گیا تھا۔ وہ اور صبور شاہ اپنی اپنی ٹیموں کے کپتان تھے۔

وہ بیٹ لیے وکٹ کے آگے کھڑا تھا۔ جب صبور نے دوسری طرف سے بال کر دیا تو کھی۔ اجیت کی شاٹ پہ بال تیزی سے اڑی گئی اور اگلے ہی لمحے حویلی کے گیٹ سے باہر آتے سید بختیار حسین کے سفید سوٹ پہ اپنا نشان چھوڑ گئی تھی۔

"اوئے!" اس کی دھاڑ پہ سارے بچوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ جبکہ اجیت کی تو سانس ہی رک گئی تھی۔ وہ سب بختیار شاہ کے غصے سے بہ خوبی واقف تھے۔ بختیار نے کھا جانے والی نظروں سے سامنے دیکھا تھا۔ اور اجیت کے ہاتھ میں بیٹ دیکھ کے اس کا غصہ دو چند ہو گیا تھا۔

اجیت بیٹ چھوڑ کے بھاگنے کو پر تولنے لگا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ بختیار کی پہنچ سے دور ہوتا اس نے لپک کے اس کی گردن دو بونج لی تھی۔

"کافر کی اولاد تیری اتنی جرات!" اس کا ہاتھ اس کے سر پہ پڑا تو جہاں اجیت کی چیخ نکل گئی تھی وہیں صبور شاہ دوڑتا ہوا اپنے دوست کی مدد کو آیا تھا۔

"بھائی، اجیت کو مت ماریں۔" اس نے بھائی کا بازو تھاما تو بختیار نے دانت پیستے ہوئے بے رحمی سے اجیت کو دور جھک دیا۔ وہ زمین پہ گرتے ہی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا۔ بختیار اسے

کڑی نگاہوں سے گھورتا صبور شاہ کی طرف پلٹا تھا۔ "کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ اس نجس کے ساتھ

مت کھیلا کرو۔ بات سمجھ میں نہیں آتی؟" سب کے سامنے بختیار کی ڈانٹ صبور کی آنکھوں میں آنسو

بھرا لائی تھی۔ وہ ناراضی سے بڑے بھائی کو دیکھتا اندر کی طرف بھاگ گیا تو بختیار کا رخ دوبارہ روتے ہوئے اجیت کی طرف ہو گیا۔ وہ غصے سے آگے

بڑھا اور ایک جھٹکے سے اسے بازو سے پکڑ کے سیدھا کیا۔ اتفاق سے اسی وقت سید نظر حسین شاہ اپنے ملازم کے ساتھ حویلی کے گیٹ سے باہر نکلے تھے۔

کرم دین سے بات کرتے ہوئے جوں ہی ان کی نظر سامنے کو اٹھی تھی ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ ان کا بڑھا کھٹا شہری بیٹا گاؤں کے معصوم بچے کو بازو سے دبوچے کھڑا تھا۔

"اور تو پلید انسان ادو بارہ اگر تو حویلی میں آیا تو میں نے تیری ٹانگیں۔۔۔۔۔" اس سے پہلے کہ بختیار اس کا کان مروڑتا ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"بختیار!" ان کی گرج دار پکار پہ جہاں سب بچوں نے پلٹ کر شاہ صاحب کی طرف دیکھا تھا وہیں سید بختیار حسین کی روح فنا ہو گئی تھی۔ آن واحد میں اجیت کو چھوڑتا وہ ایک جھٹکے سے پلٹا تھا اور اپنے

پچھے سید نظر حسین شاہ کا انگارے کی طرح دکھتا چہرہ دیکھ کر اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

حویلی کے ہال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھر کے سب ہی یکن سہی نگاہوں سے پیر سید نظر حسین شاہ کو تنک رہے تھے جن کا غصہ اپنے عروج پہ تھا جو ہرگز کوئی عام بات نہ تھی کیونکہ شمل سے شاہ صاحب کو غصہ شاذ و نادر ہی آیا کرتا تھا۔ لیکن جب بھی آتا

تھا جائز بات پہ اور بہت شدید آتا تھا۔ اسی لیے کسی میں بھی اس وقت مداخلت کی ہمت نہ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں شاہ صاحب اور بختیار حسین کے علاوہ تیسرا کوئی نہ تھا۔

"تمہاری جرات کیسے ہوئی اس معصوم پہ ہاتھ اٹھانے کی؟ اسے پلید کہہ کے پکارنے کی؟ تم خود کیا

بہت پاک صاف بہت معتبر ہستی ہو؟" ان کی غضب ناک نگاہیں بختیار شاہ کے چہرے پہ جمی تھیں جو کمرے کے وسط میں نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

"تمہارے انداز و اطوار تو پہلے ہی بہت مایوس کن تھے لیکن آج تو تم نے مجھ سے میری ہر امید ہی چھین لی ہے۔ بجائے میرا مان اور فخر بڑھانے کے تم نے تو مجھے میری ہی نظروں میں شرمندہ کر دیا ہے۔۔۔ میں کس منہ سے لوگوں کو نصیحت کروں گا

انہیں اچھائی برائی میں فرق بتاؤں گا جب میری اپنی اولاد ہی اس فرق سے بے بہرہ ہوگی۔" وہ غصے سے بولے تو سدا کے اکھڑ مزاج بختیار کے لیے مزید خاموش رہنا ممکن نہ رہا۔

"میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی بابا صاحب! جس کی وجہ سے آپ کو شرمندگی اٹھانی پڑے۔" نظریں جھکائے وہ ڈھٹائی سے بولا تو سید نظر حسین

شاہ اسے خشکیں نگاہوں سے دیکھتے بیوی کی طرف پلٹے۔

"لو دیکھو نور بانو! اپنے بے جا لڑپیا رکا نتیجہ۔ آج اسے کسی مظلوم پہ کیا غیظ ظلم، کوئی بڑی بات ہی نہیں لگ رہی۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولے تو

سب گھر والوں کے سامنے شاہ صاحب کا یوں ٹوکنا بی بی نور بانو کی نگاہیں جھکا گیا۔ جبکہ ان کے طنز پہ بختیار نے جلدی کے نظراٹھائی تھی۔

"میں نے کوئی ظلم نہیں کیا بابا صاحب۔ اس نے میرے کپڑے خراب کیے تھے۔ میں نے صرف اسے ڈرانے کے لیے ہاتھ اونچا کیا تھا۔"

"بھائی جھوٹ بول رہے ہیں بابا صاحب۔ انھوں نے اجیت کے سر پہ پھپر مارا تھا اور اسے زمین پہ دھکا دے کے گرایا بھی تھا۔ اور اسے کافر کی اولاد بھی کہا تھا۔" کم سن صبور کی اچانک مداخلت پہ بختیار کی شش ٹپ ٹپ ہو گئی۔

"بد بخت! اتم میں خدا کا خوف ہے کہ نہیں؟" شاہ صاحب یک لخت بلند آواز میں دھاڑے تو بختیار سمیت سب ہی کانپ اٹھے۔

"خود کو سنبھالو نظر۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" شاہ بی بی تیزی سے آگے بڑھیں۔

"کیسے سنبھالوں آپا۔۔۔ شرم آرہی ہے مجھے اسے اپنا بیٹا کہتے ہوئے۔" انھوں نے بختیار کی طرف غصے سے دیکھا۔ "ارے اس بچے پہ ہاتھ اٹھانے سے پہلے اتنا تو سوچ لیتے کہ اس کے کافر ماں باپ تمہاری تقدیم میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تم جہاں پاؤں رکھتے ہو وہ ہاتھ رکھتے

ہیں۔ اس عزت پہ بجائے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بننے کے تم تکبر پہ اتر آئے ہو! احساس برتری میں جتلا ہو گئے ہو! وہ چلتے ہوئے اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے تو اس تمام عرصے میں پہلی بار

بختیار کے ماتھے پہ پسینہ پھوٹ نکلا۔ تھوک نکلنے ہوئے اس نے بھی ہوئی نظروں سے باپ کے تنے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کس بات کا زعم ہے تمہیں ہاں؟ اس خاندان، اس نام مقام کا؟ لیکن اس گھرانے میں پیدا ہونے میں تمہارا کیا کمال ہے؟ تمہاری اپنی کیا حیثیت ہے بختیار شاہ۔ کوئی ایک ذاتی کامیابی، ایک ذاتی خوبی بھی ہو تو بتاؤ؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

انھوں نے سوال کیا تو وہ سر جھکانے پہ مجبور ہو گیا۔ اس کا جھکا سر ان کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"جن کا اپنا دامن اوپر والے کی خوشنودی سے خالی ہوتے ہے نا، وہ دوسروں کو تہی دامن کا طعنہ دیتے اچھے نہیں لگتے۔۔۔ صاحب ایمان ہونے کے بعد ایک کافر اور ایک مسلمان کے درمیان صرف ان کے اعمال کا فرق ہوا کرتا ہے۔ اور افسوس کہ

تمہارے پاس عمل نام کی کوئی چیز نہیں۔ قبر میں تمہیں نہ باپ کا نام بچانے آئے گا نہ دادا کا مقام۔ سو ان حوالوں پہ بھروسہ کرنے اور

اگر نے کی نادانی کبھی مت کرتا۔ دوبارہ کسی کو اپنے خاندان کے زعم میں آکر طعنہ دینے سے پہلے اپنے اعمال نا سے یہ ضرور نظر ڈال لینا۔ اب دور ہو جاؤ میری نظروں سے!" وہ غصے سے بولے تو اختیار کسی کی طرف دیکھے بنا لے لے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

اس کے سامنے سے بٹنے ہی سید نظر حسین شاہ کو لگا جیسے ان پہ منوں بوجھ آڑا ہو۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے صوفے پہ آکر گر سے گئے۔

"نظر!" مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔" شاہ بی بی کی پکار پہ وہ آہستگی سے بولے تو ناچار سب باہر کی طرف بڑھ گئے۔

ہال کے خالی ہوتے ہی شاہ صاحب نے تھکے تھکے سے انداز میں اپنا سر دوٹوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ تو اپنے اللہ کے بڑے عاجز بندے رہے تھے پھر ان کی والدہ میں یہ غرور، یہ اکر کہاں سے آگئی تھی؟ دکھ سے لب جھینچے انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"اے میرے معبود برحق! میں تیرا بڑا گنہگار بندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دے میرے مولا! یقیناً میں ہی اپنی اولاد کی صحیح راہ نمائی نہیں کر سکا۔ شک سب تعریفیں تیرے لیے ہیں۔ غرور صرف تیرا حق ہے۔ اور ہم تیرے عاجز بندے ہیں۔ پس تو میرے بچے کو بخش دے۔ اور اس کی ہدایت کا سامان فرما دے یا رب!" اپنے اللہ کے حضور گڑ گڑاتے ہوئے ان کا روال روال اپنے بختیار شاہ کی بھلائی کا خواہاں تھا۔

☆☆☆

حسب توقع شفق کی سہیلی، سحر کے گھران سب کا پُرتیاک استقبال ہوا تھا۔ وہ بڑے پیانے پہ ذاتی برس گرنے والی ایک معزز اور امیر سید محلی تھی جن کا گھربار دیکھ کے ان سب خواتین کو کافی اطمینان ہوا

تھا۔ ان کے اس اطمینان پہ دلی خوشی کی مہر اس وقت لگی تھی جب ان کی ملاقات اونچے لمبے، زوہیب شاہ سے ہوئی تھی۔ خوش شکل اور خوش گفتار سے، ذوہیب سے مل کر صدف کو حقیقتاً اپنی عزیز از جان دوست کی ہر تکلیف کا ازالہ ہوتا محسوس ہوا تھا۔ وہ خوش تھی، بے حد خوش۔

واپسی کا سارا راستہ آنے والے وقت کی خوش رنگ تار یوں پہ باتیں کرتے گزر رہا تھا۔

لیکن اپنے گھر کی دلییز پار کرتے ہی جب انھیں بڑی حویلی والوں کی اور خاندان کی دیگر گاڑیاں کھڑی نظر آئی تھیں تو ان چاروں کی ساری خوشگواریت ان بلند و بالا دیواروں کے اس پار ہی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جمعے کا دن تھا۔ گاؤں کی مسجد نمازیوں سے کچھا کچھا بھری تھی۔ منبر پہ بیٹھے شاہ صاحب کی اثر انگیز آواز سننے والوں پہ اپنا سحر طاری کر رہی تھی۔

"اللہ پاک سورہ آل عمران میں فرماتا ہے کہ۔۔۔" اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔۔۔" یعنی اس کے بندوں کے درمیان فرق اور جدائی پیدا کرنا اللہ کے نزدیک ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ پھر چاہے وہ فرق عقیدے بنا کے پیدا کیا جائے یا لوگوں کو ذات پات میں بانٹ کر، اس عمل کی ممانعت کی گئی ہے۔" انھوں نے جماعت پہ ایک نظر ڈالی۔ کبیر سنگھ ہر جمعے کی طرح آج بھی نمازیوں سے ہٹ کے پیچھے دروازے کے پاس بیٹھا غور سے شاہ صاحب کا خطبہ سن رہا تھا۔

"حسب و نسب کا غرور مسلمانوں کا وصف نہیں بلکہ یہودیوں کا شیوہ رہا ہے۔ جو خود کو ہر قوم سے اونچا اور بخشا ہوا تصور کرتے آئے ہیں۔ لیکن انسوس کہ آج ہم مسلمانوں کا معاشرہ بھی ذات برادری اور عقیدوں کے تکبر میں بری طرح مبتلا ہو چکا ہے۔ نہیں

یہودیوں کی طرح صرف اپنا عقیدہ درست اور اپنی برادری اونچی نظر آتی ہے باقی سب غلط اور خود سے کم تر محسوس ہوتے ہیں۔ جبکہ ان قبیلوں کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ ہماری دنیاوی پہچان کی علامت ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اللہ کے نزدیک نہ میں اونچا ہوں اور نہ آپ کمتر، ہماری بخشش میں ان قبائل کا کوئی حصہ نہیں ہونے والا۔ ہماری بخشش صرف ہمارے اعمال کو دائیں گے۔ ہمارا رتبہ، صرف ہمارا تقویٰ اور پرہیزگاری بلند کرے گی۔ جس کا عمل جتنا قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوگا اور جس کی نیت جتنی خالص اور پاک ہوگی، وہ اتنا ہی اللہ کے قریب ہوگا۔

اس لیے اگر اس کے دوست بننا چاہتے ہو، اس کے قریب آنا چاہتے ہو تو اپنے عمل کو ہر ملاوٹ سے پاک کر دو۔ دین کو اپنا ذاتی طور پہ اپنا، معاشرے میں پلتی غلط باتوں کو صرف اس لیے صحیح مت کہو کہ وہ نسل در نسل گھمراے درمیان چلتی آ رہی ہیں۔ یاد رکھو غلط کو غلط کہنا گناہ نہیں بلکہ اس پہ خاموشی اختیار کیے رکھنا گناہ ہے۔۔۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور ہمارے دلوں کو ایک دوسرے کے حق میں نرم کرے تاکہ ہم سچ بات کو بنا کسی حجت کے قبول کر سکیں۔" و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔" چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے شاہ صاحب نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"آج میں نے کھانا بنوایا ہے آپ سب اپنا حصہ لے کر جائے گا۔" گاؤں والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ کبیر سنگھ کی طرف پلٹے تھے۔ "کبیر! تم حویلی جاؤ اور دیگیوں کو مسجد میں لانے کا انتظام کرواؤ۔" انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس کا مان بڑھایا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔ "جو حکم شاہ صاحب۔" وہ سرشار سا مسجد سے نکل کے حویلی کی طرف چلا آیا تھا۔

پھر دیکیں مسجد میں لانے سے لے کر نماز کے بعد تقسیم۔۔۔ تک وہ شاہ صاحب اور ان کے ملازمین کے ساتھ گن رہا تھا، اس شدو سے کہ اسے پتا بھی نہیں تھا اور مسجد کے کھلے گیٹ سے، نظر آتے تھن میں اسے بھاگ دوڑ کرتا دیکھ کے، باہر سے گزرتے چند قدم اپنی جگہ پہ پل بھر کو ساکت رہ گئے تھے۔

"اجیتے! یہ دیکھ میں کیا لایا ہوں۔" وہ اپنے دھیان میں اپنے لاڈلے کو پکارتا گھر میں داخل ہوا لیکن آگے بڑھتے ہی اس کی نظر تھن میں بیٹھے خاندان والوں پہ پڑی تو وہ قہم سا گیا۔

"جا پتر کھا لے۔ تیرا پوتیرے لیے مسجد سے خیرات لے کے آیا ہے۔" ماما جی نے ایک کاٹ دار نظر اس کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے اجیت کو پکارا تو آنکھوں میں آنسو لیے چینی بلو، غصے سے شوہر کو دیکھتی منہ موڑ گئی۔ اجیت نے بھی ہوئی نظروں سے باپ کو دیکھا۔ وہ شروع سے ہی بہت کچھ دار اور حساس بچہ تھا۔ اس وقت بھی، وہ سب کی آمد اور اپنے باپ سے ناراضی کی وجہ سے بہ خوبی واقف تھا، تب ہی مان سنگھ کے کہنے کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

کبیر خود کو سنبھالتا آگے بڑھا تھا۔ "سریا کال ماما۔"

"سریا کال کیوں پتر۔۔۔ سلام آکھ۔" (سریا کال کیوں کہتے ہو بننا۔۔۔ سلام کہو) ان کی چوٹ پہ کبیر نے گڑبڑا کے نظریں چرائیں تو مان سنگھ کے کیوں پہ طنزیہ مسکراہٹ آنکھری۔

"اج اک کل تے دس کبیرے۔۔۔" ان کی تمہید نے کبیر کو ان کی طرف دیکھنے پہ مجبور کر دیا۔ "یہ تو کس کو دھوکا دے رہا ہے۔ ہمیں یا خود کو؟ یا اسے جو اوپر بیٹھا ہے؟" وہ استہزائیہ انداز میں بولے تو سب کے درمیان ان کا اسے یوں کٹہرے میں کھڑا کرنا، کبیر کے اندر ناگواری کی لہر دوڑا گیا، مگر اس نے

خود کو کوئی بھی سخت بات کرنے سے روکا، صرف اس لیے کہ وہ اس کے بزرگ تھے۔

"میں ایسا کج نہیں کیا ماما جی۔" (میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ماما جی۔) وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو اس کا جواب ماں سنگھ کا خون کھولا گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"او آدھا تیر اور آدھا تیر بن کے رہ گیا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے کج نہیں کیا؟ اولعت ہے تیری شکل پہ! "تیریاں چڑھائے وہ غصے سے گرجے تھے۔ ان کی بات کبیر کا چہرہ سرخ کر گئی تھی۔ "تو اگر میری مری بہن کا پتر (بیٹا) نہ ہوتا تو سوں (قسم) گر دیتی تھے ان ہی مسلوں (مسلمانوں) کے تھڑے پیر (کاٹ) کے رکھ دیتا جسے تو چاشتا پھرنا ہے۔" ان کی غضب ناکی نے وہاں سناٹا طاری کر دیا تھا۔

"مگر اب ہم میں سے کوئی یہ تماشا مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں۔" انھوں نے قطعیت سے ہاتھ اٹھایا۔ "ہم تجھے اپنی قوم اور اپنے مذہب کو یوں ذلیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے! تو یا تو ہم میں سے رہے گا یا پھر نہیں۔ فیصلہ تیرا اپنا ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنے درمیان دھوبی کا کتا نہیں چاہیے۔ سمجھ گیا!"

کبیر کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ یہ باتیں اگر اس کے ماموں کے بجائے کسی اور نے کی ہوتیں تو وہ اب تک اس کا منہ توڑ چکا ہوتا۔

سب کے سامنے اپنے شوہر کی اس درجہ ذلت بلو کا دل چیر گئی تھی۔ وہ دوپٹے میں منہ دیے ہچکچاکے رو پڑی تھی۔

"بس باکج ہو؟" وہ بولا تو لہجہ تباہ ہوا تھا۔ ماں سنگھ نے ایک نظر اس کے سرخ چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے مقابل آکھڑے ہوئے۔

"تھوڑی کو بونی (بہت) جان پتر! اپنے پیو (باپ) کی اولاد ہے ہاں تو دوبارہ ہمیں اپنی محل (بات) دہرانے کا موقع نہ دیں۔" انھوں نے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ایسا نہ ہو کہ دودو خداؤں کے پیچھے بھاگنے والے کو، مرنے کے بعد نہ اگ (آگ) ملے نہ مٹی!" سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھ گئے تو کبیر سنگھ کا وجود اپنی جگہ پہ پتھر کا ہو گیا۔

یہ وہ کیا کہہ گئے تھے؟ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اس نے سب کو ایک ایک کر کے ماما جی کے پیچھے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ بلو کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

کبیر سنگھ کی ساکت چپلوں میں جنبش ہوئی۔ اس کی نظریں اپنے بیٹے پہ آٹھری تھیں جو سہا ہوا دیوار سے لگا کھڑا تھا۔

"وہ اپنی اولاد کے لیے اس کے باپ کی پچان کا آخریون سا حوالہ چھوڑ کر جانے والا تھا؟ سکھ؟ مسلمان؟ یا پھر لاد مذہب؟؟؟"

☆☆☆

"کتنا منع کیا تھا میں نے کہ خاندان سے باہر رشتہ کرنے کی بات مت کریں۔ مگر آپ لوگوں نے میری ایک نہیں سنی۔ اب دیکھ لیا اپنی من مانی کا نتیجہ۔ سارا خاندان لعنت ملامت کر کے گیا ہے۔۔۔ آپ لوگوں کی وجہ سے آج مجھے ان لوگوں کی بھی باتیں سننا پڑیں جنہیں عام حالات میں مجھ سے بات کرتے ہوئے دو بار سوچنا پڑتا ہے۔" ہال میں چکراتے بختیار شاہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھیں۔ رشتے داروں کی دو گھنٹے کی طویل عدالت ان دونوں بھائیوں کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ اور معصومہ شاہ مزے سے تماشا دیکھنے میں مگن تھیں۔

بہن کی اس اطلاع پہ کہ زرناب کا رشتہ لے

ہونے لگا ہے، ہاشم غصے سے بھر اٹھا تھا، مگر وہ سفید حویلی جا کے سب کے سامنے ہلکا نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے بہن سے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ بھی کر کے اس رشتے کو ختم کر دے۔

"ہاں تو میں نے بھی منہ توڑ جواب دیا ہے اعتراض کرنے والوں کو۔ خاندان سے باہر شادی کوئی گناہ نہیں بلکہ ایک بے جا پابندی ہے، جس کی نذر میں اپنی بچی کو نہیں کر سکتی۔" بی بی نور بانو نے بھی آج ہر لحاظ بالا لے طاق رکھتے ہوئے اپنی بیٹی کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر آج وہ سب کے دباؤ میں آ کر کمزور پڑ گئیں تو آنے والے وقت میں ان کی بیٹی کا ہر جائز حق، یہ لوگ یونی فمب کر جائیں گے۔

"ہونہ، اور میری پچان؟ ان کا کیا ہوگا؟" بختیار شاہ نے ٹکی سے ماں کو دیکھا۔ "کیا آپ نہیں جانتیں کہ اگر آج ہم خاندان والوں کے خلاف گئے تو کل کو وہ بھی ہم سے کوئی نیا رشتہ نہیں جوڑیں گے۔"

"تمہیں اپنی اولاد کے مستقبل کی تو فکر ہے، مگر بہن کا کیا بنے گا؟" بھی اس بارے میں بھی سوچا ہے؟ "بی بی نور بانو کی آنکھوں میں دکھ آٹھرا۔

"ہاں تو کیا برائی ہے ہاشم میں؟" بختیار شاہ جھنجھلا کر بولے۔ "کیوں آپ اس کا رشتہ زرناب کے لیے قبول نہیں کرتیں؟" یہ سنتے ہی معصومہ کا دل بارغ بارغ ہو گیا۔ یہ ان کی شانہ روز محنت ہی تو تھی جو بختیار شاہ کو آخر کار اپنے سالے میں ہر برائی نظر آنابند ہو گئی تھی۔

"تمہیں ہاشم میں کوئی برائی نظر نہیں آتی؟" بی بی نور بانو نے استعجاب سے بیٹے کا چہرہ دیکھا تو وہ گڑبڑا کے نگاہیں چرائے۔

"ہاں ہیں اس کے چند ایک ایسے شوق جو۔۔۔"

"جو بد قسمتی سے اپنے باپ کی آنکھیں بند

ہونے کے بعد تم دونوں بھائی بھی کھلم کھلا اپنا چکے ہو۔" بی بی نور بانو نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے پہلی بار آئینہ بیٹوں کے سامنے رکھا تو بختیار شاہ کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"چلو جی آج سے آپ دونوں بھی بد معاش ہو گئے کیونکہ میرے بھائی کو تو اس گھر میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے،" معصومہ نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے شوہر اور پور کو دیکھا تو بختیار شاہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بہت اچھے! اگر ایسا ہے ماں جان تو میرا اب زرناب کے رشتے سے کوئی لینا دینا نہیں۔ وہ لڑکا اچھا نکلے یا برا، کم از کم مجھ جیسا خراب کردار کا آدمی اب اس کے بارے میں کچھ پتا کروانے والا نہیں۔ آپ جانیں اور آپ کا کام۔ ہاں جس دن تاریخ رہیں گی مجھے بتا دیجیے گا۔ میں اپنی عزت کو آپ کی لاڈلی کو اس گھر سے رخصت ضرور کروں گا، مگر اس کے بعد میرا آپ کے داماد اور بیٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔" قطعی لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے تو جہاں بی بی نور بانو کی آنکھیں بھرا آئیں وہیں معصومہ شاہ شوہر کو میدان ساس کے حوالے کرتا دیکھ کر بوکھلا گئیں۔

"ارے بات تو سنیں، جا کہاں رہے ہیں؟" مگر بختیار شاہ کہاں رکنے والے تھے۔ انھیں جاتا دیکھ کے معصومہ نے بے اختیار اپنا سر تمام لیا۔

ہال میں بیک لخت خاموشی چھا گئی۔ شاہ بی بی نے ایک نظر آنسو پیتی بی بی نور بانو پہ ڈالتے ہوئے اب تک تماشا شانی بنے بیٹے صبور شاہ کی طرف دیکھا۔ "تمہیں بھی ماں کو کوئی الزام دینا ہے تو دے لو۔"

صبور شاہ نے خفگی بھری ایک نظر ان پہ ڈالی اور اٹھ کر زینہ طے کر گیا۔ بیٹوں کا یہ انسوؤں ناک رویہ بی بی نور بانو کا دل بری طرح دکھا گیا۔ وہ بے اختیار ہونکے رو پڑیں۔



"بس۔ بس نور بانو۔" شاہ بی بی نے انھیں خود سے لگالیا۔

میں سلمان سے کہوں گی وہ خود زویب کا پتا کر دے گا۔۔۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سمجھو! بھابھی کی پشت سہلاتے ہوئے ان کی شعلے برساتی نظریں معصومہ پہ جا بھریں اور انھوں نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔

☆☆☆

شاہ صاحب دربار میں موجود اپنے حجرے سے تہجد کی نماز پڑھ کے چوٹی جانے کے ارادے سے باہر نکلے تو صحن میں پھیلی چاندنی میں درخت کے نیچے کسی کو بیٹھا دیکھ کے چونک گئے۔

"کون ہے؟" ایک قدم آگے بڑھ کر انھوں نے بلند آواز سے پوچھا تو دوسری طرف بت بنے بیٹھے وجود میں جنبش ہی ہوئی۔

"میں ہوں شاہ صاحب، کبیر۔" دھیرے سے جواب دیتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو پیر نظر حسین شاہ اسے اس وقت یہاں پائے پریشان ہو گئے۔

"خیر تو ہے کبیر؟" برآمدے کی مٹی جلا کے وہ اس کے پاس چلے آئے۔

"دو پہرے شام اور شام سے رات ہو گئی ہے سرکار، مگر مینوں کوئی جواب ہی نہیں مل رہا۔" وہ عجیب کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

تو پیر نظر حسین شاہ سمجھ گئے کہ وہ کسی ذہنی خلفشار کا شکار ہے۔

"اچھا، چلو آؤ، ادھر بیٹھو۔" وہ اس کا بازو تھامے بیڑھوں پہ آ بیٹھے۔ "اب بتاؤ کس سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہو؟" ان کے نرم لہجے پہ وہ کلائی میں پہنا کڑا گھمانے لگا۔

"ایسی کہ میں کی چائیاں آں؟ کی کر ریا آں؟" (کی کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ کیا کر رہا ہوں؟) اس نے افسردگی سے سر اٹھایا۔ "تینوں پتا

اے سرکار، اولوگ میرے گھر میں آ کے مینوں دھوبی کا کتا کہہ گئے ہیں۔۔۔ کہہ لیں، مجھے پرواہ نہیں۔ لیکن کل کو میرا پتر مجھے بے دھرم کہہ کے میرے کولوں (مجھ سے) منہ موڑ لے، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔" اس کی آواز بے اختیار بھرا آئی تھی۔

پیر نظر حسین شاہ نے اک گہری سانس لی۔ "مجھے معلوم تھا، ایک دن ضرور آئے گا۔ جب تم جانا چاہو گے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" ان کی بات پہ کبیر نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ کیسے جانتے تھے سرکار؟" اس کے سوال پہ شاہ صاحب لفظ بھر سکرا دیے۔

"اس لیے کہ ایسی ہر محبت کبیر جس کی کوئی منزل نہ ہو وہ انسان کو سمجھی نہ سمجھی خود سے یہ سوال پوچھنے پہ مجبور کر ہی دیتی ہے کہ وہ آخر کس سمت میں اور کیوں بھاگ رہا ہے؟ اور تمھاری مجھ سے عقیدت، اس جگہ سے لگاؤ، ایسی ہی ایک محبت ہے جس کی بظاہر کوئی تک نہیں۔"

"تے فیر میں کی کراں؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔ "آپ کو چھوڑ دوں؟ اس جگہ کو چھوڑ دوں؟"

"چھوڑ سکتے ہو تو چھوڑ دو کبیر۔ شاید اسی میں تمھاری بہتری ہے، ورنہ تمھارے لوگ تمھاری زندگی مشکل بنا دیں گے۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے تو کبیر کو لگا جیسے اس کا دل ویران ہو چلا ہو۔

"نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں آپ کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا سرکار! ان کا ہاتھ تھا وہ کسی بچے کی طرح سسک اٹھا تھا۔ اس کی اس درجہ محبت شاہ صاحب کی ہلکیس نم کر گئی تھی۔ بے اختیار ان کا ہاتھ اس کے شانے پہ آ ٹھہرا تھا۔

"لیکن یہ سچ ہے کبیر کہ تم اس طرح دو کشتیوں کے سوار بن کے نہیں رہ سکتے۔ یہ زندگی گزارنے کا

ڈھنگ نہیں۔"

"اگر زندگی گزارنے کے لیے ایک ہی رستہ (راستہ) چاہیے تو میں آپ کا رستہ چنوں گا۔ میں اس راہ گلوں گا (اس راہ پہ چلوں گا) جو مجھے آپ جیسا اچھا انسان بنا دے۔" آنسوؤں کے درمیان وہ انھیں اتنے اونچے مقام پہ بٹھا گیا کہ پیر سید نظر حسین شاہ کے پاس الفاظ ختم ہو گئے۔

"کبیر! جذبات کے باعث ان کی آواز لرز اٹھی تھی۔

"آپ۔ آپ مجھے کلمہ پڑھا دیں۔" اس نے بے قراری سے ان کا چہرہ دیکھا۔ تو شاہ صاحب پریشان ہو گئے۔

"کبیر، یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔" انھوں نے اس کا بازو تھاما۔

"اور میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں نے اپنی کشتی چن لی ہے سرکار۔" آنسو صاف کرتے ہوئے وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے واضح لہجے میں بولا تو سید نظر حسین شاہ کو اس کے چہرے پہ چھائی چٹانوں کی سی مضبوطی نے اس کے اگلے ارادوں کا پتا دے ڈالا۔ دروازے پہ کھلنے کی آواز پر صحن میں سوئی بلو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"کہاں چلا گیا تھا تو؟" اسے سامنے پائے بلو پریشانی سے بولی۔ کبیر کے قدم اپنی جگہ پہ جم گئے تھے۔

"ہن بولدہ کیوں نہیں؟" (اب بولتے کیوں نہیں؟) اس کا پارہ مزید چڑھا تھا۔ لیکن دوسری جانب کبیر کو مسلسل خاموش پائے کے وہ بے اختیار چونک اٹھی تھی۔

"کبیر! وہ ہر بات بھلائے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی تو کبیر سنگھ کی نظریں اس کے چہرے پہ آ ٹھہریں۔

"تو۔ تو ٹھیک تو ہے ناں کبیر؟" اس نے

پریشانی سے اس کا بازو چھوا تو کبیر نے اپنے خشک پڑتے لبوں پہ زبان پھیری۔

"کبیر۔ کبیر نہیں عبد اللہ۔۔۔ میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے بلو نے۔" وہ اکتاتے ہوئے بولا تو بلونت گور یوں اچھلی جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"نہیں۔ اے نہیں ہوسکا۔" (نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔) وہ اسے وحشت سے دیکھتی اٹنے قدموں چبھتی تھی۔ اس کی زرد پڑتی رنگت عبد اللہ کو پریشان کر گئی تھی۔

"بلو نے؟" وہ گھبرا کر اس کی طرف بڑھا تھا۔ مگر بلو ہونٹوں پہ ہاتھ رکھے بھاگتی ہوئی کمرے میں جا کے بند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کچے راستے پہ دھول اڑاتی وہ گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ اندر پھیلی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے ڈرائیور نے دندہ اسکرین سے نظریں ہٹائی تھیں اور ایک نظر اپنے ساتھ والی سیٹ پہ ڈالی تھی۔ جہاں اس کے صاحب کھڑکی سے بھاگتے منظر پہ نگاہیں جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ وہ پوچھتے ہی نہ رہ سکا تھا۔

"آپ پہلے یہاں آئے ہیں سمجھی؟" "نہیں۔" دھیرے سے کہتا وہ رخ پھیر گیا تو اس نے بھی اپنا دھیان ڈرائیورنگ پہ مرکوز کر دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان کی گاڑی تھانہ نور والاں کی حدود میں داخل ہو کر ایک جھکے سے رکی تو یہاں وہاں کھمرے عملے نے اپنے اپنے مشغلے ترک کرتے ہوئے، چونک کر اس نئے ماڈل کی سفید کار کو دیکھا جو ان کے لیے انجان تھی۔ لیکن سبز رنگ کی سرکاری نمبر پلیٹ پہ نگاہ پڑتے ہی ان سب کے توتے اڑ گئے۔

"میں نے جو باتیں سمجھائی ہیں ان کا خیال رکھنا

رفاقت!" دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے وہ ڈرائیور کی طرف پلٹا۔

"آپ بے فکر ہیں سرجی۔" اس کے جواب پہ وہ دھیرے سے مسکراتا ہر لنگا تو اس کا بارعب اور وجیہ سراپا دیکھ کے سب ہی ہنسنے لگے۔

"السلام علیکم جناب۔" ایک سپاہی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے دھوپ کا چشمہ اتارا۔ نیلی آنکھیں ارد گرد کا جائزہ لیتی مقابل پہ آنکھیں۔

"یہاں کا حوالدار اور ایس ایچ او کہاں ہیں؟" اس کے حکم پہ لہجے پہ سپاہی کی گھبراہٹ دوچند ہوئی۔

"اندر ہیں جناب۔"

"بلاؤ انہیں۔" اس نے اٹھ کھم صادر کیا تو اس کے تیور سپاہی کو پریشان کر گئے۔

"مگر آپ ہیں کون سرجی؟"

"سیف علی جنگ۔۔۔۔۔ اس علاقے کا نیا اے ایس پی۔" اور سامنے کھڑے سپاہی کی رنگت لمحے کے ہزاروں جھمکے میں قہقہے ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کبیر سنگھ کے اسلام قبول کرنے کی خبر چاروں طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ سارے سکھ گھرانوں کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ لیکن چونکہ اس معاملے میں ان کا اپنا سکھ ہی کھوٹا تھا سو وہ کسی کو بھی الزام نہ دے سکے تھے۔ البتہ بلونت کو کہہ کر عبد اللہ کے گھر سے لے جانے کے لیے سب نے اڑی چوٹی کا زور لگایا تھا مگر وہ اپنی اگلی اولاد کو چھوڑ کر جانے کے لیے کسی طور آمادہ نہ ہوئی تھی۔

اجیت کو عبد اللہ نے، در در کی ٹھوکروں کی نذر کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا، جس کے بعد بلوکا اس دہلیز کو پار کرنا جیسے ناممکن ہو گیا تھا۔ سزا کے طور پہ ساری سکھ برادری نے عبد اللہ کے ساتھ ساتھ بلونت

کور سے بھی ہر تعلق ختم کر لیا تھا۔

بلوکا جیسے چپ لگ گئی تھی۔ سارا سارا دن سر جھکائے وہ نجانے کن سوچوں اور کاموں میں مصروف رہتی تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اور رات ہونے پہ وہ اسی خاموشی کی چادر اوڑھے ساتھ والے کمرے میں جا کے بند ہو جاتی تھی۔ ملنا ملنا، ہنسنا بولنا اس نے ہر چیز ترک کر دی تھی۔ اس کی یہ حالت عبد اللہ کے لیے حد تکلیف کا باعث تھی۔

قبول اسلام کے بعد جس دن عبد اللہ نے اپنے بال کٹوائے تھے اور اپنی ڈاڑھی کو اسلامی خطہ دیا تھا اس دن بلونت کور پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اس روز اس نے اپنے شوہر، اپنے کبیرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ وہ اب اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھنے کی روادار نہ رہی تھی۔

اس تناؤ بھرے ماحول نے اجیت کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ اپنے باپ کے مذہب بدلنے کے طعنوں نے اس کے اندر سوالوں کا ایک انبار لگا دیا تھا جسے عبد اللہ وقتاً فوقتاً اس کی سمجھ کے مطابق کم کرنے کو کوشش کرتا رہتا تھا۔ مگر دل کا بدلنا کسی اور سمت کھینچا اس کیفیت کو وہ بھلا ایک بچے تک کیسے پہنچا سکتا تھا؟ یہ تو بس وقت ہی تھا جو اس کا نکتہ نظر اس کی اولاد پہ واضح کر کے اسے اپنے بیٹے کی نظر میں صحیح یا غلط ثابت کر سکتا تھا۔

"ابا۔۔۔ تو روئی کیوں نہیں کھا رہا؟" اجیت نے سوچوں میں ڈوبے عبد اللہ کا بازو ہلایا۔

"کھا رہا ہوں پتر۔" بلوکا سانس لیتے ہوئے اس نے خالی نظروں سے اپنے پہلو کو دیکھا جو ویران پڑا تھا۔ بلوکا دونوں باپ بیٹے کے آگے رات کا کھانا رکھ کے خود کمرے میں چلی گئی تھی۔ اجیت نے باپ کی آنکھوں میں پھیلی افسردگی کے رنگوں کو یہ خوبی محسوس کر لیا تھا۔

"ابا!" عبد اللہ کی نظریں اپنے لاڈلے کے

کملائے ہوئے چہرے پہ آنکھیں۔ "بے بے کب تک ہم سے ناراض رہے گی؟" اور اس کے دل میں جیسے اک ٹیس سی اٹھی تھی۔ اس کا معصوم بچہ دنوں میں ہی کتنا بڑا کتنا حساس ہو گیا تھا۔

"چل آ چل کر تیری ماں کو مناتے ہیں۔" اچانک اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے بیٹے کا ہاتھ تھامنا تو وہ بے طرح خوش ہو گیا۔

باپ بیٹا چلتے ہوئے برآمدے میں بنے کمرے تک پہنچے تو اجیت نے رک کر باپ کی طرف دیکھا۔

"تو اور (ادھر) ہی رک ابا۔ پہلے میں جاتا ہوں۔" اور عبد اللہ بیٹے کی اس درجہ ہوشیاری پہ مسکرایا۔

"چنگا، چا نیر۔" (ٹھیک ہے جاؤ پھر۔) اجیت دروازہ کھول کے اندر چلا گیا۔ عبد اللہ اک گہری سانس لیتا باہر نکلنے لگا۔ دل میں اپنی بلوکا منانے کے ڈھیروں جملے ترتیب دیتا وہ ابھی پلٹا ہی تھا کہ روہا ناسا اجیت گھبرایا ہوا ہوا آیا۔

"ابا! ابا! بے کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ اکھیاں دی نہیں کھول رہی۔" اور عبد اللہ اسے ہٹاتا سر پٹ کمرے کی جانب بھاگا تھا۔

"بلونت!" چار پائی پہ چپ پڑے وجود پہ جھکتے ہوئے اس نے پریشانی سے اس کے گال ہتھپتھائے تھے۔ لیکن بے سود۔ "اجیت، پانوی (پانی) لے کے آ۔" حواس باختہ سا کہتا وہ تیزی سے چار پائی پہ بیٹھا تھا۔ اور جب ہی اس کا ہاتھ بلوکا کے ہاتھ سے جا کر آیا تھا جو اگلے ہی لمحے بے جان سا چار پائی سے نیچے جھوٹ لگا تھا۔

"بلوکا!" وحشت سے اسے پکارتے ہوئے اس نے بلونت کور کے مساکت وجود کو دونوں شانوں سے تھام کر جھجھوڑا ڈالا تھا مگر۔۔۔

باپ کے رونے کی آواز پہ پانی کا گلاس اجیت

کے نغصے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پہ گیا تھا۔ وہ بھانگتا ہوا کمرے میں آیا تھا، جہاں اپنے ابا کو سینے سے لگائے، زور زور سے روتا دیکھ کے اس کا چھوٹا سا دل کانپ اٹھا تھا۔

گھر میں پیدا ہوئے نئے تناؤ نے زرناب کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ صدف اس کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے شاہ نی بی سے اجازت لے کر اسے حوٹلی سے باہر لے آئی تھی۔ کئی میٹر پر پھلے باغات ان کی ملکیت تھے۔ یہاں وہ بغیر کسی جھجک کے آرام سے گھوم پھر سکتی تھیں۔ ملازمہ کو ساتھ لیے، چائے کا سامان ہمراہ اٹھائے صدف نے اس چھوٹی سی آؤٹنگ کو باقاعدہ پکنک کا رنگ دے دیا تھا۔

کھلی ہوا، بہتے پانی اور اس کے نٹ کھٹ سے بھتیوں کی شرارتوں نے جلد ہی زرناب کا دھیان بنا دیا تھا۔ اسے پھر سے مسکراتا دیکھ کے صدف نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ زرناب رات سے رو رو کر زرناب کی حالت غیر ہو چکی تھی۔

"میں ذرا چاچا نورالہی کے گھر والوں سے حال احوال پوچھنے جا رہی ہوں، تم ساتھ چلو گی؟" باغات کے پرانے ملازم کا نام لیتے ہوئے زرناب نے صدف کی طرف دیکھا۔

"نہ بابا۔ میں ان شیطانوں کو اکیلے چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتی۔" عمر کو یہ مشکل تمام قابو کرتے ہوئے اس نے اس کی میٹھی شرٹ اتاری۔

"ٹھیک ہے میں پھر ابھی آتی ہوں۔" کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اپنے کپڑے جھاڑے۔

"فضل، بی بی کے ساتھ جاؤ۔" صدف نے چائے پتی فضیلت سے کہا تو زرناب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"تم چائے پیو، میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔"

"خیال سے جانا۔" صدف کی "امانتا" بھری پکار نے آگے بڑھتی زرناب کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

صد شکر تھا کہ اس کی زندگی میں ابھی حقیقی محبت کی چاشنی میں ڈوبے پھر رشتے موجود تھے مگر نہ جو روپ اسے قسمت چند نام نہاد اپنوں کا دکھا چکی تھی اس کے بعد تو اگر وہ اپنی ذات پر سے بھی اعتبار کھینچتی تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی۔ یاسیت سے سوچتی وہ اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی جب اچانک درختوں کے درمیان سے نکل کر کوئی اس کی راہ میں آیا تھا۔ زرناب کے منہ سے جھج نکلتے نکلتے پچی تھی۔

"آہ! کتنے دنوں بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں میں۔" ہاشم کی عامیانہ نظروں اور الفاظ نے زرناب کا چہرہ سرخ کر دیا۔ وہ سختی سے لب بھینچے تیزی سے پلٹی تھی کہ ہاشم نے ایک ہی جست میں اسے کلائی سے پکڑتے ہوئے قریب لگے درخت کی طرف دھکیل دیا تھا۔ زرناب کا کندھا بہت زور سے تنے سے ٹکرایا تھا۔ وہ بے اختیار کراہ اٹھی تھی۔

"تمہارے سامنے تمہارا باپ نہیں، ہاشم رجب حسین شاہ کھڑا ہے۔ یہ نخرے کسی اور کو دکھانا۔ سمجھیں! غصے سے اسے دیکھنا وہ غرا کر بولا۔ زرناب نے سرعت سے خود کو سنبھالا۔

"اور تمہارے سامنے بھی کسی حزارے کی بیٹی نہیں بلکہ پیر سید نظر حسین شاہ کی عزت کھڑی ہے اس لیے اپنی حد میں رہو!" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ غصے سے بولی تو ہاشم کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ بچھل گئی۔

"میری حد ابھی تم لوگوں نے دیکھی کہاں ہے۔" اس کی مسکراہٹ نفرت میں ڈوبنے لگی۔ "قسم خدا کی! جس دن کسی اور کی ڈولی میں بیٹھی ناں، میں تمہیں اور تمہارا ہاتھ تھامنے والے کو سفید حویلی کی دیلیر پہنچے ہی ختم کر دوں گا!" اس نے اس زور سے مٹھیاں جھینچیں کہ ہاتھوں کی رکیں ابھر آئیں۔

"تم مجھے خوف زدہ کرنے آئے ہو؟" زرناب

کی پیشانی پہ موجود ہل گہرے ہو گئے۔

"نہیں۔ یہ باور کروانے آیا ہوں کہ تم صرف ہاشم شاہ کی ہو۔"

"ہونہ! میں اور تمہاری؟" زرناب طنز یہ انداز میں مسکرائی۔ "جو شخص سالوں پہلے میرے قابل نہیں تھا، میں آج اس کی دوسری بیوی بنوں گی؟ جاؤ ہاشم شاہ! جا کے اپنا منہ دھو!" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس شخص کی ہر خوش فہمی کے پرچے اڑا دے۔ ہاشم کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"بہت۔ بہت۔ بہت بڑی بات کر دی ہے تم نے زرناب نظر حسین!" لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "اب تو اگر تمہیں اٹھا کر بھی اپنے قدموں میں گرانا پڑا تو گراؤں گا۔"

اس کی بات یہ زرناب نے دانت پہ دانت جمائے اسے گھورا۔ اگلے ہی دل وہ اپنا سارا خوف پس پشت ڈالتی اس کے مقابل آنکھڑی ہوئی۔

"اور مجھے اگر خود کو ختم کر کے بھی تمہاری جیت کو ہار میں بدلنا پڑا تو بدلوں کی!"

"ٹھیک ہے پھر۔ دیکھتے ہیں کون کس کو دھول چٹاتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ اچانک اس کی طرف جھکا تو زرناب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹی۔ ہاشم خباثت سے ہنس پڑا۔

"کب تک؟ کب تک میری جان؟" اسے دیکھتا وہ کمینگی سے گنگنایا۔ زرناب کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتی واپسی کے لیے پلٹی۔ ہاشم نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

"آج کے آج جا کر اس رشتے کو ختم کر دو۔ ورنہ وہ حال کروں گا اس شہزادے کا کہ گھر والے صورت تک پہچان نہیں پائیں گے۔" یہ آواز بلند بولتا وہ زرناب کو لب بھینچتے یہ مجبور کر گیا تھا۔ مگر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

زرناب کو بنا کوئی رد عمل دکھائے آگے بڑھتا دیکھ کے ہاشم شاہ کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے تھے۔

"تمہاری یہ بے نیازی نہ تم سے چھین لی زرناب نظر حسین شاہ تو ہاشم نام نہیں میرا!" اس کی پشت پہ نظریں جمائے وہ جیسے ایک ان دیکھی آگم میں جلتے لگا تھا۔

☆☆☆

"تاریخ گواہ ہے، دین اسلام قبول کرنے والوں کو اللہ پاک نے ہر دور میں آزمایا ہے۔ تمہاری پہلی آزمائش تمہارے اپنوں کا تمہیں چھوڑنا تھا۔ تمہاری دوسری آزمائش تمہاری محبت کرنے والی بیوی کی جدائی ہے۔ یہ سوچنا کہ بلونت کور کی موت کے ذمہ دار تم ہو بالکل غلط ہے۔ سب کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ تمہاری بیوی نے اسی دن اور اسی گھڑی اس دنیا سے جانا تھا، پھر چاہے تم کبیر سنگھ رہتے یا عبداللہ بن جاتے۔ تمہارا اور اس کا اتنا ہی ساتھ لکھا تھا۔" شاہ صاحب نے اپنے برابر سر جھکائے بیٹھے عبداللہ کا شانہ چھتھایا۔

بلو کی موت کو آج چوتھا دن تھا۔ اور عبداللہ کا غم کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بلو کی اس اچانک موت اور اپنے گھر کی بربادی کا ذمہ دار خود کو ٹھہرا رہا تھا۔ اور کیوں نہ ٹھہراتا؟ بلونت کور کے رشتے داروں اور ساری سکھ برادری میں ایسا کون تھا جس نے اسے لعن طعن نہ کی تھی۔ اس کے نقصان کو داہے گردوی مار نہ گردانا تھا۔ وہ سب سچے ہوئے تھے اور اس کا منہ کالا ہوا تھا۔ وہ خود کو مجرم نہ گردانتا تو اور کیا کرتا؟

گاؤں کے ہر فرد نے یہ تماشا دیکھا تھا۔ شاہ صاحب بھی انجان نہ تھے۔ وہ بس اس گھڑی کے منتظر تھے، جب عبداللہ ذاتی اور جذباتی طور پہ اس

قابل ہو جاتا کہ ان کے الفاظ کو سمجھ سکتا۔ اور آج ان کے نزدیک وہ وقت آ گیا تھا جب ہی تو وہ خود چل کر اس کے گھر تک آئے تھے

اور اب بہت محبت سے اسے ساتھ لیے بیٹھے تھے۔

"تمہارے دل میں شاید یہ خیال بھی آتا ہو کہ تم غلط فہمی میں سوار ہو گئے ہو۔ اور یہ کہ شاید تم پہلے صحیح تھے۔ لیکن جب تم قرآن پاک کا ترجمہ پڑھو گے تو یہ جانو گے عبداللہ کہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں سارے مومنوں کو بتا دیا ہے کہ وہ ان کا امتحان لے گا، اور یہ تمہارا امتحان ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا عبداللہ، جو اس سے محبت کا دعویدار ہے وہ اس نقصان سے پریشان ہو کر، دنیا کی کڑوی باتوں سے گھبرا کر کہیں اسے چھوڑ تو نہیں دے گا؟" وہ نرم لہجے میں بولے تو عبداللہ نے سراٹھا کر ان کا مشفق چہرہ دیکھا۔

"میں اسے نہیں چھوڑنا چاہتا سرکار۔ لیکن یہ وی (بھی) سچ ہے کہ میں سوچی بے گیا آں۔" (سوچ) میں پڑ گیا ہوں) وہ بولا تو اس کی آواز اندیشوں کے مارے بھرا آئی۔ "میں۔ میں کیا کروں جی؟" اس نے گھبرا کر ان کا ہاتھ تھاما۔

"صبر کرو۔ اور یہ یاد رکھو کہ تم صرف اپنے اللہ کے بندے ہو، یعنی تمہاری جان، مال، اولاد سب تمہارے رب کی عطا کردہ ہیں، وہی تمہارا مالک ہے۔ اور مالکوں کو تو کبھی بھی اپنی چیز واپس لینے کا اختیار ہوتا ہے ناں عبداللہ۔" وہ دھیرے سے مسکرائے تو بغور ان کی بات سنتے عبداللہ کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"شاباش۔ تم ایک سچے مسلمان ہو، اس لیے اب تم اپنے اس نقصان کا اور غم نہیں کرو گے۔۔۔ کل سے میں تمہیں ان شاء اللہ قرآن پاک کی تعلیم دوں گا۔ پھر تمہیں پتا چلے گا کہ تم کتنے سچ راستے پہ

ہو۔ "اور عبداللہ کے چہرے پہ پھیلے اضطراب میں کچھ کمی ہوئی۔

اور پھر پورے نورے والاں نے دیکھا تھا کہ کس طرح ایک غیر تعلیم یافتہ نو مسلم کو، پیر سید نظر حسین شاہ نے اپنی تربیت سے ایمان کامل رکھنے والا مسلمان بنا دیا تھا۔ اس کا رخیہ میں سفید حویلی کی تینوں خواتین نے، نئے اجیت کی ذمہ داری اٹھا کر شاہ صاحب کی بھرپور مدد کی تھی۔

شاہ صاحب کے کہنے پہ عبداللہ اپنے بیٹے کو لے کر حویلی آ گیا تھا، جہاں ان کی رہائش کا بندوبست دیگر ملازمین کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔

دربار اور مسجد کا سارا انتظام شاہ صاحب نے عبداللہ کو سونپ دیا تھا۔ پورے گاؤں میں اس کی عزت و مرتبے میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا حویلی کے اپنے بچوں کی طرح گھر کے اندر باہر بھاگتا پھرتا تھا۔ بختیار شاہ سمیت کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اجیت کو سخت نظر سے دیکھ بھی سکتا۔ اس کی تعلیم و تربیت پہ شاہ صاحب خصوصی توجہ دیتے تھے۔ گاؤں کے کلاسکول کے علاوہ انھوں نے گھر پہ اس کے لیے انگریزی تعلیم کا علیحدہ سے بندوبست کروایا تھا۔ وہ اسے آنے والے وقت میں اپنا دست راست بنانے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کی یہ محبت عبداللہ کو ہر آن ان کا احسان مند کیے دیتی تھی۔

دھیرے دھیرے شاہ صاحب کی میٹھی شخصیت اجیت پہ بھی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ وہ باپ کو ان کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھتا، دینی باتیں کرتے سنتا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل ان باتوں کی طرف مائل ہونے لگتا۔

پلک جھپکتے میں دو سال کا عرصہ گزر رہا تھا۔ شاہ بی بی کے مشورے کے مطابق سید نظر حسین شاہ، بختیار شاہ کو زمین داری کی طرف لے آئے تھے، اور اس بار انھیں بختیار شاہ نے مایوس نہیں کیا تھا۔ بیٹے کو احسن

طریقے سے اپنی ذمہ داریاں نبھاتا دیکھ کر شاہ صاحب نے اس کا گھر بسا نے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ یوں جب زرتاب محض دس برس کی تھی تو اٹھارہ سالہ معصومہ بیاءہ کر سفید حویلی چلی آئی تھی۔ اس دوران عبداللہ کی خواہش یہ بارہ سالہ اجیت کو شاہ صاحب نے، اس کی ایماء پر ہنگامہ بڑھا دیا تھا۔ وہ دن عبداللہ کی زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔ اس روز اللہ نے اس کے بیٹے کو بھی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نئی پہچان عطا کر کے دین و دنیا کی بھلائی عطا کر دی تھی۔

☆☆☆

"نیا اے ایس بی؟" صوفے پہ براجمان بختیار شاہ ایک جھٹکے سے سیدھے ہوئے تھے۔ "وہ کب آیا؟" انھوں نے مقابل بیٹھے ایس ایچ او کو دیکھا۔ ان کی لاعلمی ایس ایچ او کے جھٹکے چھڑا گئی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ شاہ جی ہر بات کی طرح اس ضروری خبر سے بھی آگاہ ہوں گے لیکن انھیں انجان پاکے اسے اپنی متوقع شامت صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

"آج صبح سرکار۔" انھیں دیکھتے ہوئے اس نے تھوک لٹکا۔

"اور تو مجھے اب بتا رہا ہے جب وہ سر پہ مسلط ہو چکا ہے۔" تیوریاں چڑھائے وہ یہ آواز بلند دھاڑے تو ایس ایچ او نظریں جھکا گیا۔ اس خبر نے صبور شاہ کو اس روز پارٹی میں ہونے والی گفتگو یاد دلادی۔

"اوہو۔۔۔" اس نے بے اختیار اپنی پیشانی مسلی تو بختیار شاہ نے پلٹ کر بھائی کی طرف دیکھا۔ "اصل میں بھائی مجھے اس بارے میں تھوڑی بہت سن گن پارٹی والے دن ہی ہاشم سے پتا چل گئی تھی۔ اور میں آپ سے اسے ڈسکس بھی کرنے والا تھا لیکن پھر وہ رشتے والی بات کو لے کر ایسی الجھن پڑی کہ یہ بات میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔" وہ ان کی استغناء مہر نظروں کے جواب میں بولا۔

"تمہارا نہیں، ان حرام خوروں کا کام تھا جنھیں میں بٹھا کر کھلا رہا ہوں۔" اس کی بات پہ انھوں نے غصے سے ایس ایچ او کو گھورا۔

"قسم لے لیں سرکار، ہمیں تو خود کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بالکل ہی اچانک نازل ہوا ہے۔" وہ اپنی پوزیشن واضح کرنے کو جلدی سے بولا۔

"اوہو تاک نہ!" (اوہ زیادہ بکواس نہ کرو) انھوں نے بد مزگی سے سر جھٹکا۔ "یہ جو اتنے مہینوں سے خبریں گرم تھیں کسی افسر کے آنے کی، تب کیوں نہ کان دھرے تو نے؟ سو رہا تھا کیا؟"

"ایک عرصہ ہو گیا سرکار! یہاں کوئی ڈاڈا افسر آیا ہی نہیں۔ اب مجھے کیا پتا کہ اس بار۔۔۔" وہ منہ لکے چپ ہو گیا تو بختیار شاہ نے اک گہری سانس لی۔

سچ ہی تو کہہ رہا تھا، خود انھوں نے بھی تو ان خبروں کو غیر اہم جان کے اپنی ساری توجہ سیاسی منظر نامے اور چوڑے پیر پر مرکوز کر دی تھی۔ غفلت تو ان سے بھی ہوتی تھی۔

"کون ہے اور کس قماش کا ہے؟" وہ بولے تو آواز میں پہلا سا غصہ نہ تھا۔ ایس ایچ او نے دل میں شکر ادا کیا۔

"لہور (لاہور) شہر کا ہے جی۔ کسی پروفیسر کا بیٹا ہے۔ دو سال پہلے مقابلے کا امتحان پاس کیا ہے۔ سنا ہے بڑی سچی مت (الٹے دماغ) والا بندہ ہے۔" اس نے آج کے آج حاصل کی گئی تفصیل بڑے شاہ جی کے گوش گزار کی۔

"ہوں۔۔۔" مونچھوں کو تاؤ دیتے انھوں نے پرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔ "نام کیا ہے؟"

"سیف علی جنگ۔" ایس ایچ او نے جواب دیا۔

"بال بچے دار ہے؟"

"نہ جی۔" بختیار شاہ نے سر ہلاتے ہوئے صوفے کی پشت سے کمر نکالی۔

"صبر!" چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد انھوں نے بھائی کی طرف دیکھا۔

"جی بھائی۔"

"کل جا کے ذرا ملاقات تو کرو ناں اس بچی مت والے سے۔" ان کے استہزاء یہ انداز پہ صبور شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور ہاتھ ذرا ہولا رکھنا۔ سی ایس بی آفسر ہے۔ اس کے اختیارات کی حد ایس بی کے اختیارات کو چھوٹی ہے۔" انھوں نے اسے متنبہ کیا۔

"آپ بے فکر ہیں۔" صبور شاہ نے ٹانگ پہ ٹانگ جھائی۔ "کل دیکھتا ہوں میں، کتنے پانی میں ہیں موصوف۔" اور ایس ایچ او جیل کو اپنی پریشانی آدھی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اب شاہ جی جانتے اور ان کا کام، وہ تو "سوکھا" (مطمئن) ہو گیا تھا۔

اگلے دن جس وقت صبور شاہ نے تھانہ نور والاں کی حدود میں قدم رکھا، وہ بے اختیار ٹھٹھک گیا۔ ایس ایچ او سے لے کر سپاہی تک مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی اپنی ڈیوٹی پہ حاضر تھے۔

وہ سیدھا اس افسر شاہی کے کمرے میں چلا آیا جو کسی فائل پہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

دستک کی آواز پہ اپنے دھیان میں بیٹھے سیف علی جنگ نے نظریں اٹھائی تھیں اور دروازے میں کھڑی ہستی کو دیکھ کے اس کی نگاہیں آنے والے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔ صبور شاہ کو دفتر سے چلتا میز کے دوسری جانب اکھڑا ہوا تھا۔

"مجھے سید صبور نظر حسین شاہ کہتے ہیں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سیف علی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور میں سیف علی جنگ۔" ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے بھاری لہجے میں اپنا تعارف کروایا تو غیر ارادی طور پہ صبور شاہ کی نظریں اس کا جائزہ لینے پہ مجبور ہو گئیں۔

اونچا لمبا قد، مضبوط جسامت اور سرخ و سفید رنگت۔ جس پہ سیاہ مونچھیں اور بھری بھری سی فیشٹی ڈاڑھی بے حد بچ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک بھرپور اور چھا جانے والی شخصیت کا مالک تھا۔

"تشریف رکھیں۔" کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنی نشست سنبھالی۔ صبور شاہ قسدا پھیل کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"تو آپ یہاں اے ایس پی تعینات ہوئے ہیں۔" اس کے چہرے پہ نظریں جمائے صبور شاہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی۔" وہ ہنسا کی تاثر کے بولا۔

"کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟"

"جب آپ جانتے ہیں صبور صاحب تو کیوں یہ فارمیٹی بھار ہے ہیں۔" کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سیف استہرا نے انداز میں مسکرایا تو صبور شاہ بے اختیار لب بھینچ گیا۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے بندھ سی گئیں اور تب ہی بالکل اچانک صبور کو لگا جیسے اس نے آنکھوں کے اس تاثر کو نہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں؟ اس نے یادداشت پہ زور دیا، مگر نیلی آنکھوں والا کوئی بھی شخص اسے یاد آ کے نہیں دیا۔ اپنے اندر سر اٹھاتے اس عجیب سے احساس کو جھٹکتے ہوئے وہ آگے کو جھک آیا۔

"پھر تو تمہیں بھی پتا ہوگا سیف علی جنگ کہ یہ علاقہ کس کا ہے؟" اس کے انداز پر تو سیف کی نیلی آنکھوں میں سرد مہری سی پھیل گئی۔

"جانتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" صبور پر سکون سا مسکرایا۔ "اب مزید جان لو کہ اس علاقے اور یہاں کے لوگوں کے مالک ہیں ہم۔ تم نے یہاں رہنا ہے تو ضرور رہو۔ لیکن یہاں راج کرنے کے خواب کبھی مت دیکھنا۔"

"میں خوابوں پہ نہیں عمل پہ یقین رکھتا ہوں سید صبور شاہ!" اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے وہ اس کے نام پہ زور دیتے ہوئے بولا تو مقابل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"یعنی دوسرے لفظوں میں تم باغی ہو۔"

"نہیں سید! ہمارے لفظوں میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ کسی سے حکم لینا میری سرشت میں شامل نہیں۔" مضبوط لہجے میں کہتا ہوا وہ دونوں بازو میز پہ رکائے آگے کو جھک آیا تو صبور شاہ چند ثانیے اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے پھر ہم اپنی مرضی چلاؤ۔۔۔ ہم اپنی طاقت آزمائیں گے۔ لیکن اگر تمہارا مل کر چلنے کا ارادہ ہے تو ہماری طرف سے دوستی کا دروازہ کھلا ہے، چلے آنا۔"

"آفر کا شکریہ۔" بے نیازی سے جواب دیتا وہ سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا تو اس کا انداز صبور شاہ کو سرتاپا سا لگا گیا۔ شعلے برسانی نظروں سے اس کے جھکے سر کو دیکھتا وہ لب بھینچے ایک جھٹکے سے پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے باہر نکلنے ہی سیف علی جنگ نے ہاتھ مار کر سامنے کھلی فائل بند کر دی۔

"تم لوگوں کے راج کے دن ختم ہوئے صبور شاہ۔ اب دیکھنا میں کون کون سے کھاتے کھوٹا ہوں!" غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں جمائے اس نے اس زور سے ہاتھ میں پکڑا قلم دبایا کہ وہ اس کی انگلیوں کے درمیان چبھ گیا۔

☆☆☆

"مصطفیٰ!"

اپنے نام کی پکار پہ حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے نوجوان نے لان کی طرف دیکھا تھا اور شاہ بی بی کو وہاں کرسی پہ براجمان دیکھ کے وہ ان کی جانب چلا آیا۔

"السلام علیکم شاہ بی بی۔" وہ مودب سا ان کے پاس آکھڑا ہوا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسی طبیعت ہے اب عبداللہ کی؟" انھوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو اپنے کھڑے کھڑے نقوش اور کھلتی ہوئی رنگت کے ساتھ دل موہ لینے والی کشش رکھتا تھا۔ اس کا یہ رنگ و روپ بلو کی مریخوں منت تھا۔ وہ گھٹے بالوں والی ایک خوبصورت شخص تھی، جس کا رنگ چاندی کی طرح چمکتا تھا۔ مصطفیٰ کے بال بھی ماں کی طرح گھنے اور آنکھیں سیاہ کالی تھیں۔

بچپن اور جوانی کی سرحد پہ کھڑا، وہ اب اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔ اس کی میٹھی مسکس، کچھ کچھ گہری ہونے لگی تھیں۔ قد میں بھی ٹھیک ٹھاک اضافہ ہوا تھا لیکن جسم فی الحال صرف لمبائی پہ ہی اکتفا کیے ہوئے تھا، چوڑائی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

"بہتر ہیں۔" اس کی نشست و برخاست اور گفتگو میں حویلی کی تربیت کے باعث زمین و آسمان کا فرق آچکا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" شاہ بی بی مطمئن ہوئی تھیں۔ ان گزرے سالوں میں عبداللہ کو دسے کا مرض ہو گیا تھا جس کے باعث اس کی طبیعت اکثر نرم گرم رہتی تھی۔

"ایسا ہے کہ آج مجھے اور بچیوں کو شہر لے جانا، انھوں نے شادی کے لیے کچھ خریداری کرنی ہے۔" انھوں نے خاندان میں ہونے والی ایک شادی کا حوالہ دیا تو مصطفیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جی بہتر۔" اس نے جب سے ڈرائیونگ سیکھی تھی یہ ذمہ داری بھی اس پہ آگئی تھی، کیونکہ شاہ صاحب اور گھر کی خواتین کے لیے اس میں اور صبور شاہ میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہ ایک بات تھی کہ اس میں اور شہری رنگ ڈھنگ میں جوان ہوتے صبور شاہ میں

وقت گزرنے کے ساتھ مالک و ملازم والا ایک فاصلہ خود پہ خود آگیا تھا۔ جس میں بہت بڑا ہاتھ بختیا شاہ کا بھی تھا، جوان گزرے ماہ و سال میں غرور اور طاقت کی چلتی پھرتی تصویر بن چکے تھے۔

معصومہ سے شادی کے بعد بڑی حویلی کے سید رجب حسین شاہ اور ان کے بیٹیوں بیٹیوں کے رنگ ڈھنگ نے تند خور اور کھڑ مزاج بختیا شاہ پہ خوب اثر دکھایا تھا۔ وہ دونوں میں ہی جاہ و حشمت کے غرور میں ڈوبے ایک روایتی جاگیردار بننے چلے گئے تھے جس کا اثر صبور شاہ کے کچے ذہن پہ بھی خوب ہوا تھا۔ اس کے لیے بھائی کا سنے اور شکار کا شوق، ان کا لوگوں پہ رعب و دبدبہ، گاڑیاں، باڈی گارڈز یہ سب اسے بابا صاحب کی سادہ طرز زندگی کے برعکس بے حد کشش کا باعث تھا۔ جن سے مرعوب ہوتے ہوئے وہ خود بھی اسی انداز و اطوار میں رنگتا چلا گیا تھا۔ اس کی سوچ کیا بدلی کہ بچپن کا دوست مصطفیٰ، ابھی بہت خاموشی سے اس کے ملازمین کی صف میں شامل ہو گیا۔

"کتنے بچے تک لکھیں گی؟" اس نے شاہ بی بی کی طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتیں برآمدے کا دروازہ کھول کر سولہ سالہ زرتاب دھپ دھپ کرتی چھپی کی طرف چلی آئی تھی۔

سرخ اور نارنجی رنگ کے چڑی کے سوٹ میں اس کی گوری رنگت دک رہی تھی۔ شانے پہ بڑی پیے ترتیب سی چٹیا اس کی کھلنڈری طبیعت کی غماز تھی۔ جبکہ ماتھے کے تل اس کا موڈ خراب ہونے کا پتہ دے رہے تھے۔ نظریں چراتے چراتے نجی مصطفیٰ کا دل بری طرح ڈول گیا تھا۔ زرتاب شاہ کے آس پاس رہتے ہوئے وہ کب اسے چاہنے لگا تھا اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"شاہ بی بی!" اس کی خفگی بھری پکار پہ کوثر شاہ نے بھیجی کی طرف دیکھا تھا۔ "اماں جان مجھے نیا سوٹ نہیں لینے دے رہیں۔ کہہ رہی ہیں الماری



بھری ہوئی ہے ان ہی میں سے کوئی پہنو۔" منہ بسورتے ہوئے اس نے ماں کی شکایت کی۔ اس کا منہ لٹکانا ان کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"میٹرک کے پرچے دینے والی ہو، مگر اب بھی بچوں کی طرح بات بات پہ منہ لٹکا لیتی ہو۔" ان کی نظروں میں اس کے لیے محبت کا سمندر دکھائیں مار رہا تھا۔

"تو کیا میٹرک کے پرچے دینے والوں کا دل نہیں دکھتا؟" چھپی کی اس زبانی منطق پہ اس نے ناراضی سے انھیں دیکھا تو بے اختیار شاہ بی بی ہنس پڑیں جبکہ مصطفیٰ نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ جم کالیا۔ زرناب نے غصے سے دونوں کو دیکھا۔

"آپ دونوں ہنس کیوں رہے ہیں؟"

"تیری عقلندی پہ ہنس رہے ہیں میری جان۔" شاہ بی بی ہنسنے ہوئے بولیں تو زرناب کی چھوٹی سی ناک پہ دھرا غصہ دوچند ہو گیا۔

"میں بس شادی پہ ہی نہیں جارہی۔" وہ خفا خفا سی پلٹی۔

"تمہاری مرضی۔" وہ بے میں ایک گھنٹے تک مصطفیٰ کے ساتھ شہر کے لیے نکلنے والی ہوں۔" مصطفیٰ کو دیکھتے ہوئے شاہ بی بی شرارت سے مسکرائیں تو وہ بھی کھل کر مسکرا دیا۔ ان کی بات نے زرناب کو مصطفیٰ کے ساتھ حساب برابر کرنے کا اچھا موقع دیا۔

"اس چلفوزے کے ساتھ؟" مصحفیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اس نے مصطفیٰ کی طرف اشارہ کیا تو اس اچانک حملے پہ چلفوزے کی مسکراہٹ اڑ چھو ہو گئی۔

"زرناب۔" شاہ بی بی کے آنکھیں ٹکانے پہ وہ ہلکھلا کے ہنسی پڑی۔

"آپ خود دیکھیں بی بی، کیسے چلفوزے کی طرح بالکل سفید اور لبا سا ہے۔" وہ قہقہے کرتی ہنسی کے درمیان مصطفیٰ کو خوشی سے دیکھتے ہوئے بولی تو نہ

چاہتے ہوئے بھی شاہ بی بی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی جھینپا جھینپا سا ہنس پڑا تھا۔

لان سے آتی ہنسی کی آواز پہ، اپنے کمرے میں ٹہل ٹہل کر بچی کو سلاتی، مصحفہ شاہ نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور وہاں کا منظر دیکھ کر ان کا منہ کڑوا ہوا گیا تھا۔

"میرے خیال میں اب اس لڑکے، مصطفیٰ کا حویلی میں یوں منہ اٹھائے گھومنا بند ہو جانا چاہیے۔" وہ پلٹ کر شوہر کی طرف آتے ہوئے بولیں جو بیڈ پہ نیم دراز سرگرت پینے میں مشغول تھے۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟"

"کیا مطلب کیا ہوا ہے؟ گھر میں تین تین جوان لڑکیاں نظر نہیں آتیں آپ کو؟" وہ بیڈ کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔

"کیا کریں، بابا صاحب کا پھیلایا ہوا کھڑاگ ہے۔" انھوں نے ناپسندیدگی سے سر جھٹکا۔

"نہ تو آپ کی کوئی حیثیت نہیں؟" ماتھے پہ ہل ڈالے انھوں نے بختیار شاہ کی طرف دیکھا۔ "بند کریں اس کا یہ اندر باہر پھرنا۔" غصے سے بولتے ہوئے انھوں نے باس پڑے کاٹ میں گڑیا کو ڈالا۔ گڑیا ان کی چھٹی اولاد تھی جو بہت دعاؤں کے بعد اب کہیں جا کے شادی کے چھٹے سال میں ہوئی تھی۔ اس دوران انھوں نے بختیار شاہ کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے ماں باپ کے کان میں اپنے چھوٹے بھائی، ہاشم اور زرناب کے رشتے کی بات ڈال دی تھی تاکہ اکلوتی بیٹی کو وٹے سٹے میں دینے کے بعد سفید حویلی والے ان پہ کبھی سوکن لانے کا سوچ بھی نہ نکلیں۔ کیونکہ خاندانی بوی کو چھوڑنے کا رواج تو ان میں تھا نہیں البتہ دوسری تیسری شادی عام تھی۔

ہاشم شاہ بھی بہن کے اس فیصلے سے خاصا خوش اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ زرناب سے رشتہ جوڑنے میں اس کے لیے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ ایک تو وہ خوبصورت بہت بھی، دوسرا اس سے شادی کے بعد وہ پیرسید نظر میں شاہ کا اکلوتا داماد بن جاتا جس کی شان اور مرتبے کے سامنے ایک زمانہ سر جھکانا تھا، اور تیسرا زرناب سے بڑی وہ ساری زمین و جائیداد بھی جو شادی کے بعد اس کی ہو جاتی۔ پھر بھلا اسے اس رشتے پر کیونکر اعتراض ہو سکتا تھا؟

"بلکہ میری مائیں تو زرناب اور ہاشم کا رشتہ طے کرنے والی بات کریں۔ ہاشم کی پڑھائی بھی ختم ہو چکی ہے۔ اباجی نے اپنی زندگی میں چا چاجی سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اور آج انھیں اس دنیا سے رخصت ہوئے بھی سال ہونے والا ہے۔ مگر چا چاجی نے اس موضوع پہ دوبارہ کوئی بات نہیں کی۔ اب بے بی چاہ رہی ہیں کہ ان سے آکر ایک بار پھر یہ بات کریں۔" ان کے قریب بٹھتے ہوئے انھوں نے اپنی ماں کا حوالہ دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔

"مجھے نہیں لگتا کہ بابا صاحب اس رشتے کے لیے مائیں گے۔"

"کیوں؟ کیا کی ہے میرے بھائی میں؟" انھوں نے تنک کر شوہر کو دیکھا۔ "یا پھر زرناب میں کوئی سرخاب کے پرگے ہیں؟"

"ارے بابا میرے کہنے کا مطلب تھا کہ وہ ابھی چھوٹی ہے۔"

"اب ایسی بھی کوئی چوچی نہیں۔" وہ جل کر گویا ہوئیں۔ "لیکن پھر بھی اگر یہ وجہ ہے تو فی الحال صرف نکاح کر دیں۔" بختیار شاہ بے اختیار اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

"تائی جان سے کہو کہ ابھی کچھ عرصہ رک جائیں۔ زرناب اپنے میٹرک کے پرچوں سے فارغ ہو جائے، پھر اس موضوع پہ بات کریں

گے۔" انھوں نے سرگرت ایش ٹرے میں مسلی۔

"کوئی ضرورت نہیں اس کی پڑھائی کو زیادہ اہمیت دینے کی، چا چاجی نے کیا کم سر چڑھا رکھا ہے جواب آپ بھی ان کے نقش قدم پہ چلنے لگے؟"

مصحفہ نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے انھیں دیکھا تو وہ لب بٹھنے ایک بار پھر خاموشی اختیار کرنے پہ مجبور ہو گئے۔

☆☆☆

"صف مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" زرناب نے مقابل کھڑی صف کو دیکھا جو جلدی جلدی اس کا دو پٹا ٹھیک کر رہی تھی۔ آج حسب روایت زوہیب شاہ اپنی بیٹی کے ساتھ دعوت پر سفید حویلی آیا ہوا تھا۔ اور اس وقت نیچے زرناب کا انتظار ہو رہا تھا۔

مہمانوں کی آمد سے پہلے صف کی امی، بی بی حورا نے شاہ صاحب کی عزت کا واسطہ دے کر بختیار اور صبور شاہ کو مہمانوں سے ملنے کے لیے بڑی مشکل سے راضی کیا تھا، جس پہ مصحفہ بیگم دل ہی دل میں خاصی چیخیں بہ جیبن ہوئی تھیں۔ لیکن شوہر کے خاموشی اختیار کرنے پہ انھوں نے بھی کچھ کہنے سے احتراز ہی کیا تھا۔

"جب اپنے زوہیب صاحب سے ملو گی تاں تو ساری گھبراہٹ اڑ چھو ہو جائے گی تمہاری۔" اس کی طرف دیکھتے وہ شرارت سے مسکرائی تو زرناب بدک کر پیچھے ہٹی۔

"میں نہیں ملنے والی اس سے۔" اس کے چہرے پہ ہوا نیاں اڑنے لگیں تو صف قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"ارے بابا مذاق کر رہی ہوں۔ بھلا بھاجی اور صبور کی موجودگی میں، تم تمہاری زوہیب کے ساتھ ملاقات کروا سکتے ہیں؟" اس نے آگے بڑھ کے اس کے دوپٹے پہ پن لگائی تو زرناب نے سکھ کا سانس

لیا۔

"بھرجائی کہاں ہیں؟" اس نے معصومہ کی بابت دریافت کیا۔

"جانا کہاں ہے، نیچے جگ کے بیٹھی ہیں مہمانوں کے ساتھ۔ آخر رپورٹ نہیں دینی اپنے کینے گھر والوں کو۔" صدف نے بد مزگی سے کہتے ہوئے زرناب کو دیکھا۔ "قسم سے تم نے گھر والوں کو، ہاشم کی راستہ روکنے والی حرکت نہ بتا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔"

"وہ ایسی گری ہوئی حرکتیں بہت بار کر چکا ہے۔" زرناب غی سے مسکرائی۔

"تھمھاری یہی خاموشی ایسے مزید شہہ دیتی ہے۔" صدف کی نگاہوں میں غلطی درآئی۔

"اور بتا کر کیا ملے گا؟" زرناب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تو لہجے میں ٹوٹے

کا بچہ سی جھپٹ گئی۔ "میرے سر پہ میرے والد کا سایہ نہیں رہا صدف، اور میرے بھائیوں کی نظروں

میں میرا کردار بہت پہلے مشکوک ٹھہرایا جا چکا ہے۔ میں اگر سچ بھی بولوں گی ناں تو اس شخص کو

اسے جھوٹ بنانے میں لحد نہیں لگے گا اور وہ خود مجھ پہ کوئی تہمت بھی دھردے گا ناں تو ان لوگوں کو اسے

سچ ماننے میں کوئی قباح محسوس نہیں ہوگی، صرف اس لیے کہ میرے محرم میرا سائبان نہیں بن سکے اور

یہی میرا الیہ ہے!" اس کی محرومی آنسو بن کر اس کی آواز میں اتر آئی تو صدف کو اپنی غلطی کا احساس

شدت سے ہوا۔ اس نے بے اختیار زرناب کو خود سے لگا لیا۔

"مجھے معاف کر دو۔۔۔ پتا نہیں کیوں میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ بات بھول جاتی ہوں

کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت سمجھدار مردوں کی ساری روشن خیالی اور ساری سمجھداری صرف اپنی ذات تک محدود ہے۔" اس کا بوجھل لہجہ آخر میں سچ

ہو گیا تو زرناب نے اک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

"ایسے مت کہو تمھاری محبت اور خلوص پہ مجھے کبھی بھی شک نہیں رہا۔" دھیرے سے کہتے ہوئے

اس نے اپنے آنسو صاف کیے تو صدف نے محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"تو بس پھر فوراً سے ہاں کر دو۔ سچ میں بہت ہنڈسم اور ڈیسینٹ بندہ چتا ہے میں نے تمھارے

لیے۔" اسے واپس اپنی جون میں لوٹا دیکھ کر زرناب دھیرے سے مسکرا دی۔

"تم کبھی ہار نہیں مانو گی ناں؟" "ہاں مائیں ہمارے دشمن جو نیچے بیٹھے جل

رہے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے اسے لیے دروازے کی طرف بڑھی تو زرناب بے بسی سے سر ہلاتی اس کے

ساتھ چل پڑی۔ صدف کے ہمراہ نیچے آنے پہ زویب کی فیملی

اس سے بہت محبت اور اپنائیت ملی۔ زویب چونکہ مردان خانے میں تھا اس لیے چاہ کر بھی زرناب کو

دیکھ نہ سکا تھا۔ البتہ چلتے چلتے اس کی بہن اور بھانجی نے صدف اور شفق کے ساتھ مل کر زرناب کی ایک

جھلک اسے دکھا دی تھی۔ ان کا یہ چاہت بھرا رویہ ہنسی مذاق معصومہ کے دل پہ چھریاں سی چلا رہا تھا

اس پہ مستزاد ان کا پڑھا لکھا اور شہری رکھ رکھاؤ والا انداز معصومہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان سب کو اٹھا

کر گئیں غائب کر دیں۔ صبور کو بھی مہذب ساز و ہیپ خاصا پسند آیا

تھا۔ بختیار شاہ البتہ مہمانوں کے جاتے ہی بنا کچھ کہے سنے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ ان کی اجنبیت

نے ماں کے دل کو ٹھیس سی لگائی تھی جسے محسوس کرتے ہوئے صبور نے انھیں سلی دی تھی کہ وہ خود زویب کے معاملے میں ضروری معلومات کروائے گا۔ اس

کے انداز میں در آنے والی یہ لچک کس کی مرہون

منت تھی، سب جانتے تھے۔ جب ہی اس کے جاتے ہی اماں جان نے صدف کو خود سے لپٹا لیا تھا۔

"نجانے تو میری کس نیکی کا صلہ ہے صدف! اللہ پاک تجھے اپنے بچوں کی ڈھیروں

خوشیاں دکھائے۔۔۔ تیرا سہاگ سدا سلامت رہے میری جان۔" اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھا

انھوں نے بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی تھی اور معصومہ شاہ کے اندر باہر جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح شاہ صاحب کو عبداللہ اور اپنے خاص ملازم کرم دین کے ساتھ شہر کے لیے نکلنا دیکھ کر

بختیار شاہ اور معصومہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔ "خیر تو ہے بابا صاحب! یہ اچانک آپ کا

بروگرام کیسے بن گیا؟" بختیار شاہ نے ان کی طرف دیکھا۔ روانگی سے قبل وہ سب ہی ان کی لینڈ کرور

کے پاس کھڑے تھے۔ شاہ بی بی کا چہرہ بے حد اتر ا ہوا تھا۔ معصومہ نے بغور بچھی کا جائزہ لیا۔

"اچانک تو نہیں، کافی دن سے ایک کام پٹانے کا سوچ رہا تھا۔" وہ اپنے مخصوص ٹھہرے

ہوئے لہجے میں بولے تو بختیار شاہ چونکے۔ "ایسا کون سا کام تھا جو بابا صاحب ان سے

کہنے کے بجائے خود کرنے کھڑے ہوئے تھے؟" دل ہی دل میں سوچتے ہوئے انھوں نے بظاہر عام سے

لہجے میں دریافت کیا۔ "کیسا کام؟"

"بتاؤں گا۔" وہ نرمی سے ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے گاڑی میں سوار ہو گئے تو بختیار شاہ کی آنکھیں

بھری نظریں تب تک گاڑی پہ جمی رہیں جب تک وہ گیٹ سے باہر نہ نکل گئی۔

"یہ چاچا جی اکیلے اکیلے کس کام کو پٹانا چاہتے ہیں؟" معصومہ شوہر کے قریب آتے ہوئے آہستہ

سے بولیں تو وہ بے زاری سے "پتا نہیں" کہتے

ہوئے مردان خانے کی طرف بڑھ گئے۔

گاڑی حویلی کا چانک نما گیٹ پار کر کے جوں ہی روڈ پہ آئی پیرسید نظر حسین شاہ نے اک

بوجھل سانس لیتے ہوئے اپنی پشت میٹ سے ٹکا دی۔

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج میری اولاد ہی میرے لیے قابل بھروسہ نہیں رہی۔" ان کے

لہجے کا دکھ ساتھ بیٹھے عبداللہ کو بھی افسردہ کر گیا۔ "میں نے اپنے بختیار کے لیے ہدایت کی بڑی دعائیں کی

تھیں عبداللہ، مگر شاید رب کو میرے بیٹوں کے ذریعے میری آزمائش مقصود ہے جب ہی تو صبور بھی

اسی کے رنگ میں رنگنے لگا ہے۔" وہ مایوسی سے بولے تو عبداللہ نے احترام سے ان کے گلنے کو

چھوا۔ "تسی پریشان نہ ہو سرکار۔ اللہ تاؤدھیاں دعاواں ضرور قبول کرے گا۔" اس کا دلا سہ ان کی

آنکھوں میں ادا سی نکھر گیا۔ "نہیں عبداللہ۔ اللہ ہدایت بھی صرف انھیں

دیتا ہے جو خود ہدایت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اور بد قسمتی سے میرے دونوں بیٹے دنیا کے طلب گار نکلے

ہیں۔ سو انھیں دنیا ہی ملے گی۔۔۔ ہے تا چراغ تلے اندھیرے والی بات؟" وہ پھیکا سا مسکرائے تو

عبداللہ طول سا خاموش ہو گیا۔ "کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مصطفیٰ جیسا ایک

سلجھا ہوا اور فرما نبردار بچہ میرا بھی ہوتا تو مجھے اس گدی کا مستقبل اتنی مشکل میں نظر نہیں آتا۔۔۔ تم سچ

میں اللہ کو بہت پیارے ہو عبداللہ، اس نے نہ صرف تمھیں آج کے اس برائیوں بھرے دور میں اپنی

اور اپنے دین کی پہچان کروائی بلکہ تمھیں مصطفیٰ جیسی نیک اولاد بھی عطا کی۔ تم ایک خوش نصیب انسان

ہو۔" ان کی بات پہ عبداللہ مسکرا دیا۔ "میرے مقدور اچ اے خوش نصیبی تھا ڈی وجہ

توں لکھی گئی اے سرکار۔ فیروج کو کہ تھاڈا کی مقام اے۔" اس نے بے پناہ محبت سے ان کا ہاتھ چھوا تو پیر نظر حسین شاہ کو اس کی یہ محبت مزید دل گرفتہ کر گئی۔ "تم سب کی یہی سختیں تو مجھے تمہارا مقروض کیے دیتی ہیں۔" "میں کج سمجھیا نہیں سرکار۔" عبداللہ نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"میرے پاس موجود یہ گلدی دراصل تم سب کا بھروسہ ہے جو تم لوگوں کو میری ذات پر ہے۔ یہ میرے آباؤ اجداد کی امانت ہے جو مجھے اپنے سے بھی بڑھ کر نیک اور پرہیزگار بندے کو سونپتی ہے۔ مگر انہوں نے میرے پاس میری اگلی نسل میں سے ایسا ایک بھی معتبر نام نہیں جس کے حوالے میں اس مقام کو کر کے اپنے رب کے حضور سرخرو ہو سکوں۔" بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے وہ لفظ بھر کو خاموش ہوئے تو عبداللہ کو لگا جیسے وہ کوئی بہت انہونی بات سننے والا ہے۔

وہ سانس روکے شاہ صاحب کو دیکھ گیا جو بیل بھر کو کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے شاید خود بھی اپنا حوصلہ جمع کر رہے تھے۔

"میں نے اس بیری مریدی کے سلسلے کو یہیں ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" یہ سن کر عبداللہ کے ساتھ ساتھ گاڑی چلاتے کرم دین کو بھی شدید قسم کا جھکا لگا تھا۔

"اے کی کہہ رہے اور کار؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ دنیا داروں کے ہاتھوں میں، دینداری کا یہ منصب انہیں مزید مغرور اور سرکش بنادے گا۔ اور میں اپنے رب کی عطا کی گئی اس عزت کا غلط استعمال ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ میں آج اسی لیے شہر جا رہا ہوں کہ وکیل سے مل کے اپنے اس فیصلے کو قاتوئی وصیت کی شکل دے سکوں تاکہ اگر کل کو مجھے کچھ ہو جائے تو

میری اپنی اولاد بھی اس گلدی کے معاملے میں من مانی نہ کر سکے۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے گویا ہوئے تو عبداللہ جیسے تڑپ اٹھا۔ "اللہ نہ کرے سرکار۔ رب آپ کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔" اور پیر سید نظر حسین شاہ اک بھاری سانس لے کر رہ گئے۔

تن تنہا اتنا بڑا فیصلہ کرنا ان کے لیے کتنا مشکل امر تھا، یہ وہی جانتے تھے۔ نسل در نسل چلنے والے اس بے حد شان اور مرتبے والے منصب سے نہ صرف ان کے گھرانے کی بلکہ خود ان کی عزت بھی بڑی تھی، اس کا ختم ہونا خود ان کے لیے بھی باعث شرمندگی تھا، مگر وہ بے حد مجبور تھے۔

گھر بھر میں انہوں نے صرف شاہ بی بی کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تھا اور نتائج کی پرواہ کیے بنا شہر چلے آئے تھے۔

تقریباً دو گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ اپنے بنگلے پہ پہنچے تو وکیل پہلے سے ان کا منتظر تھا۔ ان کے فیصلے کو وصیت کی صورت تیار کروا کے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ بند کمرے میں اس سے ایک تفصیلی ملاقات کے بعد شاہ صاحب نے کاغذات پر دستخط کیے تھے اور اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر کے وکیل کو سونپ دیا تھا۔

"عبداللہ۔" وکیل کے جانے کے بعد انہوں نے عبداللہ کو آواز دی۔

"جی سرکار۔"

"گاڑی نکلواؤ۔" اور وہ اثبات میں سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد شاہ صاحب آکر گاڑی میں بیٹھے تو کرم دین ان کے حکم کا منتظر تھا۔

"گاڑی چلاتے رہو کرم دین، میرا دل بہت بے چین ہے۔" انہوں نے سریٹ پہ ڈال دیا۔ بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے انہیں کافی دیر ہو چکی تھی۔

ایسے میں ان کی گاڑی ایک سنگٹل پہ آکر رکی تو فضا میں زور و شور سے بجتے اونچے اونچے میوزک پہ پیر سید نظر حسین شاہ کی نگاہیں بے اختیار ذرا فاصلے پہ کھڑی کار سے جا کرائیں۔ جس میں سوار دو جوان لڑکے اور لڑکیاں ارد گرد سے بے نیاز میوزک پہ سر دھتے ہوئے ایک دوسرے میں مگن تھے۔ ان کی نگاہوں میں ناگواری اتر آئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ رخ پھیرتے انہیں پچھلی سیٹ پہ بیٹھے دو لڑکوں میں سے ایک پہ اپنے پیچھے ہاشم شاہ کا گمان ہوا۔ "کرم دین گاڑی آگے کر دوڑا۔" ان کے حکم پہ کرم دین نے گاڑی تھوڑا آگے بڑھانی تو شاہ صاحب کا گمان، یقین میں بدل گیا۔ لیکن ہاشم شاہ اپنی بغل میں بیٹھی لڑکی کے ساتھ مصروف تھا کہ اسے چچا کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا۔

سید نظر حسین شاہ کی آنکھوں سے غصے میں چنگاریاں سیٹھکتی لگیں۔ محض بائیس سال کی عمر میں یہ لڑکا۔ شہر میں جو کل کھلا چکا تھا اس کا انہیں یہ خوبی تھا اسی لیے ایک سال قبل جب ان کے بھائی نے ہاشم کے لیے ان کی زرتاب کا ہاتھ مانگا تھا تو وہ خاموشی اختیار کر گئے تھے۔ مگر آج اس کے یہ رنگ ڈھنگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد تو ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کی شکل بھی دیکھیں۔

"کرم دین، اس شور سے گاڑی آگے نکالو۔" ان کے تنے ہوئے لہجے پہ کرم دین گھبرا گیا۔ تب ہی خوش قسمتی سے سنگٹل چل گیا تھا۔ کرم دین نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے اس کیلیم پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

سیف علی جنگ کو نوروالا آئے آج چوتھا دن تھا۔ صبور شاہ سے تھانے میں ہونے والی ملاقات کے بعد سفید حویلی والوں نے دوبارہ اس سے رابطہ نہیں کیا تھا جو اس کے لیے زیادہ چوس رہنے کا سنگٹل

تھا۔ کیونکہ جتنی معلومات وہ ان کے بارے میں رکھتا تھا اس کے مطابق وہ اسے اتنی آسانی سے اپنی راجدھانی میں مداخلت کی اجازت نہیں دینے والے تھے۔ البتہ بڑی حویلی والے حاذق شاہ اپنے چند بندوں کے ساتھ اس سے ملنے آئے تھے۔ بظاہر تو انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن سیف جانتا تھا کہ طاقت کے معاملے وہ سب ہی ایک تھے اسی لیے وہ ان میں سے کسی پر بھی بھروسہ کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

"السلام علیکم بابا!" وہ اپنے معمول کے مطابق صبح تیار ہو رہا تھا تو کمرے میں اس کا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پہ "بابا" جگمگاتا دیکھ کر اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو میرے شیر؟" دوسری طرف سے عثمان علی جنگ کی بٹاش آواز آئی تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"بالکل ٹھیک۔ آپ سنائیں؟" "میں تو ٹھیک ہوں لیکن تمہاری ماں اداس ہے۔"

"جانتا ہوں۔" اس کی مسکراہٹ پھینکی پڑ گئی۔ "آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں۔" "جس ماں کا دل اپنی اولاد کا غم سہہ چکا ہو اسے سمجھانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔" وہ دھیرے سے بولے تو سیف ملول سا خاموش ہو گیا۔

"ان لوگوں نے دوبارہ رابطہ تو نہیں کیا؟" لمحے کے توقف کے بعد عثمان صاحب نے پوچھا۔ "نہیں۔" وہ قدم اٹھاتا کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ نوروالا کی حدود سے ذرا باہر یہ خوبصورت بنگلہ اور مقامی ملازمین اسے گورنمنٹ کی جانب سے دیے گئے تھے۔

"اس کی کوئی خبر؟" انہوں نے مبہم سا سوال کیا تو سیف کے اندر جیسے اک ہوک سی اٹھی۔

"نہیں۔"

"اللہ تمہاری مدد کرے۔ اپنا بہت خیال رکھنا بیٹا۔" محبت سے کہتے ہوئے انھوں نے فون بند کر دیا تو سیف علی ان کی دعاؤں کے حصار کو محسوس کرتا اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

تیار ہو کر وہ ناشتے کی میز پر آیا تو معمول کے برعکس یونیفارم کے بجائے سفید شلوار قمیص میں تھا۔ اسے کرسی سنبھالتا دیکھ کر ملازمہ مستعدی سے اس کے آگے ناشتہ لگانے لگی۔

سیف نے ایک توصیفی نگاہ اپنے سامنے سلیتے سے لگائی مگر میز پر ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر آلیٹ کی پلیٹ اٹھالی۔

"شیم!"

"جی صاحب جی۔" ملازمہ نے چائے اٹھیلے ہوئے سر اٹھایا۔

"تم نے یہاں سے پہلے کہیں اور بھی کام کیا ہے کیا؟" سیف نے آلیٹ کا ٹکڑا کاٹا۔ مزیدار مہک نے اس کی بھوک بڑھادی تھی۔

"جی سفید حویلی میں ہوتی تھی میں۔" اور سیف کا ہاتھ اپنی جگہ پہ بل بھر کو ساکت ہو گیا۔

"ا۔ اچھا۔" شیم نے چائے کا کپ بنا کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا جو اچانک ہی خاموش ہو گیا تھا۔

"ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے صاحب جی۔" اسے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا دیکھ کر وہ دھیرے سے بولی تو سیف نے اک گہری سانس لیتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"کتنا عرصہ کام کیا ہے تم نے وہاں؟" اس نے ملازمہ کی طرف دیکھا۔

"ہماری تو ساری عمر ہی حویلی میں آتے جاتے گزری ہے جی۔ یہ تو احمد کی سرکاری ملازمت کی وجہ سے مجھے اس کے ساتھ یہاں آنا پڑا ہے۔" اس

نے اپنے شوہر کا نام لیا تو سیف نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کپ پیچے رکھ دیا۔

"کون کون ہوتا ہے حویلی میں؟"

"وڈے شاہ صاحب کا تو کافی سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اب ان کے بیٹے، پوتے پوتریاں (پوتے پوتیاں) اور بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔" وہ روانی سے بولی۔ سیف شخص ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ کمرے میں ایک بل کو خاموشی چھا گئی۔

"شاہ صاحب کے سارے بیٹے شادی شدہ ہیں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے اگلا سوال کیا تو شیم نے قدرے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا انداز سیف کو مسکرانے پہ مجبور کر گیا۔

"فکرمات کردہیوں ہی پوچھ رہا ہوں۔" اور شیم بے چاری اپنی چوری پکڑی جانے پہ شرمندہ ہو گئی۔

"جی جی دونوں بیٹے شادی شدہ ہیں بس ایک بیٹی رہ گئی ہیں۔" وہ خفت زدہ سی جلدی سے بولی تو سیف لب دبائے نظریں جھکا گیا۔

"یہ سب چیزیں اٹھالو۔ میں صرف جائے لوں گا۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے کپ اٹھا لیا تو شیم خاموشی سے میز سمیٹنے لگی حالانکہ تھوڑی دیر پہلے اس نے صاحب جی کو آلیٹ کی پلیٹ اٹھاتے دیکھا تھا مگر وہ کیا کہہ سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنا ڈالٹ، موبائل اور سن گلاسز لیے باہر پورچ میں آیا تو ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔

"میں آج خود ڈرائیور کروں گا رفاقت۔" اس کی بات پہ ڈرائیور نے چابی اس کے حوالے کر دی تھی۔ سیف نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور اگلے ہی لمحے کھلے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس نے نیند میں بے چینی سے پہلو بدلاتھا۔ مگر اندر پھیلتا عجیب سا احساس بڑھنے لگا تھا، یہاں تک

کہ وہ سینے پہ ہاتھ رکھے ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ اس گھبراہٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے بستر سے باہر نکل آئی تھی۔ کھڑکی سے پردے ہٹاتے ہوئے اس نے گہرے گہرے سانس لیے تھے۔ چند لمحوں بعد گھبراہٹ میں کچھ کی ہوئی تو وہ وہیں کھڑی ہو کے خود کو پرسکون کرنے لگی۔ اس کی بے چین نگاہیں ارد گرد سے ہونی نیچے لان کے وسط میں رکھی کرسیوں پہ پڑیں تو جیسے ٹھہری گئیں۔ اس کے پیارے بابا صاحب کا پر نور چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آن ٹھہرا، جو روزِ جمع یہاں بیٹھ کے اخبار پڑھا کرتے تھے۔

وہ بڑی سی چادر میں اپنا وجود چھپائے نیچے چلی آئی جہاں ہال میں شاہ بی بی کے ساتھ اماں جان بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیک السلام۔" دونوں خواتین نے بیک وقت زرباب کی طرف دیکھا اور اسے چادر میں لپٹا دیکھ کے دونوں ہی چونک گئیں۔

"خیر تو ہے بیٹا؟" چادر کیوں اوڑھ رکھی ہے؟ "بی بی نور بانو کی آنکھوں میں پریشانی درآئی۔

"اماں جان! میں قبرستان جانا چاہتی ہوں۔" وہ دھیرے سے بولتی ان کے قریب آ بیٹھی تو شاہ بی بی نے متفکر انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا ہوا میری جان! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ان کے پیارے پوچھنے پہ اس کا دل بھرا آیا۔

"پتا نہیں کیوں لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولی تو اس کا رونا دونوں کو پریشان کر گیا۔ شاہ بی بی نے بے اختیار اس کی پشت سہلاتے ہوئے بھادج کی طرف دیکھا

جن کا اپنا چہرہ یک لخت اتر گیا تھا۔

"اچھا" میں ابھی کرم دین سے کہتی ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔" ان کے اٹھنے پہ زرباب نے

اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"آپ چلیں گی؟" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ تم تنہائی میں جی بھر کے اپنے بابا صاحب سے باتیں کر لیتا۔" انھوں نے پیار سے اس کا چہرہ چھوا۔

وہ جانتی تھیں کہ زرباب آج کل کتنی الجھی ہوئی تھی۔ ان کی بات پہ وہ اک گہری سانس لیتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور پھر فضلی کو آواز دیتی باہر نکل آتی تھی جہاں شاہ بی بی کے حکم پہ کرم دین چاچا اس کے لیے گاڑی نکلتا رہے تھے۔ وہ بے تابی سے چلتی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

☆☆☆

سرمئی بادلوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ ٹھنڈا ہوا زور و شور سے نورا والاں پہ برسنے کو تیار تھیں۔

"رب خیر کرے۔ شاہ جی سفر پہ گئے ہوئے ہیں۔" موسم کے بدلتے تیور بی بی نور بانو کو پریشان کر گئے تھے۔

وقت زرباب اور صدف داغلی دروازہ کھول کے تیزی سے باہر آئی تھیں۔

"اماں جان، مصطفیٰ سے کہہ کے ہمیں پھیلے باغ میں جھولا ڈلوادیں۔" زرباب کی فرمائش پہ بی بی نور بانو نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ پھل گیا ہو۔

"مت تو نہیں ماری گی؟ میں اس موسم میں اس غریب کو کہاں باندھ (بندر) بنا کے درخت پہ چڑھا دوں۔" انھوں بیٹی کو گھر کا تو زرباب کی چنگل ہنسی بے اختیار کھٹک اٹھی۔

"وہ بنا بنایا "باندھ" ہے اماں جان، چاہے درخت پہ چڑھے یا نہ چڑھے۔" اس نے ہنستے ہوئے صدف کو دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بی بی نور بانو نے بمشکل تمام اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹتے ہوئے آنکھیں نکالیں۔  
 "کس طرح زبان چلنے لگی ہے۔" مگر وہ ان کے گھورنے کی پرواہ کیے بنا برآمدے کی سیڑھیاں پھلانگ گئی۔  
 "میں خود اس سے کہتی ہوں۔"

"خبردار زرناب! انھوں نے بے اختیار اسے روکا مگر وہ ہنستی ہوئی یہ جاوہ جا۔ اور پھر اگلے پندرہ منٹ میں مصطفیٰ موٹا سا ہاتھ میں لیے زرناب بی بی کے حکم پہ، ہوا کے دوش پر جموٹے آم کے درخت پہ چڑھا اپنی ہڈیوں کی خیر کی دعا مانگ رہا تھا۔  
 "اُس والی شاخ پہ ڈالو رہی۔ وہ زیادہ اونچی ہے۔" اسے ایک قریبی شاخ پہ رسی اچھالتے دیکھ کر زرناب نے ناقدانہ نظروں سے درخت کا جائزہ لیا تو مصطفیٰ نے رک کر اسے گھورا۔

"میں نہیں اتنی اوپر چڑھنے والا۔ اتنی تیز ہوا ہے یہاں۔"

"جان کتنی پیاری ہے تمہیں چلغوزے۔" زرناب کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی۔

"کیوں آپ کو نہیں ہے کیا؟" وہ تپ کر بولا تو اس کے جلمے انداز پہ زرناب ہنسی چلی گئی۔

ڈولتے پھولوں کے پس منظر میں اس کی ہنسی کا جلت رنگ مصطفیٰ عبداللہ کو ایک لمحے کے لیے مبہوت کر گیا۔ وہ ایک تک اسے دیکھے چلا گیا۔ اس کا آچل اور زلفیں ہوا کے دوش پر اڑتی اسے کسی اپسرا کا روپ دے رہی تھیں۔ اسی لمحے بادل زور سے گرجے تھے اور کن کن برستی بوندیں تیز ہو گئی تھیں۔ زرناب نے گھبرا کے اسے پکارا تھا۔  
 "مصطفیٰ! نیچے آ جاؤ۔"

"اور آپ کا جھولا؟" اس نے پلٹ کر نیچے دیکھا تھا۔

"چھوڑو اسے۔" اس کی بات پہ مصطفیٰ نے

ہاتھ میں پکڑی رسی نیچے چھوڑ دی تھی اور احتیاط سے واپس اترنے لگا تھا۔ مگر بارش اتنی تیز ہو گئی تھی کہ اس کے لیے اپنے قدم جمانا حقیقتاً مشکل ہو گیا تھا۔ زرناب بھینکنے کی پرواہ کیے بنا پریشانی سے منہ اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اپنی غلطی کا احساس اسے بہت شدت سے ہوا تھا۔

"آرام سے۔" اسے چند فٹ کے فاصلے پہ آتا دیکھ کے زرناب نے سکون کا سانس لیا تھا۔  
 "میرا ہاتھ پکڑ لو۔" وہ سرعت سے آگے بڑھی تھی۔ اس کا یہ عمل قطعی غیر ارادی تھا مصطفیٰ نے بھی بے دھیانی میں اس کا ہاتھ ہوا ہاتھ تھا تھا اور چھلانگ لگا دی تھی۔ گیلی گھاس پہ اس کا پاؤں صبح سے نہ پڑا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ زرناب نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو تھاما۔  
 "تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے مصطفیٰ کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

تب ہی معصومہ، راہداری کا دروازہ کھول کے اپنے دھیان میں پھلے برآمدے میں آئی تھیں لیکن جو بھی ان کی نظر سامنے کو اٹھی وہ اپنی جگہ پہ ساکت رہ گئی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" وہ اتنی زور سے چلائیں تو دونوں اس اچانک افاد پہ بری طرح حواس باختہ ہو گئے۔

"کچھ نہیں بھر جاتی۔ میں جھولا ڈالوا رہی تھی۔" سرعت سے مصطفیٰ کا بازو چھوڑ کے وہ پیچھے ہٹی تو معصومہ اسے شعلے برساتی نگاہوں سے گھورتی دندنا تی ہوئی ان کے سر پہ آ پہنچیں۔

"اس کی بازو پکڑ کے تم جھولا ڈالو رہی تھی یا جھول رہی تھیں؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولیں تو زرناب مارے شرمندگی کے زمین میں گر گئی۔

"بھر جاتی، یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟" اس کا چہرہ احساس توہین سے جل اٹھا تھا۔ جبکہ مصطفیٰ کی کانٹو بدن میں لہو کیس والی کیفیت

ہو گئی تھی۔

"بی بی صاحبہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا پاؤں۔۔۔"

"چپ کر اوئے!" معصومہ نے حقارت سے اس کی بات کاٹ ڈالی۔ "میں تجھ جیسے بد ذاتوں کی نیت اچھی طرح جانتی ہوں۔ موقع پرست کہیں کے دفع ہو یہاں سے!"

زرناب شاہ کی آنکھوں سے آنسو قطروں کی صورت بہہ نکلے تھے۔ مصطفیٰ کا خون اس کی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ اس درجہ ذلیل کرتا انداز اور ایسے گھٹیا الزام پہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس عورت کا منہ توڑ دے۔ ایک کھوتی نظر معصومہ شاہ یہ ڈالتے ہوئے اس نے زرناب کی آنسوؤں بھری آنکھوں کی طرف دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

اس کے جاتے ہی معصومہ کی توپوں کا رخ پوری طرح زرناب کی طرف ہو گیا تھا۔ جو بے آواز دور رہی تھی۔

"بزارو نا آ رہا ہے اپنے اس گئے کے لیے؟" ان کے استہزاء پہ انداز پہ اس کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ ایک جھکے سے ہٹتی تھی اور آگے بڑھتی تھی لیکن اگلے ہی پل اس کی کلائی معصومہ کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔

"اپنی جوانی سنبھالو بی بی، ورنہ تمہارے کروت تمہارے باپ بھائیوں تک پہنچانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی!" کاٹ دار لہجے میں اپنی بات مکمل کرتی وہ اس کا ہاتھ جھک کر اندر کی جانب بڑھ گئی تھیں اور زرناب چند لمحوں کی بے یقینی کے بعد دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

☆☆☆

سیف علی جنگ کی گاڑی دھول اڑاتی

قبرستان کے سامنے آرکی تو وہاں کا چوکیدار ایسا انجان چہرے کو دیکھ کے اس کے قریب چلا آیا، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ ان کے علاقے کا نیا آے ایس بی ہے تو وہ بڑی خوش اخلاقی سے بولا۔

"بسم اللہ جی۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی سرکار تھاڑے نال مل کے۔" (آپ سے مل کے بہت خوشی ہوئی سرکار) اس نے نیاز مندانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھاما۔ سیف نے مسکراتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟" وہ آگے بڑھا تو نظر درخت کے نیچے کھڑی پراڈوسے جا گرائی۔

"سفید جو ملی دی سرکار۔۔۔۔۔ بی بی صاحب ہوراں آئے نے۔" (حویلی کی سرکار۔۔۔۔۔ بی بی صاحبہ آئی ہوئی ہیں) اس کے جواب پہ سیف لہجے بھر کو مضحکا اور پھر اثبات میں سر ہلاتا اندر کی جانب چلنے لگا۔ ناچار گامے چوکیدار کو بھی اس کے ساتھ چلنا پڑا۔

"صاحب جی تسی اتھے (قبرستان) کس طرح تشریف لیائے او۔ میرا مطلب اے کوئی عزیز رشتے دار۔۔۔" (صاحب جی آپ یہاں کیسے تشریف لائے ہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی عزیز رشتے دار۔۔۔) وہ جھجک کے چپ ہوا تو سیف نے اک گہری سانس لی۔  
 "نہیں۔ میں یہاں شاہ صاحب کے مزار پہ فاتحہ کے لیے آیا ہوں۔"

"اوا چھا اچھا۔ یعنی تسی وی او ناں دے عقیدت منداں چوں او۔" (یعنی آپ بھی ان کے عقیدت مندوں میں سے ہیں) وہ خوش ہوا۔

"لیکن تانوں تھوڑا انتظار کرنا پے گا۔ اندر بی بی صاحب نے۔" وہ اسے لیے پتیل کے گھنے پیڑ تلے لے آیا، جہاں چار پانی بچھی تھی۔ "تسی تشریف رکھو۔ میں تھاڑے واسطے لی لے کے آنا آں۔" سیف کے منع کرنے کے باوجود وہ بصد



اصرار اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا تو اس نے دور نظر آتے گنبد کی طرف دیکھا۔ یقیناً یہی شاہ صاحب کا مزار تھا۔ اس نے رک کر چند لمحوں تک چوکیدار کا انتظار کیا مگر جب وہ نہیں آیا تو وہ خود ہی اس طرف چل پڑا۔

ارد گرد اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ "شاید حویلی والے چلے گئے ہوں۔" یہی سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مزار کا خراب دار دروازہ اس کے سامنے آ موجود ہوا۔ دگر فنی سے اس آخری آرام گاہ پہ نظر ڈالتے ہوئے اس نے اپنے پاؤں پشادری چپل کی قید سے آزاد کیے اور سفید ماربل کے فرش پہ قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ لیکن مزار کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ ہال کے وسط میں نیچے زمین پہ کالی چادر میں لپٹا ایک نسوانی وجود، اپنی پیشانی ہٹھوں پہ ٹکائے، ارد گرد سے بے نیاز بیٹھا تھا۔

"کون ہیں آپ؟ اور اندر کیسے آئے ہیں؟" اسے دیکھ کر ایک طرف بیٹھی فضلی سرعت سے اٹھی تھی۔ اس کی آواز سے زرناب بھی جیسے خود میں لوٹ آئی تھی۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے دروازے کی سمت دیکھا اور سیف علی جنگ پلکیں جھپکاتا بھول گیا تھا۔

"باہر جائیں! دیکھ نہیں رہے بی بی صاحبہ بیٹھی ہیں۔" فضلی تیوریاں چڑھائے اس کی جانب بڑھی تھی۔ اسے ایک ٹک اپنی جانب تکتا دیکھ کر زرناب نے ناگواری سے رخ موڑ لیا تھا۔

"میں آپ سے بات کر رہی ہوں!" فضلی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی لیکن سیف تو جیسے کسی خواب کی سی کیفیت میں تھا۔ "میں ابھی مردوں کو بلوایا ہوں۔ شاید آپ کو پتا نہیں کہ یہ بختیار شاہ کی بہن ہیں۔"

"چھوڑو فضلی! زرناب کی آواز پہ نفیلت نے

تیزی سے اس کی طرف دیکھا جو دروازے کی جانب پشت کیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اپنا چہرہ نقاب کی اوٹ میں کرتے ہوئے وہ چلتی اور سیف کی طرف ایک نگاہ غلط ڈالے بنا مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی دروازے کی جانب آئی۔ سیف علی جنگ کو اپنی دھڑکنوں میں ارتعاش سا برپا ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"راستے سے نہیں۔" اس سے قدرے فاصلے پر رکتے ہوئے اس نے ساٹ لہجے میں کہا۔ سیف کی نظر اس کی جھکی پلکوں پہ ٹھہری گئیں۔

"میں نے کہا راستے سے نہیں!" غصے سے اپنی بات دہراتے ہوئے زرناب نے ایک پل کو اپنی شعلے برساتی آنکھیں اس کی نیلی آنکھوں میں ڈال دیں تو سیف علی کے لیے اپنی خوش بختی پہ یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ خود کو سنبھالتا ہوا وہ ایک طرف کو ہوا تو زرناب لب بھیسے، ہوا کے جھوکے کی طرح اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئی۔ اور پیچھے وہ محرزہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ زرناب چلتی ہوئی اس کی نظروں سے غائب ہو گئی۔

☆☆☆

معصومہ کی تذلیل نے اس کے اندر جو آگ بھڑکانی تھی، اس کی تپش سے اس کا چہرہ انگارے کی طرح دھبہ رہا تھا۔

اپنا غبار دار گردو کی چیزوں پہ نکال لینے کے بعد جب دماغ تھوڑا ٹھنڈا ہوا تو اسے زرناب کا خیال آیا۔ کتنے برے طریقے سے رو رہی تھی وہ، اور لگتی گری ہوئی بات معصومہ نے ان دونوں کے حوالے سے کی تھی۔ وہ تو زرناب شاہ کے سامنے نگاہ اٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ زرناب سے اس کی محبت ایک ایسی اٹل حقیقت تھی جسے معصومی نے بھی جھٹلانے کی کوشش نہیں کی تھی مگر جسے پانے کا خواب اس نے اس ناگہی کی عمر میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

زرناب شاہ کی عزت وہ خود پہ فرض سمجھتا تھا، وہ

اس ہستی کی بیٹی تھی جنھوں نے اسے دین و دنیا کی بھلائی سے آشنا کروایا تھا۔ جو اس کے صرف محسن ہی نہیں بلکہ اس کے روحانی باپ بھی تھے۔ پھر بھلا وہ ان کی عزت کی طرف نگاہ اٹھانے کی گستاخی کیسے کر سکتا تھا؟ وہ اپنے اور زرناب کے مقام کو بہ خوبی سمجھتا تھا اسی لیے آج معصومہ کے ریکٹ الزام نے اسے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔ وہ اس حد تک شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی آنکھیں مارے بے بسی کے بھر آئی تھیں۔

ادھر زرناب بھی اپنے کمرے میں بیٹھی زار و زار رو رہی تھی۔ صدف اور شفق اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھیں۔ اور بالآخر جا کے شاہ بی بی کو بلا لائی تھیں جو اسے یوں آنسو بہاتا دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

"زری، کیا ہوا بیٹا؟" اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے انھوں نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو وہ ان کے سینے سے جا لگی۔

"بس۔ بس میرا بچہ۔" وہ اسے خود میں سینے سے لگائے لگیں۔ "کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" انھوں نے صدف اور شفق کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں بی بی، یہ تو مصطفیٰ سے پیچھے جھولا ڈلوا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اندر آئی تو رو رہی تھی۔" صدف کی بات پہ شاہ بی بی نے اسے زبردستی خود سے الگ کیا۔

"مصطفیٰ سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟" انھوں نے اس کی ٹھوڑی اوپر کی تو پل بھر کی ہچکچاہٹ کے بعد زرناب کا سر اثبات میں ہل گیا۔

وہ معصومہ کی آخری دھمکی سے اتنا خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اسے لگ رہا تھا کہ اگر اس نے معصومہ کی شکایت کسی سے کی تو وہ بدلے میں یہ جھوٹا قصہ سب کو سنا دے گی جس کے بعد کا تو محض تصور ہی اس کے لیے سواہن روح تھا۔

"حد ہوتی ہے۔" شاہ بی بی نے مسکراتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔ صدف اور شفق نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

"چلو اب چل کر کھانا کھا لیں۔۔۔ باگل نہ ہو تو۔" انھوں نے زبردستی اسے اٹھایا تو وہ پچھپی کے ساتھ چلتی نیچے چلی آئی جہاں ہال میں دسترخوان پہ معمول کے مطابق دوپہر کے اس وقت صرف گھر کی خواتین ہی تھیں۔ معصومہ کو خاموشی سے کھانا کھاتا دیکھ کر زرناب نے بے اختیار سکون کا سانس لیا تھا۔

اس روز شاہ صاحب کی شہر سے واپسی رات گئے ہوئی تھی۔ اگلی صبح وہ بے حد طول سے تھے۔ گھر میں ایک صرف شاہ بی بی تھیں جو اپنے بھائی کی کیفیت سے واقف تھیں۔ اپنی جدی پشتی گدی کو آگے نہ بڑھانے کا فیصلہ، کتنا بڑا اور تکلیف دہ تھا! یہ کوثر شاہ سے بہتر بھلا کون جان سکتا تھا، جن کی آنکھ پیروں کے گھرانے میں کھلی تھی اور جنھوں نے ایک زمانے کو

ادارہ خواتین کی

سچی بنگر کی دانی

رحیمہ جمیل

قیمت - 350/- روپے

اپنے باپ دادا کی عزت کرتے دیکھا تھا۔ مگر پیر نظر حسین شاہ بھی اپنی جگہ پہ بالکل درست تھے۔ اس نام مقام کی حرمت پہ انگلیاں اٹھوانے سے بہتر تھا کہ وہ اس سلسلے کو باعزت طریقے سے ختم کر دیتے تاکہ ان کے گھرانے کے عقیدت مند جب بھی ان کے بزرگوں کا نام لیں تو کم از کم اسی ادب اور محبت سے لیں جیسا کہ وہ ہمیشہ سے لیتے آئے تھے۔

ابھی بھی وہ دونوں بہن بھائی اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ جب ملازمہ نے آکر بڑی حویلی والوں کی آمد کا بتایا۔ خود کو سنبھالتے شاہ صاحب حجرے سے نکل کر ہال میں آئے تو آگے پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکروں سے لدی اپنی بھابھی، بھتیجیوں اور ان کی بہوؤں کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئے۔ ایسی ہی حیرت بی بی نور بانو، بی بی حوراء اور صبور شاہ کے چہروں پر بھی تھی، جو آج صبح ہی شہر سے آیا تھا۔ ایک صرف معصومہ اور بختیار شاہ تھے جن کے

کی آنکھوں میں ایسا کوئی حیرت بھرا تاثر نہ تھا۔ "خیر تو ہے بھرجانی، یہ آپ اتنی چیزیں کیوں لے کر آئی ہیں؟" سلام دعا کے بعد پیر نظر حسین شاہ نے نشست سنبھالی تو اسے ساتھ ساتھ باقی سب کے دل کی بات بھی پوچھ ڈالی۔ بی بی نرجس کے لیوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم سے اپنی گھر کی خوشی لینے آئی ہوں میرے دو۔ زرناب کو میرے ہاشم کی دہن بنا کے میرے آگن میں روشنی کر دو نظر۔ تم جانتے ہو یہ صرف میری ہی نہیں تمہارے مرحوم بھائی کی بھی خواہش تھی۔" رسان سے کہتے ہوئے انھوں نے شاہ صاحب کی طرف دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

بی بی نور بانو نے اڑی رنگت کے ساتھ شاہ بی بی کو دیکھا جو خود بھی لب بھینچے بڑی بھابھی کو تک رہی تھیں۔ اپنی معصوم سی زرناب کے لیے، بڑی

حویلی کا تنگ اور سازشوں سے بھرا ماحول ان میں سے کسی کو بھی پسند نہ تھا۔ اوپر سے معصومہ جیسی تیز طرار کے ساتھ وٹے ٹٹے کے رشتے میں بندھنا، ایک ایسا عذاب تھا جس میں وہ کسی قیمت پہ زرناب کو چھو نہ سکتی تھیں۔

"معافی چاہتا ہوں بھرجانی مگر میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد پیر نظر حسین شاہ کی ٹھہری ہوئی آواز ہال میں ابھری تو تمام حاضرین محفل گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ "کیوں نہیں کر سکتے؟ آخر کس چیز کی کمی ہے میرے ہاشم میں؟ کیا وہ بڑھا لکھا نہیں، صاحب جانیدار نہیں یا تمہارا خون نہیں؟" بی بی نرجس نے بڑی مشکل سے اپنی ناگواری پہ قابو پایا تھا۔

"وہ صاحب کردار نہیں۔" شاہ صاحب سرد لہجے میں بولے تو سب چپ کے چپ رہ گئے۔

"میں آج تک صرف اس لیے خاموش تھا کہ پاتیں صرف سننے اور سنانے کی حد تک محدود تھیں۔ لیکن کل جس طرح میں نے اس لڑکے کو بے حجابانہ لڑکیوں کے ساتھ سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے دیکھا ہے میرے لیے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ ہاشم کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں۔"

"ہاں تو اس میں کون سی غلط بات ہے۔" بی بی نرجس شپٹا کر سنھلیں۔ "جب شہری پوینڈر سٹیوں میں لڑکیوں کے ساتھ پڑھیں گے تو نال (ایک ساتھ) اٹھنا بیٹھنا ہو گا۔"

"اور اس کی شراب نوشی کے بارے میں کیا کہیں گی بھرجانی؟" انھوں نے سپاٹ نظروں سے بی بی کی طرف دیکھا تو وہ ساکت رہ گئیں۔ پیر نظر حسین شاہ یقیناً اتنے بے خبر نہیں تھے جتنا کہ وہ انھیں سمجھنے کی غلطی کر بیٹھی تھیں۔

"یہ ہمارے ہاشم پہ الزام ہے جا چا

جی۔" معصومہ جلیلا کر بولیں تو شاہ صاحب کی باز عجب نظریں بہو کے چہرے پر جا ٹھہریں، جو نجانے کیوں ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے نظریں چرا گئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کے پلے پیچے ان کے سامنے جھوٹ بول رہے تھے یہ مقام افسوس نہیں تو اور کیا تھا۔

"چلو الزام ہی سہی۔ لیکن میں زرناب کے لیے ہاشم کا رشتہ قبول نہیں کر سکتا۔" انھوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں گفتگو تمام کی۔

"تے فیر دی کتھے دیائیں گا نظر؟" (تو پھر بیٹی کہاں بیا ہو گے نظر؟) بی بی نرجس نے استہزاء سے انداز میں شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔ "اگر میرا ہاشم برا ہے تو پھر تو خاندان کے سارے لڑکوں میں کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ تم کیا بیٹی کے لیے خاندان سے باہر رشتہ ڈھونڈو گے؟" انھوں نے کاٹ دار لہجے میں سوال کیا۔

"کیوں نہیں۔ اگر غیر خاندان سے کسی دین دار اور سلجھے ہوئے لڑکے کا رشتہ آئے گا تو میں اسے ضرور قبول کروں گا۔" وہ بنا کسی پس و پیش کے بولے تو سب کے منہ کھل گئے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا صاحب؟" بختیار شاہ نے ناگواری سے باپ کی جانب دیکھا۔

"وہی جو تیرے دین ہے۔ یہ ذات برادری اور خاندان میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ میرے لیے اہم ہیں تو شرافت اور نجابت۔ پھر چاہے وہ اہل میں ملے یا غیروں میں! انھوں نے بیٹے کی طرف دیکھا تو معصومہ کی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔

"بس تو پھر غیروں میں شادی کی تیاری کریں چا چا جی کیونکہ آپ کا نیک داماد تو اسی حویلی میں ہی ہے۔" ہونٹوں پہ کاٹ دار مسکراہٹ لیے، وہ سلکتے لہجے میں بولیں تو ایک پل کے لیے سب کو ساپ

سو گھ گیا۔ "کیا ایک رہی ہو!" بختیار شاہ نے بیوی کو آنکھیں دکھائیں۔ "بک نہیں رہی، آپ لوگوں کی آنکھوں پر پڑا پردہ اٹھا رہی ہوں۔ دوسروں کے کردار پہ بات کرنا تو بہت آسان ہے، اب ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانک لیں۔"

"اس فضول گوئی کا مقصد؟" شاہ صاحب کی سرد آواز اچانک گوئی تو بی بی نرجس نے پریشان ہو کر بیٹی کو دیکھا جو نجانے کیا اول نول بولے جا رہی تھی۔

"یہی کہ جن کے اپنے منہ کھولے ہوں انھیں دوسروں پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ آپ نے جس بیٹی کے لیے شرافت کا بہت اونچا معیار قائم کر رکھا ہے وہ تو نجانے کب سے آپ کی ناک کے نیچے اس حویلی کے لیے ایک "دیندار" اور "پرہیزگار" داماد ڈھونڈے بیٹھی ہے!" معصومہ نے زہریلے انداز میں

"دیندار" اور "پرہیزگار" پہ زور دیا تو پیر نظر حسین شاہ کو لگا جیسے زمین ان کے قدموں تلے سے ٹھک گئی ہو۔ الفاظ تھے یا کوئی ہم۔ سفید حویلی والوں کو آسمان اپنے سر پہ گرتا محسوس ہوا تھا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا خبیث عورت!" بختیار شاہ کی دھاڑ نے درود پوار کو لرزاکے رکھ دیا تھا۔ وہ جھجکی کی سی تیزی سے اٹھے اور معصومہ پہ پل پڑے۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

سوانحی کس شخصیت

ماڈل ----- حمیرا مغل  
میک اپ --- روز بیوٹی پارلر  
فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا

# رشتے کا

تیز برقی بارش اور ساعتوں میں کسی کے تیز چہیتے جیسے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفتدی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفتدی اور سہیل آفتدی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفتدی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفتدی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہر ماہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہر ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفتدی، آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفتدی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفتدی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفتدی کو چھوٹے بھائی وقار آفتدی کی حمایت اور آغا خان کی مخالفت کی وجہ سے گھیر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں۔ تانی جان، مبین آفتدی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفتدی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، ان کی بیوی شہرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفتدی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو جانے کی وجہ سے مہر ماہ کا رابطہ نمبر سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ وقار آفتدی اور زرنگار آفتدی کی محبت اور آفتدی کی بے بسی کے بارے میں سوچتی رہ جاتی ہے۔

وہ موحد کے آفس میں رابطہ کر کے اس سے ملنے کا کہتی ہے وہ گھر آ کر بات کرنے کا کہتا ہے۔ وہ اس کے آفس پہنچ کر اس کے سامنے نمبر کی داستان سن کر اس سے ہمدردی محسوس کرنے کا کہتی ہے۔ موحد کہتا ہے کہ اس کی پوری کہانی سن کر فیصلہ کرنا کہ وہ کس چیز کا حق دار ہے۔ سزا یا معافی۔

ملاح نے ڈرائیور کو کچھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ اور کبیر کے لیے اس کے دل میں شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ کبیر اسے کالج سے واپسی پر لینے آتا ہے اور اپنے گھر لے جا کر اسے اپنی ماں بہنوں سے ملواتا ہے۔ نمبر فون پر مہر ماہ کو اپنی اوصوری کہانی سنا تا ہے۔ آغا جان مہر ماہ سے بات کرتے ہیں۔ اور نمبر سے نکاح قائم رکھنے پر اسے سخت سنا تے ہیں۔ وہ نمبر کی حمایت کرتی ہے تو وہ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ مہر ماہ فون پر نمبر سے کہتی ہے کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ ہائی جبر لیتا ہے۔ ملاح، موحد سے مدد مانگتی ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی رشتہ لاتا ہے۔ ملاح ناراض ہو جاتی ہے۔

مہر ماہ، نمبر آفتدی سے ملنے کبیر کے ساتھ جاتی ہے اور اسے باہر انتظار کرنے کا کہہ کر ریڈیو نمبر کے اندر چلی جاتی ہے پہلے سے کب کی ہوئی ٹیل پر اس کا انتظار کرتی ہے۔ کہ اچانک ایک آواز پر چونک جاتی ہے۔

زرنگار کی کہانی جان کر مہر ماہ آفتدی ہاؤس والوں کی بے بسی اور کبیر پر دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ موحد کو بلا کر اس سے بات کرتی ہے۔

موحد ملاح کے لیے رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔ تو ملاح بہت افسردہ ہوتی ہے۔ وہ کبیر کو چاہتی ہے۔ موحد اسے بتاتا ہے کہ کبیر گھر چھوڑ گیا ہے اور اس نے آفس سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات بھی چرا لیے ہیں۔  
نمیر آفندی مہر ماہ کو راستے میں ملتا ہے۔ وہ اسے جھڑک کر آگے بڑھ جاتی ہے۔  
موحد ملاح کے لیے جو رشتہ لاتا ہے۔ ان کی شان و شوکت دیکھ کر سائرہ چچی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ جبکہ ملاح شدید پریشان ہے۔

## باتیں ویں قندیل

نجانے کتنے کلکڑوں میں بنا ہوں  
میں اپنے ہاتھ سے خود گر پڑا ہوں

مقابل ہے مرے سارا زمانہ  
میں اپنے ساتھ بس تنہا کھڑا ہوں

مٹانے کو مجھے سب مر رہے ہیں  
سو یوں ثابت ہوا، سب سے بڑا ہوں

نہ کوئی ساتھ تھا، نہ ساتھ ہے اب  
اکیلا ہوں، اکیلا ہی ڈٹا ہوں

کوئی بتلائے کیا بس میں غلط ہوں  
یا بس حق بات پر اک میں اڑا ہوں

بنے گی کیا مری پھر ظلمتوں سے  
دیا تھا، بن کے سورج میں جلا ہوں

قیامت کیا ہے مجھ کو نہ بتا یہ  
میں ایسے ہی حادثوں میں پلا ہوں

(انتہا ابرک)

آفندی ہاؤس پر غیض و غضب کی فضا طاری تھی۔ معزز مہمانوں کو چائے سے تواضع کرنے کے بعد ان کے ساز و سامان سمیت واپس کر دیا گیا اور تانی جان نے کوئی خیال کیے بنا مہمان خواتین کے نگلنے ہی شرہ چچی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

”یہ کیا تھا شرہ..... کس بات کا بدلہ لیا ہے موحد نے ہم سے..... میری بیٹی کے لیے یہ اعلیٰ رشتہ لایا ہے وہ؟“ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے شرہ نے اطمینان سے انہیں دیکھا۔

”جس گھر میں میری ہو، وہاں پتھر آیا ہی کرتے ہیں بھابی! اور یہ پتھر کسی مخصوص قسم کے نہیں ہوتے۔ ہر طرح کا پتھر شامل ہوتا ہے ان میں“

”پر یہ بھی تو دیکھو شرہ! کہ ہمارے ہی گھر کے ڈرائیور کا رشتہ ہماری چچی کے لیے لایا ہے وہ؟“ سائرہ چچی کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ رہے تھے مگر بظاہر بہت دردمندی سے کہا۔

”تو ڈرائیور کیا انسان نہیں ہوتے اور کبیر کون سا آپ لوگوں کا زرخیز تھا؟“ شرہ نے انہیں نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔

”جس شان سے کبیر کی بہنیں ملاح کا ہاتھ مانگنے آئی تھیں ویسے تو ہماری کسی بھی بیٹی کی قسمت نہیں نکلی۔ صاف لگ رہا ہے کہ کبیر الحمد للہ بہت اچھے حالوں میں ہے۔“

”تمہارا بیٹا جو بل چکا ہے اس کے ساتھ۔ حالات تو اچھے ہونے ہی تھے یہ کروڑوں کی جائیداد کے کاغذات، باسی روٹیاں سمجھ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ اس کی ہمت تو بڑھنا ہی تھی نا تمہاری کوئی بیٹی ہوتی تو میں دیکھتی کیسے ان چوڑے چماروں کے رشتے اکٹھے کرتیں تم“ تانی جان کا چہرہ خطرناک حد تک لال ہو رہا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے سے تو ملاح کا چہرہ ہی نہ ہٹتا تھا۔

”ہماری ہونے والی بھابی تو اس قابل ہیں کہ یہ سب چیزیں ان پر وادی جائیں“ ملاح جو مہر ماہ کے ساتھ آتے ہوئے بس مرنے والی کیفیت میں تھی یہ آواز سن کر بے تحاشا چوگی۔ اور نگاہ اٹھا کر لڑکے کی بہن کو دیکھا تو اعصاب کو شدید قسم کا جھٹکا لگا۔

”ہماری بہت سی زمینیں ہیں آئی۔ بہت بڑا آبائی گھر ہے۔ اور ابھی پچھلے ماہ یہاں شہر میں نیا گھر لیا ہے.....“ وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ ملاح کا ذہن لمحہ بھر کو خالی ہو گیا۔

(بھابی اپنی بہنوں کے لیے اچھے فیصلے ہی کیا کرتے ہیں) اسے موحد کی بات یاد آئی تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”باقی باتیں چائے کے بعد..... آئیں آپ لوگ“ شرہ نے باتوں کا سلسلہ روک دیا۔ چائے کے ساتھ دیگر ریفریشمنٹ سے پوری میز بھری ہوئی تھی۔

اور ملاح..... اس کا تو دل چاہتا تھا کہ چنگ بن کر ہوا میں اڑنا شروع کر دے۔ اور پھر چائے کے دوران اس نے کبیر کی بہنوں کو آگے بڑھ کر بہت محبت سے ایک ایک چیز پلیٹ میں ڈال کر دی اور بعد اصرار کھلائی اس نے جہاں تانی جان کو حیران کیا وہیں ان کا دل مطمئن بھی ہوا کہ ملاح رشتے والیوں کی چکا چوند سے متاثر ہوئی تھی۔ اب ان کے تو فرشتوں کو بھی آنے والی قیامت کے بارے میں علم نہیں تھا کہ گزشتہ تین دنوں سے ملاح بی بی کے زرد بڑتے کا لپکا ایک دبک کیسے اٹھے۔ مہر ماہ خود ملاح کو دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی کہ زرا دیر کے لیے ہی سہی مگر کم از کم وہ افسردگی کے لمبا دے سے تو نکلی۔

”نام کیا ہے آپ کے بھائی کا..... کیا کام کرتا ہے؟“ تانی جان نے خوش دلی سے بالآخر وہ سوال پوچھ ہی لیا جسے آنے والیاں ابھی تک جان بوجھ کر شاید پیچھے رکھے ہوئے تھیں۔ لمحہ بھر کو ڈانٹنگ روم میں خاموشی پھیل گئی۔ مہر ماہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”آپ اسے ہم سے بھی زیادہ اچھی طرح جانتی ہیں آئی! کبیر خان نام ہے ہمارے بھائی کا۔ اور اللہ

نے اتنا نواز رکھا ہے کہ فی الحال تو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں انہیں، وہ مسکراتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

لوجی۔۔ ایک چھت تو کیا پورا آفندی ہاؤس تائی جان۔ مہرماہ اور سارہ چچی پر گویا آن گرا۔ مہرماہ نے بے یقینی سے ملاح کی طرف دیکھا تو اسے تنہا چہرے کے ساتھ مسکراہٹ دباتے دیکھ کر گہرا سانس بھر کر رہ گئی (تو ملاح کے دل کی خوشی کا نام کبیر خان تھا۔) اور یہ بات موحہ کو دانتھی۔۔۔؟

”کبیر۔۔۔ وہ جو ڈرائیور تھا ہمارا؟“ تائی جان کا چہرہ تاریک پڑا مگر وہ خود کو بدقت اس جھٹکے سے سنبھال کر بولیں تو لہجہ آپوں آپ تھیک آمیز ہو گیا۔ مگر کبیر کی بہنوں کے چہرے پھٹکے نہیں پڑے۔

”جی آئی! لیکن اب الحمد للہ اسے کسی ایسی نوکری کی ضرورت نہیں رہی، وہ مسکرا کر اعتماد سے بولی۔ لیکن دلوں کے تنگ لوگوں کے دماغ اور سوچ بھی اتنی ہی تنگ ہوا کرتی ہے۔ تائی جان نے انہیں سخت سست سنائیں اور ان پر اپنی جاہ و حیثیت اور خاندانی حسب و نسب کے ساتھ ساتھ کبیر اور اس کے خاندان کی بد حالی کو۔۔۔ اچھی طرح واضح کیا۔

”شرم آئی چاہیے تم لوگوں کو۔“ جنھن ایڑیاں اٹھالینے سے ہاتھ بڑھا کر چاند کو نہیں چھو لیا جاتا۔ اس کے لیے قدامت کا ہونا ضروری ہے۔

مہمانوں کو ان کے تحائف سمیت واپسی کا راستہ دکھا کر اب تائی جان فی الحال شرہ چچی کی گوشالی کر رہی تھیں۔ اس کے بعد آغا جان۔ یقیناً موحہ کی کھال کھینچنے والے تھے۔ جو گھر سے تب ہی سے غائب تھا جب مہمان بس آنے ہی والے تھے۔ اور اس کی وجہ اب سب کی سمجھ میں آگئی تھی۔

”امی! اب اپنا وعدہ پورا کریں۔ آپ کا کہا ہوا پروزل منظور کر رہی ہوں میں۔“ ملاح نے ہمت کر کے کہا تو تائی جان کا دل چاہا، اس کے منہ پر پھپھڑ دے ماریں۔

”بکو اس بندر کو ملاح! اس موحہ کے بچے کی کھال تو آغا جان اتاریں گے۔ مجھے تو یہی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے ڈرامہ کیا کھیلایا ہے ہمارے ساتھ۔ اور یہ کبیر۔۔۔ اس قدر خبیث اور بددیانت لکھے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ غضب خدا کا۔ گھر کی عزت پر نظر رکھی ہوئی تھی اس نے۔ اور اس کا ہاتھ نہ جانے دولت کے کس کنویں میں پڑ گیا ہے۔ ہونہ۔۔۔ ہمیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ تملتا تملتا کر بے حال ہو رہی تھیں۔ بھی موحہ پر غصہ آتا تو بھی کبیر پر۔

”پہلے وہ غریب تھا تو اس کے ڈرائیور ہونے پر اعتراض تھا آپ کو۔ اب اگر ہماری حیثیت کا بن کر اس نے رشتہ مانگا ہے تب بھی آپ کو اعتراض ہو رہا ہے، ملاح کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”مجھے کیا پتا تھا وہ ذلیل انسان ایک کمی کارشتہ لے آئے گا ہمارے لیے۔ اور تم بھی ملاح۔۔۔ کچھ تو دیکھ کر گرتیں! انہوں نے تم وغصے سے کہا تھا۔

”لیکن آپ نے کہا تھا کہ۔۔۔“

”بکو اس کی کمی میں نے۔ ہر حال میں انکار ہی کرنا تھا میں نے۔ سنا تم نے، وہ چلا اٹھیں۔

”لیکن یہ رشتہ تو موحہ بھائی کے توسط سے آیا ہے امیری تو اس میں کوئی انوالومنٹ نہیں۔“

”منہ بند رکھو اپنا۔ ایک بار اسے ہمارے ہاتھ تو لگ جانے دو پھر حشر دیکھنا اس ذلیل انسان کا۔ ساری عمر ہمارے ٹکڑوں پر پلا اب چار کاغذات ہاتھ میں کیا آگئے زمینوں کے ہمارے ہی گھر کا داماد بننے کے خواب دیکھنے لگے وہ نامراد“ وہ حقارت سے بولیں۔

”اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ خواب اسے میں نے دکھایا ہے امی!“ وہ ایک دم سے بولی تو صدیقہ بیگم کا جلال عود کر آیا۔ ان کے پھٹنے لگانے ملاح کو ہلادیا۔ مہرماہ تیز لہجے میں بولتی اندر داخل ہوئی۔

”بس کر دیں اب یہ ظلم کی داستانیں لکھنا امی! ماضی سے نہیں تو حال ہی سے صحت پکڑ لیں آپ لوگ!“ اس نے ملاح کا سر شانے سے لگا کر کٹی سے کہا۔ تو وہ سرد مہری سے گویا ہوئیں۔

”تم تو اپنی زبان بند ہی رکھو مہر! ایک بے غیرت تو زبردستی ہمارے خاندان میں داخل ہو گیا تھا۔ دوسرے کو اپنی مرضی سے شامل کر لیں، اتنا دماغ خراب نہیں ہوا ابھی ہمارا۔ لے جاؤ اسے بھی یہاں سے، میرا تو تم دونوں کی شکل دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا ماں باپ کا نام رول کر رکھ دیا ہے تم دونوں نے“

”پتا نہیں ہم کب اس حقیقت کو سمجھیں گے کہ ہمارے اعلا حسب و نسب ہونے میں ہمارا ایسا کوئی کمال نہیں ہوتا کہ ہم باقی سب کو تقویٰ کے بجائے محض اس کے اسٹیشن کی بنیاد پر پرکھنا شروع کر دیں۔“ مہرماہ متاسفانہ نظروں سے ماں کو دیکھ کر سرد لہجے میں کہتی ملاح کو شرہ کے پورشن میں لے گئی۔ تائی جان دکھتا سر لیے بستر پر گری گئیں۔

☆☆☆

موحہ گھر آیا تو مہرماہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ پورچ میں وہ گاڑی سے نیچے اُترا تو ساتھ ہی مہرماہ اس کا بازو تھام کر اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے لان کی کچھلی طرف لے گئی۔

”کیا ہو گیا، کون سی قیامت آگئی ہے؟“ وہ حیران تھا۔

”قیامت ہی سمجھو۔ تم نے جو کام کیا ہے یہ آغا جان اس کے نتیجے میں تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں، مہرماہ نے تنہی سے کہا۔

”ایسا کیا کر دیا ہے میں نے؟“ موحہ نے شانے جھٹکے۔

”تم جانتے تھے کہ یہ رشتہ کبیر کا ہے؟“ مہرماہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تو موحہ نے نرمی سے کہا۔

”اب میں رشتہ لایا ہوں تو ظاہری بات ہے جانتا ہی ہوں گانا۔“

”پھر مجھے تمہیں کیسے پتا چلا۔ ملاح خود تو بتا نہیں سکتی۔ کبیر ہی ہو گا تمہارا ساتھی“ مہرماہ نے طنز کیا۔

”اس پر الزام مت لگاؤ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں پروزل ضرور دیا ہے اس نے میرے کہنے پر۔“

”اب تم یہ سوچ لو کہ آغا جان کے سامنے کیا کہنا ہے جا کر۔ وہ تو تمہاری کھال کھینچنے کو تیار بیٹھے ہیں۔“ مہرماہ نے غلٹ سے کہا۔

”وہ تو خیر میں جانتا ہی تھا لیکن تمہاری اتنی ہمدردی کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟“ اس نے گہری نظروں سے مہرماہ کو دیکھا تو وہ بدکی۔

”شٹ اپ! خبردار جو میرے ساتھ کوئی فضول بات کرنے کی کوشش کی یا اپنے دماغ کو کسی غلط سوچ میں ڈالا، میں صرف انسانی ہمدردی کی وجہ سے تمہیں ہوشیار کر رہی ہوں کہ آغا جان کے پاس جاؤ تو ذہنی تیاری کر کے جانا۔“ وہ نورا رکھائی سے بولی۔

”تم کیا سوچتی ہو اس معاملے میں۔ کیا میں نے کچھ غلط کیا ہے؟“ موحہ نے مہرماہ سے پوچھا تو وہ تھکے ہوئے انداز میں مسکرا دی۔



انسان ہے، خاندانی بھی ہے، میرے خیال میں تو آغا جان کو کوئی خاص اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“ موحّد بے اختیار ہنس کر ادا یا۔

”چلو، یہ بھی اچھی بات ہے۔ کیر کی سپورٹ میں کافی لوگ ہو جائیں گے۔ اس طرح آغا جان کو منانے میں بھی آسانی ہوگی۔“

”کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ تم آغا جان کو نہیں جانتے۔“ مہر ماہ نے اسے ٹوک دیا، وہ جواب اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لمحہ بھر کو رک کر مہر ماہ کی طرف دیکھا اور پتی سے بولا۔

”مجھ سے زیادہ اچھی طرح انہیں کون جان سکتا ہے۔ اس ہمدردی کا شکریہ، مہر ماہ خاموش رہ گئی موحّد دروازہ دھکیلتا اندر داخل ہو گیا تو وہ جیسے حواس میں لوٹی۔ خود کو کوسا۔ صبح سے خود کو سمجھا رہی تھی کہ موحّد سے ہمدردی نہیں کرنی۔ لیکن بار بار خیال آتا کہ آغا جان سے اتنا بڑا پیٹکا اس نے ملاجہ کی خاطر لیا ہے، اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں، تو بے اختیار ہی اسے ہوشیار کرنے کے ارادے سے روک بیٹھی۔ خود سے الجھتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆  
آغا جان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ موحد کو اسی وقت سگسار کر دیں۔  
”تمہارا دماغ خراب لگ رہا ہے ان دنوں مجھے۔ جس وقت تم نے کبیر کو جائیداد کے کاغذات واپس کیے تھے، مجھے اسی وقت پاورٹاری نیسل کروا دینی چاہیے تھی۔“ وہ بے حد ناراضی سے بولے۔  
”تو اب یہ شوق پورا کر لیں۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ موحد نے اثر لیے بغیر کہا تو آغا جان کے تاثرات میں ناگواری اترنے لگی اور لہجے میں پتھر پلانا پکڑا لیا۔  
”کبیر کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا؟“  
”فکر مت کریں حلال کی کمائی ہے اس کی ساری“ وہ مسکرایا۔  
”مجھے بے وقوف مت بناؤ موحد! اتنا تو کوئی بے وقوف بھی سمجھ سکتا ہے کہ فقط جائیداد کے کاغذات ہاتھ میں آنے کی بنا پر وہ اتنا امیر نہیں ہو سکتا کہ لاکھوں لٹا شروع کر دے۔“ وہ چھٹکارے۔  
”اس کی بہادر آبادوی زمین کیش پر خریدی ہے میں نے۔“ وہ سینے پر بازو پلینیتا اس قدر آرام سے بولا کہ وہ سنائے میں آ گئے۔ پھر سر پر اتارے لہجے میں کہا۔  
”وہ..... وہ تو پہلے ہی ہماری تھی..... کتنے میں خریدی؟“

”ہمارے نہیں اس کی تھی۔ ہاں البتہ قفسہ آپ کا تھا اور چونکہ آپ کو وہ زمین بہت پیاری تھی اس لیے میں نے وہاں اُگی فصل کی قیمت سمیت وہ زمین آپ کے لیے خرید لی ہے۔“ موصد نے سچ گرتے ہوئے نرمی سے بتایا تو وہ بھڑک اٹھے۔

”اے کیسے کیسے ادا کر دیا تم نے..... زمین کے کاغذات واس کا انتقال۔۔۔ وقت لگتا ہے اس پر۔ کینسل کرو سب کچھ اور پیسہ واپس لو اس مردود شخص سے۔“

”میں نے مارکیٹ کی ڈیمانڈ کے مطابق اس زمین کی سودا کروڑ کی قیمت ادا کی ہے آغا جان! کاغذی کارروائی کا کیا ہے وہ آرام سے ہوتی رہے گی۔ اب کبیر ہمارے لیے کوئی انجان شخص تھوڑی ہے۔ ہم سے رشتہ جوڑنے کی خاطر اس نے شہر میں گھر لیا ہے گاڑی لی ہے۔ اب بے چارہ کہاں سے واپس کرے گا سارا روپیہ۔ اور ویسے بھی میں اسے قول سے پھرنے والا نہیں ہوں، سو یہ ذلیل نیکسٹ نہیں ہو سکتی۔“ وہ مسکرا رہا

تھا۔ آغا جان کو اتنی سردی میں بھی سوا کروڑ کا سن کر پسینہ آنے لگا۔ وہ دل تھام کر اپنی کرسی پر گر سے گئے۔  
 ”بے وقوف۔۔۔۔۔“ وہ اتنی زور سے گرجے کہ ان کے حلق میں خراش سی آگئی وہ کھانسنے لگے۔  
 ”موحد نے ہمدردی سے آگے بڑھ کر ہاتھ پیے ان کی پشت مسلی تو انہوں نے موحد کا ہاتھ جھٹک دیا۔  
 ”ایک چیز جو پہلے ہی ہمارے قبضے میں تھی اسے رقم دے کر۔۔۔ بلکہ کروڑوں روپیہ دے کر خریدنا بے وقوفی ہے اول درجہ کی“ وہ غصے سے بولے موحد نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔  
 ”یہ تم کا مال اسے ایمان داری سے لوٹا دینا اول درجہ کی نیکی ہے آغا جان! بہت غلامی کاٹی ہے ان باپ بیٹے نے آپ کی۔ اب بس ختم ہوا وہ دور۔ اب تو ملاحظہ اور کبیر کی شادی کا سوچیں آپ۔“ موحد کا انداز پر سکون تھا۔ مگر اس کی آنکھیں..... آغا جان تھرا گئے۔ سہیل ٹھیک کہتا ہے، اس کی آنکھوں کی آنچ دیتی سردی کیفیت..... وہ آج دکھائی دی تھی انہیں۔ اور اوپر سے اس کے الفاظ..... ان کی روح پر جیسے کسی نے کوڑا سید کیا ہو۔

”کھواس مت کرو۔ اتنے اعلا خاندان میں موری کی اینٹ لگا کر زمانے کی بوتیاں کھائیں ہم؟“

”ہا۔۔۔۔۔ اعلا خاندان۔۔۔۔۔“ موجدان کے سامنے کھڑا ہوا اور خراشہ بولا۔

”کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں آپ کے خاندان میں آغا جان! آپ میں کبیر۔ ہم سب انسان ہی تو ہیں ایک جیسے۔ ایک سا خون۔ ہمارے دین میں رنگ و سسل اور خاندان کے بجائے صرف مٹی اور پرہیزگار انسان کی برتری ثابت ہے۔“

”ایک غلطی و قار نے کی تھی جس کا خمیازہ آج تک ہم بھگت رہے ہیں۔ اب تم چاہتے ہو کہ دوسری غلطی ہم کر لیں۔ اس ڈرامیو کو اپنے خاندان میں شامل کر کے۔ آخ تھو۔ کچھ تو ہماری اور اپنی جاہ و شہمت کا خیال کیا ہوتا۔ وہ اس درجہ حقارت سے بولے کہ موجد با مشکل ضبط کر پایا۔

”اس چیز کا کیا خیال کروں آغا جان! جس میں آپ کا یا میرا کوئی کمال ہی نہیں۔ یہ ساری عزت و آسائش تو اللہ کی دین ہیں۔ ان پر کیا اترنا اور ایمان کرنا اور یہی بات غلطی کی تو اس وقت بھی غلطی آپ کی تھی اور آج بھی آپ ہی غلط ہیں آغا جان!“ بے حد جی سے کہا تو وہ مارے غصے کے لرزنے لگے۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے اور اس پادشاه آف انٹاری کو کل سے کینسل سمجھو، میں صبح بات کرتا ہوں وکیل سے۔ آفس جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔“ ان کا انداز قطعی تھا۔ چند لمحے انہیں دیکھنے کے بعد وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

”توبہ کار دکھلا ہو تو انسان کو دیر نہیں کرنی چاہیے آغا جان! ورنہ بعض اوقات واقعی بہت دیر ہو جایا کرتی ہے۔“

”گیٹ آؤٹ“ وہ زور سے کرے تو وہ شانے جھٹکتا اسٹڈی سے نکل گیا۔ آغا جان نے اسی وقت سہیل اور مبین آفندی کو طلب کیا۔

”کل سارا سلسلہ اپنے ہاتھ میں لوتم دونوں اور موحد کو گھسنے نہیں دینا آفس میں۔ اس نالائق کو میں کچھ زیادہ غلط ہی سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ تو ہمدردی اور ترس میں ہی سب کچھ گنوا دے گا“ وہ قطعیت سے کہتے دونوں بھائیوں کے دل کے پھول کھلا گئے۔

انہوں نے مؤدبانہ سر ہلاتے ہوئے ایک دوسرے کو مسکراتی نظروں سے دیکھا تھا۔ خس کم جہاں ہاک۔ موحد نامی کاٹنا جیسے ان کی راہ میں آتا تھا دیسے ہی خود بخود ہٹ بھی گیا تھا۔ جبکہ آغا جان کا تو کلیجہ مسلسل



”بہت۔۔۔ مگر خوف زدہ بھی کبیرا نہ جانے کیا فیصلہ ہو۔“

”اللہ بہتر ہی کرے گا ان شاء اللہ۔ فکر مت کرنا ملاحہ! میں نے یہ پروپوزل تمہاری زندگی کو مشکل بنانے کے لیے نہیں بلکہ اس میں خوشیاں بھرنے کے لیے بھیجا ہے تو باقی کی فکریں کبیر خان کے لیے رہنے دو۔ تم صرف اچھے اچھے خواب دیکھو۔“ وہ مسکراتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ملاحہ کا دل ٹھہرنے لگا۔

”تم ہو کہاں اس وقت۔۔۔؟“

”گھر میں ہی ہوں۔ اب جاب تو تمہاری مہربانی سے ختم ہو گئی۔“

”فکر مت کرو۔ ساری زندگی ڈرائیور ہی بنا کر رکھوں گی۔“ ملاحہ نے اسے چھیڑا تو وہ مسکراتے لہجے

میں برجستہ بولا۔

”عموماً اچھے شوہر ہی اپنی بیوی کے شوہر ہوا کرتے ہیں، آپ کے لیے یہ بھی منظور ہے۔“ ملاحہ نے ہاتھوں کی لوٹک سرخ پڑ گئی اس کی تجویز سی خاموشی پر وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ اگلے دو چار روز میں دونوں بھائیوں نے سارے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ مبین آفندی کمپیوٹر آپریٹر کے سر پر کھڑے اکاؤنٹس چیک کر رہے تھے۔ آغا جان کے وکیل نے موحد کے نام کی ٹی باور آف انٹرنیٹ کونسل کروادی تھی۔

”اتنی بڑی بڑی رقم۔۔۔“ مبین آفندی اکاؤنٹس کی پوزیشن دیکھ کر ششدر تھے۔

”یہ سب وقتاً فوقتاً موحد صاحب نکلاتے رہے ہیں سرا“ اکاؤنٹس مینیجر نے دبے لفظوں میں کہا۔ مگر

ان کی نظر مانیٹر اسکرین پر تھی۔

”یہ سوا کروڑ تو زمین کی خریداری کے لیے نکلا دیا گیا ہے۔۔۔ لیکن یہ جو پچھلے چھ ماہ کے دوران بڑی رقم نکلائی گئی ہیں ان کا مطلب یہ نہیں آ رہا سمجھیں۔۔۔ ہر ماہ تو مال کی پے منٹ نہیں کی جاتی وصولی اور ادائیگی کا سرکل تو پورا سال چلتا رہتا ہے۔ وہ منظر سے کہہ رہے تھے۔

”جی ہاں۔۔۔ اور پچھلے ماہ قریبی والوں نے مال کی جو ڈاؤن پے منٹ کی تھی، اس کا دس لاکھ بھی نظر نہیں آ رہا، ان کا حلق تک کڑوا ہوا تھا۔ ان سب کی پوری زندگی کی محنت کی کمائی آغا جان کے اندھے اعتماد کی وجہ سے ڈوب گئی تھی۔

”موحد کا کوئی سیکنڈ اکاؤنٹ ہوگا ضرور۔ اتنا پیسہ وہ خرچ کہاں کرے گا۔“ وہ تین تین سے بولے، مبین صاحب نے سوالیہ نظروں سے مینیجر کی طرف دیکھا تو وہ کڑوا کر ٹربرا کر نظر میں جھکا گیا۔

”تم جتنا ڈوسیم! اس بارے میں کوئی انفارمیشن۔؟“

”ڈونٹ نوسر! ہاں یہ بات بہت عجیب ہے، موحد صاحب کی کہ بینک سے کیش نکالوانے خود جاتے ہیں اور اپنا اے ٹی ایم کارڈ یا دستخط شدہ چیک وغیرہ آج تک انہوں نے کسی ورکر کے حوالے نہیں کیا۔ جبکہ اکاؤنٹس کے شعبہ میں پاس کا کارڈ لامحالہ استعمال کرنا پڑ ہی جاتا ہے اکثر۔ جیسے آپ لوگوں کا۔“ وہ سوچ کر بولا تو سمجھل آفندی نے چونک کر بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی گہری سوچ میں گم تھے۔ ابھی وہ مکمل معاملات تو نہیں سمجھتے تھے لیکن جو نظر آ رہا تھا۔ وہ پریشان کن تھا۔

”یہ سب باتیں آغا جان کو فوری بتانی پڑیں گی تاکہ وہ موحد سے سارا حساب طلب کریں۔“

”موحد صاحب آفس میں ہیں سرا! آپ چاہیں تو ابھی ان سے پوچھ لیں۔“ مینیجر نے مؤدبانہ کہا تو وہ پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گئے۔

”وہ آفس آ رہا ہے؟“ ان کے انداز میں اس قدر بے یقینی تھی کہ مینیجر گڑبڑا گیا۔

”جی سرا! انہوں نے کوئی چھٹی نہیں کی ابھی تک۔“

”الو کا بچھا۔۔۔ اس کو تو میں پوچھتا ہوں ابھی جا کر۔“ اول جملہ زیر لب بول کر وہ اونچی آواز میں کہتے دروازے کی طرف بڑھے۔ پچھلے تین چار روز میں وہ ”تحقیقات“ میں ایسے مگن تھے کہ سوچا ہی نہیں کہ موحد کی آفس میں موجودگی یا غیر موجودگی کا پتا کرتے۔ سمیل آفندی مینیجر اور کمپیوٹر آپریٹر کے ساتھ مل کر باقی کا ڈیٹا چیک کرنے لگے۔

مبین آفندی پیش میں بھرے موحد کے آفس میں پہنچے تو یہ پہلی بار تھا کہ وہ دستک دیے بنا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے۔ موحد نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر سے چونک کر نظر ہٹائی اور انہیں دیکھا۔ جن کے چہرے پر غم و غصہ کی کیفیت صاف ظاہر تھی۔ میز کے اس پار کھڑے وہ پمپلیوں پر ہاتھ جمائے کڑے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ دوبارہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اونے مگر سر دھچکے میں بولا۔

”کسی کے روم میں ناک کر کے جانا آپ کی دینی اور گھریلو تربیت کو ظاہر کرتا ہے ہائی داؤے۔“ مبین آفندی بری طرح سچے۔ انہوں نے جھک کر اس کی میز پر دونوں ہاتھ جمائے اور کئی بھرے انداز میں بولے۔

”اور تم۔۔۔ تم نے تو بہت اچھی طرح اپنی تربیت شوکی ہے۔“

”کوئی کام تھا آپ کو۔۔۔ میں کچھ بڑی ہوں اس وقت۔“ وہ رکھائی سے دو ٹوک بولا تو وہ تلملا اٹھے۔

”تم شاید بھول گئے ہو کہ آغا جان انہیں فارغ کر چکے ہیں۔ پوچھ سکتا ہوں کہ تم کس سلسلے میں بڑی ہو؟“

”مٹی سے پوچھا تو لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اس نے آرام سے کرسی سے ٹیک لگائی اور انکشت شہادت سے سامنے دیوار پر لگی وقار آفندی اور فاران آفندی کی تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

”اپنے باپ کے آفس میں بیٹھا ہوں کوئی مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا حق نہیں رکھتا۔“

”کہاں خرچ کیا ہے تم نے اکاؤنٹس کا پیسہ؟“ وہ اس سے جیت نہیں سکتے تھے سو سیدھے سبھاؤ پوچھا تو دھنویں اچکا کر جیسے حیران ہوا۔

”آپ اس بارے میں مجھ سے کچھ انویسٹی گیشن نہیں کر سکتے کیونکہ تب باور آف انٹرنی میرے پاس تھی۔ میں اپنے فیصلوں میں آزاد تھا تا یا جان۔“ وہ پرسکون انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا لیوں پر پچھلی ہلکی سی مسکراہٹ مبین آفندی کا دل جلا رہی تھی۔ وہ میز چھوڑ کر گہری سانس بھرتے سیدھے ہوئے اور اسے دھمکایا۔

”اب تو آغا جان تم سے اچھی طرح پوچھیں گے کہ تم نے ان کے پرنس اکاؤنٹس کہاں جھاڑے ہیں۔“

”اوکے۔۔۔ اور کچھ؟“ وہ یوں کرسی جھلا رہا تھا۔ جیسے وہ دنیا کا مطمئن ترین انسان ہو اور بات کرنے کا انداز ایسا کہ مبین صاحب کو ہنک محسوس ہوئی۔

”اس بھول میں مت رہنا موحد آفندی! کہ آغا جان تمہاری اس دھوکا دہی کے بعد بھی تمہارے اکلوتا پوتا ہونے کے لاڈ اٹھائیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے تمہیں جیل کی ہوا کھانی پڑے۔“ وہ دانت کچپکا کر بولے۔

”ہوں۔۔۔ انفارم کرنے کا شکر یہ۔ دروازہ آہستہ بند کر کے جایے گا۔“ وہ نرمی سے بولا تو دل ہی دل میں اسے ناقابل اشاعت گالیوں سے نوازتے اور کھا جانے والی نظروں دیکھتے آفس سے نکلے تو دروازہ زور سے مارا۔

”بہت دیر سے آپ کو یاد آیا۔ خیر اس نکاح کو میں اس لیے نہیں مانتی ہوں امی! کیونکہ کس بھی طرح سہی مگر میں میرے نکاح میں ہوں۔ اور میں مود کے ساتھ نہیں بلکہ میری ماں کے پاس رہ رہی ہوں تو میرا نہیں خیال کہ کسی کو اس پر اعتراض ہونا چاہیے۔“ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پھر دفعتاً تالی جان حواس میں آکر غنائیں۔

”ابو اس مت کرو مہر دیا یہ آغا جان کا حکم ہے۔ سمجھیں تم خبردار کوئی اول فول کی ہو تو۔“

”امی! یہ نکاح خواہ کسی بھی حالت میں ہوا ہو مگر جب تک یہ قائم ہے۔ اس کی پاسداری مجھ پر فرض ہے۔ زرنگار آئی کی ذمہ داری ہے مجھ پر جب تک وہ یہاں اس گھر میں ہیں، اگر میں انہیں اپنے ساتھ لاسکتی ہوں تو کہیں میں آج ہی آجاتی ہوں۔“

تالی جان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ان کی لاڈلی اور باغی ترین اولاد کا فلسفہ بگھار رہی تھی۔ شرہ کی آنکھیں نم ہو گئیں بعض لوگوں کے ساتھ زمانہ بہت برا سلوک کرتا ہے مگر وہ اپنی اچھی روش نہیں چھوڑتے۔

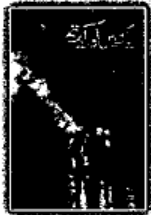
”تم۔۔۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی اس قدر فضول بات کرنے کی۔۔۔ اب تم اس تنگ انسانیت کے ساتھ زندگی گزارو گی وہ۔۔۔ جس نے تمہاری زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

”آپ ابھی کسی نے نہیں کی امی! اگر اس نے دھوکے سے زبردستی نکاح کیا تھا تو آپ لوگوں نے نکاح پر کاح کر کے اس سے بھی بڑا گناہ کر دیا۔ میرے بارے میں تو کبھی کسی نے نہیں سوچا۔“ وہ جی سے بولی تو ان کا دماغ گھوم گیا۔

”تو تم۔۔۔ تم اب اس کے ساتھ رخصت ہونے کا سوچ رہی ہو؟ کاٹ کر دریا میں پھینک دیں گے تمہیں مہر و اگر یہ بات کبھی سوچنا بھی مت۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں  
اور ایک تم



جنرل ریاض  
قیمت - 350/- روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جمیل  
قیمت - 400/- روپے

کسی راستے کی  
تلاش میں



میمونہ خورشید علی  
قیمت - 350/- روپے

میرے خواب  
لوٹا دو



نگہت عبداللہ  
قیمت - 400/- روپے

فون نمبر  
32735021

منگوانہ  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

”آ آہ۔۔۔ دونوں باپ بیٹی ماشاء اللہ ایک جیسے ہیں۔“ مود بڑبڑا کر رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے کی فکری کے برعکس اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ آغا جان کی ٹیبل تک ساری تفصیل پہنچی تو وہ دنگ رہ گئے۔

”اُتنا پیسہ وہ کیسے نکلا سکتا ہے۔۔۔ اور سب کچھ اسی کا تو تھا اسے ایسی بے ایمانی کرنے کی کیا ضرورت تھی مبین!“

”کیونکہ وہ جانتا ہے آغا جان! ہمارے ذاتی اکاؤنٹس الگ سہی لیکن بزنس اور بزنس کے اکاؤنٹس پر ہمارا بھی حق ہے تب ہی تو پاور آف انٹاری ہاتھ آتے ہی اس نے آہستہ آہستہ اکاؤنٹس خالی کرنے شروع کر دیئے بار بار تو موقع نہ ملتا اسے ایسا ہاتھ مارنے کا۔“ سہیل تلخی سے بولے۔

”اگر ایسا ہی ہے تو میں اسے معاف نہیں کروں گا سہیل! اس نے پیار ہی دیکھا ہے ابھی میرا۔“ ان کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔

”آپ اسے بلا لیں ابھی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“ مبین آفندی تو ویسے بھی مود سے جلے بیٹھے تھے۔

”ابھی نہیں مبین!“ وہ جھکے ہوئے انداز میں انہیں ٹوک گئے۔ ”ابھی اس دل کو ذرا سنبھل لینے دو۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ مود ایسی حرکتیں کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔“

”وہ ہمارا کبھی بننا ہی نہیں آغا جان! مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کسی منصوبے کے تحت آیا ہے یہاں۔ اس نے ماضی کی تلخیوں کو نکالا ہی نہیں اپنے اندر سے۔ اسی لیے ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔“ سہیل تند لہجے میں بولے تو آغا جان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک کر جانے کا اشارہ کیا۔

”بس اسی نرمی کا فائدہ تو وہ اٹھا رہے تمام عمر آغا جان کے دل سے پوتے کی خواہش ننگی تو اب اسے سزا دیں بھی تو کیسے۔“ ان کے کمرے سے نکل کر سہیل آفندی برہمی سے بڑے بھائی سے مخاطب تھے۔ وہ آغا جان کی نرمی دیکھ کر غم و غصے کے حصار میں تھے۔

”لیکن ہم اسے بھی معاف نہیں کریں گے۔“ مبین صاحب کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

”تم اپنا سامان اٹھاؤ اور اپنے کمرے میں واپس آؤ مہر و!“ تالی جان نے مہر ماہ کو رات کے کھانے کے بعد بطور خاص شرہ چچی کے سامنے غم دیا، مود خدا جانے کہاں تھا شاید وہ شعوری طور پر آغا جان کے سامنے آنے سے کتر رہا تھا۔ یا شاید اسے کسی کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ آغا جان کے اٹھتے ہی مہر ماہ کو آڈر ہوا تو اس کے پتیلیں اکٹھی کرتے ہوئے ہاتھ ٹھکے۔ شرہ نے چونک کر صدیقہ بیگم کی شکل دیکھی۔ جہاں تھے ہوئے تاثرات تھے۔

”وہ کیوں؟“ وہ لمحہ بھر چوٹنے کے بعد اب دوبارہ کھانے کے برتن اکٹھے کرتے ہوئے رکھائی سے بولی۔

”جب ایک نکاح کو تم مانتی ہی نہیں تو کیوں اور کس رشتے سے تم وہاں پر رہ رہی ہو؟“ وہ تلخی سے گویا ہوئیں۔ مہر ماہ نے ملاحظہ کو برتن اٹھانے کا اشارہ کیا اور خود کہنیاں میز کی سطح پر ٹکا کر تالی جان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا لیکن میں زردگار آئی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ جب تک وہ انہیں یہاں سے نہیں جاتا۔ اور آپ بے فکر ہیں۔ طلاق دے دے گا وہ مجھے اگر اس کو اس کے باپ کی جائیداد دے دی جائے۔“ وہ محل سے ان کی بات برداشت کرتے ہوئے بولی۔ تائی جان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ادھر ہی سینہ پیٹ ڈالتیں اپنا۔

”جائیداد.....؟ کون سا باپ؟ کیسی جائیداد؟ اللہ جانے کس کا خون ہے اس کی رگوں میں۔ ایسے ہی کوئی منہ اٹھا کر.....“

”باااا۔۔۔ امی بس۔“ مہر خود پر قابو کھو کر زور سے بولی اور پاس بڑے گلاسوں کو ہاتھ مارا تو چاروں گلاس اڑتے ہوئے زمین پر گرتے ہی کرچیوں میں تبدیل ہو گئے۔ تائی جان نے سشدرنگا ہوں سے پہلے گلاسوں کی کرچیوں اور پھر مہر ماہ کے غصے سے پتے چہرے کو دیکھا۔

”وہ وقار پچھا کا بیٹا ہے اور ان کا خون کوئی مانے یا نہ مانے لیکن میں مانتی ہوں اس حقیقت کو۔“

”ہاں۔۔۔ تم تو وہاں تھیں نا ڈیلیوری کے وقت۔“ ساڑھ چچی نے مسخراڑایا۔

”آپ بھی نہیں تھیں پچی جان!“ اس نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ کر کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پاک باز عورتوں پر تہمت لگانا کبیرہ گناہ ہے۔ اور اس کی سخت وعید ہے یہ بات یاد رکھیے آپ لوگ۔“

”تمہاری یہ ساری بکواس میں آغا جان کو بتاتی ہوں جا کر وہی تمہیں سیدھا کر بس گئے، تائی جان بے بس ہو کر اتنا ہی کہہ پائیں۔ مہر ماہ ان کی بات نظر انداز کرتی اٹھ کر چلی گئی۔ ملاحہ فرش صاف کر کے سیدھی اس کے کمرے میں آئی تو بے یقینی سے پوچھا

”آئی اکیلا دفعتی تم واپس نہیں آؤ گی؟“

وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بستر پر بیٹھی تھی۔ آرزو ہی ہو کر اس نے ٹھوڑی گھٹنے پر رکھی اور آنکھیں موند کر تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ ”پتا نہیں ملاحہ! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ان حالات میں میں نہیں کھوئی۔ مجھے نہیں پتا کہ میں اپنا آپ کہاں سے واپس لاؤں۔“

”ایسی باتیں مت کرو آئی! موحہ بھائی بہت اچھے ہیں۔ تم نمبر سے طلاق لے لو اور دوبارہ موحہ بھائی سے شادی کر لو۔“ ملاحہ نے جذباتی ہو کر کہا تو مہر ماہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

”موحہ میں کون سے ہیرے جڑے ہیں جو میں ایک کنویں سے نکل کر دوسری کھائی میں چھلانگ لگا دوں۔“

”ایسے تو نہ کہو آئی! موحہ بھائی نے تمہارے ساتھ آج تک کچھ برا نہیں کیا بلکہ ہمارے لیے تو وہ اچھا ہی سوچتے ہیں۔“

”یہ تو تم امی اور ابو سے پوچھو ذرا کہ اب وہ موحہ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے اس نے۔ اب تو آغا جان کا پوتے والا شوق بھی پورا ہو گیا ہے بہت غصے میں ہیں وہ.....“ مہر ماہ نے مسکے انداز میں کہا۔ ملاحہ کی بات اور موحہ کی اس طرح حمایت کرنا اسے پسند نہیں آیا تھا۔

”یہ اچھی بات ہے۔ اپنی مرضی سے سب کچھ دیا تو ٹھیک اور اگر کچھ فیملی انہوں نے اپنی مرضی سے کر لیے تو اس پر سب چراغ باہور ہے ہیں۔ ویسے بھی تو آغا جان موحہ بھائی کو ساری جائیداد کا وارث بنانے پر تلے ہوئے تھے تو اس میں ایسی کیا تعجب بات ہوگی اگر کچھ انہوں نے اپنی مرضی سے خرچ کر لیا تو.....“

”مجھے نہیں پتا جا کر یہ سب باتیں اپنے لاڈلے بھائی سے پوچھو میں کون سا اس کی لیگل ایڈوائزر ہوں

اور وہ کون سا ہر کام میرے مشورے سے کرتا ہے۔“ مہر ماہ نے اکتا کر کہا۔

”لیکن وہ اچھے ہیں۔ آپ آغا جان پھر کسی ایسے ویسے کو اٹھا کر لے آئیں گے تمہارے لیے۔“ ملاحہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

”ہاں اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری لاڈلے بھائی کو ہی جھاڑ پونچھ کر ٹھیک ٹھاک کر لوں۔“ مہر ماہ نے محل سے کہا تو ملاحہ بھیچپ گئی۔

”امی نے کبیر کے بارے میں کیا کہا ہے؟“ مہر ماہ نے بات بدل دی تو وہ اداس ہونے لگی

”مجھے نہیں پتا تھا کہ موحہ بھائی کبیر کا پروپوزل لا رہے ہیں مگر یہ ضرور پتا تھا کہ جب بھی میری پسند کا رشتہ آیا اور امی کو پتا چلا کہ یہ پروپوزل کبیر کا ہے تو وہ بھی نہیں مانیں گی۔“

”اب یہ تو موحہ کا دوسرا ہے جو یہ پروپوزل لایا تھا یا پھر کبیر سے کہو کہ وہ آکر آغا جان سے بات کرے یا ابو سے، مہر ماہ نے سنجیدگی سے کہا تو ملاحہ نے جھرجھری لی۔

”تمہارا کیا خیال ہے آئی! یہ لوگ اسے زندہ یہاں سے واپس جانے دیں گے۔“ ملاحہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ تو وہ اکتا کر بولی۔

”سالوں بیت گئے مگر آفندی ہاؤس کے رہنے والوں کے دلوں پر لگی مہر میں نہ اتریں اتنے سخت دل ہیں ان لوگوں کے پتا نہیں کس طرح نرم ہوں گے۔“

دونوں کے درمیان خاموشی کی دیوار تن گئی تھی۔ \* \* \*

ترنین اور طلال کے تعلقات پہلے سے بہتر چل رہے تھے اسی لیے گھر میں امن اور سکون کا دور دورہ تھا۔ اب ترنین گھر کے کاموں میں بھی مارے باندھے حصہ لے ہی لیا کرتی تھی جبکہ طلال کے ساتھ طنزیہ گفتگو کرنا بھی کم کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے گھر کا ماحول پرسکون تھا۔ ابھی ساڑھ وائس اپ پروڈیو کال کے ذریعے اسے گھر کی تمام رپورٹ دے رہی تھیں۔

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا اس مہر ماہ کی قسمت کتنی بلند ہے۔ پہلے طلال کو اپنی اداؤں میں پھنسائے رکھا، وہ تو شکر ہے درمیان میں نمبر آ گیا اور مہر ماہ کو اڑا کر لے گیا۔“

ترنین لیٹ کر آرام سے کہہ رہی تھی، طلال ابھی تک گھر نہیں آیا تھا سو وہ آزادی سے بات چیت کر رہی تھی۔

”خاک اچھی قسمت ہے اس کی۔ عین شادی کے دنوں میں وہ خمیشت آدمی اسے اغوا کر کے لے گیا اور نکاح بھی پر دھوا لیا مہر ماہ کے ساتھ۔ طلال تو اس کی زندگی سے نکلا ہی تھا جو زمانے بھر میں تھو تھو ہوئی وہ الگ۔

وہ تو آغا جان نے اس بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے مہر ماہ کا نکاح موحہ سے کر دیا اور نہ طلال تو شاید ساری عمر مہر ماہ کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ بہتری کے لیے ہی ہوتا ہے اور موحہ کون سا گیا گزرا ہے اس مہر ماہ کے تو ویسے ہی مزاج نہیں ملتے۔ وہ تو اس نکاح کو مانتی ہی نہیں خوب تماشا لگایا ہوا ہے دونوں بہنوں نے گھر میں۔“

”وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں نے طلال کو یہی بتایا ہے کہ مہر ماہ نے موحہ کی خاطر اسے ٹھکرایا ہے ورنہ تو وہ ابھی تک راجھا بنا پھر رہتا، مہر و کے پیچھے۔“ ترنین کڑوے لہجے میں بولی تو دروازے کی چوکھٹ پر کب سے ساکت کھڑا طلال زرد چہرہ لیے اپنے قدموں واپس لوٹ گیا۔ ساڑھ چچی اب بیٹی کو گھر کے موجودہ حالات بتا رہی تھیں۔ جن میں کبیر کی بدلتی حالت اور ملاحہ کے لیے آنے والا اس کا پروپوزل تھا۔ وہ حیران



”تم ٹیرس پر آ سکتی ہو مہر!“ مہر ماہ نے اس کی کال انٹینڈ کی تو وہ مدھم لہجے میں بولا۔ مہر ماہ کو جھٹکا لگا۔

”تم اس وقت چھت پر ہو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ تم سے بات کرنی ہے۔“

”شٹ اپ۔ آغا جان کو پتا چلا تو گولی مار دیں گے ہم دونوں کو۔ تمہاری تو خیر ہی ہے لیکن مجھے کم از کم بے گناہ مرنے کا کوئی شوق نہیں، اس نے مکمل کو مزید اپنے گرد لپیٹا۔

”گولی سے تو نہیں لیکن سردی سے ٹھٹھ کر ضرور زرجاؤں گا میں۔“ اب کی بار وہ گویا کیپا کر بولا۔

”تمہیں ضرورت کیا۔۔۔ کئی یوں جان پر کھیلنے کی۔ نفرت ہے مجھے تم سے اور تم مجھے گھر کی چھت پر آدھی رات کو ملنے کے لیے بلارہے ہو۔“ ناراضی سے کہتے ہوئے وہ مکمل ہٹا کر کھڑی۔ پاؤں چپلوں میں پھنسائے اور شال لپیٹ لی۔

”تم ہو کس غلط فہمی میں موحدا! دھوکے سے ہماری ساری پر اپریٹی ہڑپ کر گئے ہو اور پھر بھی سوچ رہے ہو کہ میں ابھی بھی تمہاری بات سنوں گی؟“

موبائل کان سے لگائے فحش سے کہتی وہ ایک نظر سوئی ہوئی زرنگار پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل آئی تو آدھی سیز جیوں تک آتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ گرم بستر میں سے نکل کر محض ایک شال لپیٹ کر چلے آتا ایک بہت بڑی بے وقوفی تھی وہ بھی موحدا جیسے دھوکے باز بندے کی خاطر پھر سوچا۔

لیکن اس نے ملاحظہ کے لیے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تو ذرا سی بات سن لینے میں کیا حرج ہے، کھاتا نہیں جائے گا۔ وہ ٹیرس پر کھڑا جنگل سے نیچے اندھیرے لان میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ مہر ماہ موبائل آف کر کے اس کی طرف بڑھی۔ چند دن پہلے بارش کھل کر بری تو اب مطلع صاف تھا اور چاند کی سردراتوں کی اداس سی روشنی ہر جگہ بکھری ہوئی تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ پر وہ اس کی طرف پلٹا۔

”سوری۔۔۔ اتنی سردی میں تمہیں زحمت دی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا تو مہر ماہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اب یہ زحمت کرنی لی ہے تو برائے مہربانی اپنے ڈرا سے بند کرو اور وہ بات کرو جس کے لیے مجھے اتنی

سردی میں ٹیرس پر انوائٹ کیا ہے۔“ جنگل سے ٹیک لگائے کھڑا وہ چند لمحے خاموش رہا۔

”تائی جان نے تم سے گھر واپس آنے کو کہا تھا۔؟“ اس نے پوچھا تو مہر ماہ کو کوئی حیرت نہ ہوئی یقیناً اسے شمرہ کی زبانی ساری بات پتا چل چکی تھی۔

”ہاں۔۔۔ اور میں نے انہیں کیا جواب دیا۔ وہ بھی یقیناً تمہیں پتا چل گیا ہوگا؟“ مہر ماہ نے نیکھے لہجے میں کہا۔

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے نمبر کو مظلوم سمجھ لیا ہے؟“ موحدا نے قحط لفظوں میں پوچھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، کیا وہ شخص قابل معافی ہے؟“ مہر ماہ نے مٹی سے پوچھا تو وہ لہجہ بھر کو چپ رہ گیا۔

”مجھے اس ساری داستان میں صرف زرنگار اتنی کا کردار قابل ہمدردی لگا ہے صرف وہی ہیں جنہوں نے جبر کو صبر سے برداشت کیا۔ نمبر نے تو اپنا بدلہ لے لیا۔ وہ بھی ایک بے قصور ہے تو اب وہ اور اس گھر کے لیکن ایک ہی صف میں آگئے ہیں۔ وہ کہاں سے مظلوم رہ گیا۔“ مہر ماہ نے مٹی سے کہا تو کافی دیر کے بعد وہ

”اور موحدا۔۔۔؟“ مہر ماہ نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”میرے لیے تو موحدا اور نمبر ایک ہی تصویر کے دو رخ بن گئے۔ اس نے اپنے حالات کا بدلہ مجھ سے لیا اور تم نے دوست بن کر دھوکا دیا تو بتاؤ۔ کیا موحدا اور نمبر دونوں کے پلڑے برابر نہیں ہیں۔؟“ وہ جنگل سے ٹیک لگائے کھڑا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ شال کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹے وہ اسے شمرہ سے کیپانی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”تم نے کوئی سویر نہیں پہنا؟“

”تم یہ مت سمجھنا کہ میں محض تمہارے ایک بلاوے پر دوڑی چلی آئی ہوں۔ مجھے بھی تم سے ایک بات کرنی ہے۔“ اس کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے مہر ماہ نے جتانے والے انداز میں کہا۔ لیکن موحدا کا ذہن ابھی تک اسی بات میں انکا ہوا تھا۔

”سوری لیکن مجھے پتا ہے کہ اب کسی کو بھی میرا تم سے بات کرنا گوارا نہیں ہوگا اس لیے سوچا کہ یہیں پر بات کر لوں، مجھے نہیں پتا تھا کہ تم سویر پہنے بغیر آ جاؤ گی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ خود وہ فل سویر کے اوپر لیدر جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔

”تم نے آغا جان کا سارا رویہ کہاں غائب کیا ہے؟“ مہر ماہ نے اب کی بار وہ سوال پوچھا جس کی وجہ سے وہ اتنی سردی میں موحدا کے بلانے پر چلی آئی تھی۔

”یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے مہر ماہ۔“ موحدا نے اسے ٹوکا۔

”یہ ہم سب کا معاملہ ہے، میں گھر والوں سے الگ نہیں ہوں۔“ مہر ماہ نے جتایا۔

”میں نے وہ رویہ اپنی مرضی سے استعمال کیا ہے۔ تب میرے پاس باور آف انٹاری تھی مجھ پر اسے خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس لیے اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کر سکتا۔“ وہ رکھائی سے بولا تو مہر ماہ نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا اور طنز سے بولی۔

”بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے تم پر موحدا! شمرہ چچی ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ موحدا کے سینے میں نمبر کا دل نہیں ہے تو تم نے یہ سرد مہری کہاں سے سیکھی، تم تو شمرہ چچی کے موحدا ہونا؟“ موحدا ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

مہر ماہ نے اپنے دونوں بازوؤں کو اپنے گرد لپیٹ کر سردی کی شدت کو جیسے کم کرنے کی کوشش کی۔ موحدا نے

بنا کچھ کہے اپنی لیدر جیکٹ اتار کر اس کے شانوں پر ڈال دی۔ مہر ماہ اس کی حرکت پر دنگ رہ گئی۔ اس نے وہ

جیکٹ اتارنے کی کوشش کی۔

”مجھ پر یہ مہربانیاں مت کرو موحدا! میں تو اب خاردار رستوں پر چلنے کی عادی ہو گئی ہوں“ موحدا نے اس کے ہاتھ پیچھے کر کے جیکٹ ٹھیک سے اس کے شانوں پر جمادی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ ساری رقم میں نے نمبر آفندی کے اکاؤنٹ میں جمع کروادی ہے۔“ مہر ماہ بے یقینی سے اپنی جگہ جم سی گئی۔

”اب بتاؤ کیا کرنا چاہیے مجھے؟“

”کچھ نہیں۔ اب تو جو کرنا ہے وہ میں ہی کروں گی۔ نمبر کو دولت چاہیے تھی۔ جائیداد میں حصہ چاہیے تھا وہ تم نے اسے دے دیا۔ بہت شکریہ اب وہ یقیناً مجھے طلاق دے دے گا۔“ وہ لفظوں کو چبا کر کڑوے لہجے میں بولی تو موحدا نے بے اختیار اسے شانوں سے تھام لیا۔

”اور میں۔۔۔؟“ میرا کیا؟“ مہر ماہ نے بڑے حوصلے سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور قطعی انداز میں بولی۔

”تم موحد آفندی!.... تم تو اس پوری داستان میں کہیں تھے ہی نہیں۔ تمہارا کیا ذکر۔“  
”سنو.....!“

وہ ذرا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔  
ناراض ہوئے؟

مگر ہم وہ ہیں  
جن کو ملنا نا بھی نہیں آتا

کسی نے آج تک ہم سے محبت جو نہیں کی ہے  
محبت کس طرح ہوتی

ہمارے شہر کے اطراف میں تو سخت پہرہ تھا  
خزاؤں کا

اور اس کی فصیلیں زرد بیلوں سے لدی تھیں..... اور ان میں نہ کوئی خوشبو  
نہ کوئی پھول تم جیسا۔

کہ مہک اٹھتے ہمارے دل و جاں.....  
جس کی قربت سے

ہم اس شہر پریشاں کی دیراں گلیوں میں۔۔۔ کسی سوکھے ہوئے زرد پتے کی طرح تھے۔  
کہ جب ظالم ہوا

ہم اپنے قدم رکھتی تھی  
تو اس کے پاؤں کے نیچے ہمارا دم نکل جاتا۔

مگر بیت جہنم کا موسم  
سنا ہے بل چکا ہے تو۔

مگر جو ہار ہونا بھی  
سودہ تو ہو چکی ہم کو  
سنو!

ہارے ہوئے لوگوں سے تو روٹھا نہیں کرتے۔۔۔

وہ دم سا دھسے اس مدھم اور ٹھہرے ہوئے لہجے کو سنتی رہی۔ سانس سا کتنی تھی اور وہ خود دم بخود۔  
”یہ کیا نیا کھیلنا شروع کر دیا ہے تم نے میرے ساتھ؟“ ذہن (اور دل بھی؟) اس کے لفظوں میں  
الٹا لٹھ جارا تھا مگر وہ لہجے میں ناگواری بھر کر بولی۔

”مہل کھیلنا تھا، مانتا ہوں..... مگر اعتراف کر رہا ہوں کہ بارگیا ہوں تم سے۔“ وہ اس قدر متین سے بولا کہ  
مہرماہ کو مزید کچھ سننا دو بھر ہو گیا، اس کے ہاتھوں کو شانوں پر سے جھٹکتے ہوئے وہ تیزی سے بیڑھیوں کی طرف پلٹ  
گئی موحدہ تو بھر اسے خود سے دور جاتے دیکھتا رہا، اور وہ دل میں اس دوری کی کک کو محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

یہ اگلے روز کی بات تھی۔ مہرماہ پر رایت کی بے خوابی کی وجہ سے سخت سستی طاری تھی موحدہ کی باتوں نے  
اسے ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا یہی وجہ تھی کہ ذہن سے سب کچھ جھٹک کر سونے میں لگتی ہی رات جاتے

ہوئے نکل گئی تھی۔ کسی انجینی نمبر کی کال آئی تو تو لیے سے چہرہ پوچھتی مہرماہ نے پہلے تو نظر انداز ہی کیا مگر :۔۔۔  
مسلک ٹھنٹی جتنی رہی تو اس نے کال اینڈ کر لی۔  
”ہیلو۔۔۔“

”مہرماہ۔۔۔۔۔“ دوسری طرف سے مردانہ لہجہ ابھرنا تو وہ گڑ بڑائی۔  
”جی ہاں۔۔۔۔۔ لیکن آپ کون ہیں؟“

”میں طلال بول رہا ہوں مہر..... مہر کا طلال“ وہ جذباتی ہو کر بولا تو مہرماہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے سر  
پر پہاڑ توڑ دیا ہو۔

”میں جان گیا ہوں کہ تم اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً مجھ سے جدا ہوئی تھیں مہر! اب بھی دیر نہیں ہوئی  
ہے مہرماہ! میں تمہارا تھا اور تمہارا ہی ہوں، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں مہر!“ مہرماہ کا ذہن کن۔ کیفیت میں تھا۔  
جبکہ دوسری طرف سے مسلسل وہ اسے پکار رہا تھا۔

☆☆☆

سہیل، آفندی نے چند پیرز آغا جان کے آگے رکھے۔ تو وہ چونکے۔

”یہ کیا ہے؟“ عینک ٹھیک سے جما کر انہوں نے کاغذات اٹھا کر نظروں کے سامنے کیا۔

”یہ شہوت ہے اس دعا بازی کا جو آپ کے لاڈلے پوتے نے آپ کے ساتھ کی ہے آغا جان! اس نے  
سارا روپیہ آپ کے اکاؤنٹ سے نکلوا کر وقار کے بیٹے نمبر کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیا ہے۔“

وہ سمجھنے ہوئے لہجے میں پوتے تو آغا جان دنگ رہ گئے..... دردی کی ایک شدید لہر ان کے بائیں پہلو سے اٹھی اور  
سینے کو ایسا جکڑا کہ ان سے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ سہیل آفندی جو یہ قیامت خیز انکشاف کرتے ہوئے بھول گئے تھے

کہ آغا جان دل کے مریض ہیں اور شاید اب کی بار جو دل کا دورہ آئیں پڑتا، وہ ان کی زندگی کا آخری دورہ ہوتا۔ آکسیجن  
کی کمی کی وجہ سے ان کا سیاہ پڑتا چہرہ دیکھ کر بے اختیار بھاگ کر اسٹڈی کا دروازہ کھول کر سب کو آوازیں دینے لگے۔

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے!!!  
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

## ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہوئے ہیں

خوبصورت سرورق  
خوبصورت چمپائی  
مطبوعات طائر  
آفیسٹ پیپر

- ☆ تنلیاں، پھول اور خوشبو راحت جمیں قیمت: 250 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لکھی جدون قیمت: 250 روپے

متوانے کا پتہ: ملکیتہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”میں شرط لگا سکتا ہوں کہ آپ یہ جاب نہیں کر سکتیں۔“ کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بلند آواز میں کہتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

”کیوں؟“ جوئے کا بکھل بند کرتے ہوئے تیزی سے پوچھا گیا۔

”کیوں کہ آپ کاٹان سرسلیس اپنی ٹیڈو دیکھ کر انہوں نے آپ کو جاب دینی ہی نہیں اور اگر ان کی قسمت پھوٹی ان کے ستارے گردش میں ہوئے ان کے سر پر نحوست کے بادل منڈلا رہے ہوئے اور انہوں نے آپ کو اپنی بد قسمتی کی بنا پر یہ نوکری دے دی تو آپ تین دن سے زیادہ یہ جاب کر ہی نہیں سکیں گی۔“ ڈرامائی انداز میں جواب دیا گیا۔

ساتھ ساتھ وہ اپنی، بسن کی پھرتی سے تیاری کا بھی جائزہ لے رہا تھا اور جس طرح پورے کمرے کو میدان جنگ بنائے ہوئے ہوئے جگمگاتے ہوئے تیار ہو رہی تھی۔ اسے اپنی شرط جیتنے کے آثار بالکل واضح نظر آ رہے تھے۔

”کیوں؟“ اب کی بار بھی مختصر جواب موصول ہوا، لیکن اسے تیا گیا تھا۔

”کیوں کیا بھی! آپ کا غیر مستقل مزاج رویہ، وہ لوگ بے حد سنجیدہ اور ڈسپلن والے لوگ مانگتے ہیں اور آپ ٹھہرس بارہ صفت شخصیت۔ آپ نے تو بینڈ بجا رہی ہے ان کے نظم و ضبط کی، میری باتیں، چھوڑیں یہ نوکری دوکری کا جھجھٹ، کوئی اچھی سی کارٹون مودی دیکھتے ہیں۔ آپ کے بغیر میں اکیلا ممالی ڈانٹ کھاؤں گا دونوں بہن بھائی مل کر کھاتے ہیں تو درودٹ جاتا ہے۔“ اصل مدعا بیان کیا گیا تھا۔

”چھاب بک بک بند کرو اور مجھے چھوڑ کر آؤ۔“

آخری بار اپنی تیاری کا جائزہ جاتے ہوئے اس نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ یہ پاس ہی تو ہے اب کیا میں روزانہ آپ کو لانے، اتارنے کی ڈیوٹی بھی سرانجام دوں گا۔ نوے۔“ حیرت اور پریشانی سی لٹھی میں سر ملاتے ہوئے جھٹ جواب دیا گیا۔

”بد تمیز! جاپتا ہے مجھے پاس ہی ہے، لیکن آج پہلا دن ہے۔“ انڈیو بولتا ہے۔ ذرا آج چھوڑ آؤ۔ پر اس پھر میں خود ہی آیا جابا کروں گی۔“ پرس کو کندھے پر ڈالتی اور اپنے ڈاکو منشی کی فائل سنبھالتی وہ جلدی سے بولی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی وہ بھی پیچھے ہی تھا۔

”لو کے ماما اور بابا! اللہ حافظ۔ میں جا رہی ہوں۔“ کھانے کی میز پر اعجاز صاحب کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے ماما کو دیکھ کر دوسرے ہی جملہ اچھالا گیا تھا۔

”اور واپس بھی آ رہی ہوں۔“ مانی سے جھٹ جواب ملا جو بائیک کی چابی جھلاتے اس کے پیچھے تھا۔

”منخوس! کہنے کو چھوٹا بھائی ہے، لیکن بڑائی جھالو ہے۔“ دونوں نوک جھونک کرتے گیٹ سے باہر نکلے اور مسز اعجاز جو اس کے جملے پر اسے ٹوکنے لگی تھیں بس مسکرا کر رہ گئیں اور اعجاز صاحب نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔

\*\*\*

پہون کو دروازے پر نہ پا کر اور سامنے پر نیل کے نام کی سختی دیکھ کر اس نے جوش سے بلکہ دُور سے دروازہ کھولا۔

اور اندر سے دروازہ کھولنے والے شخص کو اتنی زور

سے جا کر لگا کہ بے چارہ کرہا کھاتا کھاتا چاند قدم پیچھے ہٹا اور وہ جھٹ سے اندر۔

”مے آئی کم ان سر؟“ کمرے میں کھڑے ہو کر سویر بننے ہوئے پوچھا گیا۔

”آب آل ریڈی اندر آچکی ہیں۔“ گھوری میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا گیا۔ وہ ابھی تک ماتھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔

”تو یہ ہے استے لمبے چوڑے انسان کا فائدہ پورا ایفل ٹاور بنا کھڑا ہے اپنا آپ بونا لگ رہا ہے حالانکہ پانچ فٹ پانچ انچ قد ہے میرا۔“ دل میں مد مقابل شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا گیا۔

”وہ سویری! مجھے پر نیل صاحب سے ملنا ہے۔“ آپ کے اسکول کی جانب سے فی میل نیچر کی ضرورت کا اشتہار پڑھ کر آئی ہوں۔“ لٹھ مار انداز میں سویری کرتے ہوئے اس نے پر نیل کی تلاش میں اوجھڑا دھر نظرس دیڑھاتے انگریزی زبان میں اپنی انٹری کی وجہ بیان کی تھی۔

”جی میں ہی پر نیل ہوں۔“ سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے بھی انگریزی زبان میں ہی جواب دیا۔

اور ایفل ٹاور کو کرسی پر بیٹھتا دیکھ کر وہ تھوڑا سا گریڈی تھی اس کے تصور میں تو کوئی سڑی، کھڑوس سی عمر رسیدہ خاتون یا کھڑوس ساموٹا عمر رسیدہ سر کے بال اڑائے اور موٹا سا چشمہ لگائے پر نیل تھا اور سامنے والی شخصیت کھڑوس ضرور تھی مگر باقی کے تصور پر پوری نہیں اترتی تھی۔

\*\*\*

”لگتا ہے اشد ضرورت تھی انہیں نیچر کی جو مارے شامت، آپ کو یہ جاب دے دی گئی ہائے بے چارے۔“ مانی نے لاؤنج میں صوفے پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے کہا اور مشعل بس اسے گھور کر رہ گئی۔

”یکو مت! سارا وقت وہ ایفل ٹاور اپنے اسکول کے نظم و ضبط کی گردان کر رہا اور پتا ہے ماما اسے لینے نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ایم ایس سی فرسک کی ڈگری

حاصل کی ہے۔ بقول اس کے حلیے اور شخصیت۔ میں محض بی ایس آنرز لگ رہی ہوں اور نیچر سے زیادہ اسٹوڈنٹ نظر آتی ہوں۔ میں سوچ رہی ہوں زبردستی کے گلاسز لگا کر جاؤں شاید نیچر لگوں اور اماں جان مجھے شاپنگ بھی تو کرنی ہے کپڑوں کی آخر مجھے جاب مل گئی ہے۔“ لاڈ میں ممانک فرمائشیں پوچھتی گئیں۔

”خدا کا خوف کرو مشعل! اسنے سارے کپڑے جوئے تو ہیں تمہارے پاس اور اب تو تم نے اسکول بھی جانا ہے اب تمہارے پاس کپڑوں کی ڈیزائننگ اور سینے کا وقت نہیں ہے گا اور ویسے بھی تم فارغ تھیں تو میں نے اجازت دے دی تھی جنگ کی۔ اس دوران تمہارا کوئی اچھا رشتہ آیا تو بس ختم یہ جاب اور تم اپنے گھر۔“ انہوں نے حسب معمول گھورتے ہوئے پھر سے اپنی بات دہرائی۔

”اور کراس آئی کو فارغ وقت میں شارت کو ر سز کبھی کوئنگ کے، کبھی سینے پر ونے کے، کبھی پینٹنگ



کے۔ اب آپ انہیں کھریہ سب کھانے کے لیے بٹھا بھی نہیں سکتیں محترمہ ویسے ہی بڑی سکھ ہیں اور اگر ان کا کمرہ دیکھیں تو بے چارہ رو رہا ہوتا ہے کیوں دیا مجھے اس۔۔۔“ اس لفظ کو طلق کے اندر اتارا اور بات ادھوری چھوڑی کہ مشعل کے ہاتھ کشن منتقل ہو چکا تھا۔

”تم بس ہزار روپے نکالو۔ مجھے جاب مل گئی ہے ایمان احمد صاحب۔“ مشعل نے مالی کا پورا نام لیتے ہوئے کہا۔

”ایک ہفتہ بھی آپ یہ جاب کر گئیں اور آپ کی حرکتوں کو آپ کے کھڑوس پاس نے برداشت کر لیا تو پھر لینا آپ۔“ مالی نے فوراً جواب اور عافیہ بیگم نے بچن کا رخ یکدم شام کے کھانے کا انتظام کرنا تھا اعجاز صاحب آنے ہی والے تھے۔ ان دونوں بس بھائیوں کی نوک جھونک اب کشن لڑائی میں تبدیل ہونے والی تھی وہ جانتی تھیں کہ کچھ دیر بعد اگر مشعل خود ہی ان کی ہیلپ کرنی شروع کر دے گی۔

وہ جتنی لاپرواہ بس کھ، شرارتی اور چلی تھی اتنی ہی حساس، سمجھ دار اور سلیقہ مند بھی تھی۔ وہ اس کی متضاد شخصیت پر بھی حیران ہوتیں اور کبھی پریشان نہ جانے اس کا شوہر اور سسرال اسے سمجھ پائے گا یا نہیں۔

”یا اللہ یہ یوں ہی ہستی مسکراتی خوش و خرم زندگی گزارے اور جلد ہی اس کا بہت اچھا رشتہ آجائے۔ آمین۔“ دل سے دعا کرتی وہ بچن کے کاموں میں مشغول ہو چکی تھیں۔

\*\*\*

”اف! قسم کھا رکھی ہے اس ہندی نے میرے اسکول کے ڈسپن کابینہ غرق کرنے کی۔“ عاصم سے بات کرتے اپنے آفس کے ونڈو گلاس سے باہر کے پلے گراؤنڈ کا منظر دیکھ کر وہ کہتے ہوئے بولا تھا۔ اس

کی بات پر عاصم نے بھی مڑ کر باہر دیکھا تھا جہاں ایک نازک سی لڑکی سفید لیس والی قدرے لمبی گول گھیرے

والی شرٹ پہننا ہوا دھندلے کر دن میں ڈالے باتوں کی فریج ٹاٹ بنائے نرسری کے بچوں کو جھولوں پر جھلار ہی تھی بلکہ ایک چھوٹا سا بچہ اس نے گود میں بھی اٹھالیا تھا۔

عاصم، اس کا جائزہ لینے تک۔ بچوں کو اسے بلوانے کے لیے بھیج چکا تھا۔ عاصم کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ رہ گئی تھی جب بچوں کے پیغام پر کندھے اچکا تو وہ آفس کی جانب بڑھی تھی۔

”بس سر؟“ دروازہ کھلا دیکھ کر اندر آنے کی اجازت مانگے بغیر اس نے پوچھا تھا اور ابرار اس کے انداز پر دانت کچکا کر رہ گیا۔

\*\*\*

”مس مشعل جہاں تک میری معلومات ہیں یہ پیریڈ نرسری کلاس کا میڈیا پیریڈ ہے نہ کہ گیم پیریڈ تو پھر وہ باہر بندروں کی طرح کیوں جھولے جھولے پھر رہے ہیں۔“ ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے پوچھا گیا۔

”تو یہ ہے! اس اہل ٹاور سے ہر وقت دھواں ہی نکلتا رہتا ہے۔“ منہ میں بڑبڑاتی تھی۔

”سرمیڈیا پیریڈ ہی ہے لیکن جب لائٹ نہیں ہوگی اور جزیئر کا اس روم کے ساتھ کنکشن نہیں اور نرسری کلاس میڈیا روم میں کارٹون نہ لگنے کی صورت میں بھال بھال روٹا شروع ہوگئی تھی لہذا میں نے انہیں گیم پیریڈ کا ہمسوا دے دیا۔“ یہ ساری گفتگو انگریزی زبان میں کی جا رہی تھی اور عاصم کو نہ جانے کیوں لطف آ رہا تھا۔

”اوکے میں اس سلسلے میں جلد ہی میٹنگ کرتا ہوں لیکن آپ فی الحال انہیں میڈیا روم لے کر جائیں۔“ سنجیدگی میں اب بھی کوئی کی واقع نہیں ہوئی تھی۔

”سراسر کی ضرورت نہیں ان کا پیریڈ آف ہو گیا ہے اور میں ان کو ان کی کلاس میں لے کر جا رہی ہوں۔“ چہرے پر ہنسی انہوں میں سے ایک لٹ کوکان کے پیچھے اڑتے وہ واپس مڑ گئی تھی اور عاصم کو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گئی تھی۔

”تمہارے بڑے دانت کل رہے ہیں میرا بس چلے

تو میں اسے ابھی فارغ کروں اس جاب سے۔“ باقی کا غصہ عاصم پر نکالنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئے کہا گیا۔

”یار ابرار! ہانپو کیوں ہو رہے ہو اگر اتنا ہی ناک میں دم کر رکھا ہے تو کرو فارغ۔ آخر اس اسکول کے مالک ہو، سیاہ سفید کر سکتے ہو۔“ عاصم نے کندھے اچکا کے مشورہ دیا۔

”نہیں یار! ایشی اڈوری ٹیلنٹ اینڈ ہارڈ ورک۔ پندرہ دن میں اس نے کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا اور پھر ہمیں سینئر گرلز سیکشن کے لیے ایک سائنس بچہ کی اشد اور فوری ضرورت تھی لاسٹ ٹرم بالکل اینڈ پرہے براجم اپنی پیاری کی وجہ سے جاب چھوڑ گئے اور اس نے آتے ہی ناؤں اور ایٹ کلاس کو اتار اٹھا پڑھانا شروع کیا کہ ان کے ٹیسٹ میں نمایاں فرق نظر آ رہا ہے۔ میں حیران ہوں اس کی پرستاشی کے برعکس بچے اس کے ساتھ ایٹڈ بھی ہیں اور کلاس پیریڈ میں بالکل خاموشی اور جب جا کر سوالات کیے ٹاپک کے متعلق تو سب کو جواب آتے تھے۔ تم تو جانتے ہو کہ مجھے ایسے ٹیچرز کی اشد ضرورت ہے اسکول کی بہترین ریپوٹیشن بنانے کے لیے۔“

پاپا نے اس سے پہلے جس پرنسپل کو یہ اسکول سنبھالنے کے لیے دیا تھا اس نے سب کچھ بگاڑ کر رکھ دیا اس لیے اب اسے سوار نے اور ترقی کی راہ پر لے جانے کا بیڑہ میں نے اٹھایا ہے پاپا کو اس کی بہت ٹینشن تھی۔“

عاصم جو کافی عرصے سے ملک سے باہر رہا تھا اب اچانک واپس آکر اس سے ملنے چلا آیا تھا اصل صورت حال سے ابرار واقف کر رہی رہا تھا کہ نرسری کلاس کا ایٹو نکل آیا پھر سے اپنی ادھوری باتوں کا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے ابرار نے جواب دیا اور بدلے میں عاصم کے شریر جواب پر بس وہ ہنسنے لگا۔ اسے مار تمارا تارہ گیا۔

”اوکے یار اب میں چلتا ہوں۔“ کچھ دیر بعد ہی

عاصم نے جانے کا قصد کرتے ہوئے کہا۔ ”رک نا۔“ ابرار نے فوراً کہا۔

”نہیں بتایا ہے ناکہ رشتے داروں سے ملنے اسلام آباد جانا ہے۔ لاہور سے اسلام آباد کا فاصلہ کافی ہے۔ گھر پر تو آج کل ملتا نہیں بقیل آئی کے بس آج کل اسکول ہی اور ٹانچھوٹا بنا ہوا ہے تمہارا اس لیے تم سے ملنے نہیں آگیا ویسے میری بات پر غور کرنا۔“ عاصم نے اس سے ہاتھ ملاتے آخری بات شریر لہجے میں کہی جس پر ابرار بس اسے گھو کر رہ گیا۔

\*\*\*

ممکی بات نے اسے شاک کر دیا تھا اور پھر وہ فوراً نتیجے پر پہنچ گئی تھی ان کے نیم رضا مند رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے حتیٰ سے نفی میں جواب دیا تھا۔ ماما نے پھر بھی اسے سوچنے کا وقت دیا تھا لیکن اسے کچھ سوچنا ہی نہیں تھا وہ اس کی چال کو بہت اچھی طرح سے سمجھ گئی تھی لہذا اگلے روز بھی اس نے وہی جواب دیا جو ایک دن پیشتر دیا تھا جو تھوڑے ویک اینڈ تھا اور وہ ہفتہ صفائی منار ہی تھی لہذا پورے گھر کو انٹ پلٹ کے صفائی کا کام زور و شور سے جاری ہو چکا تھا۔ عافیہ بیگم نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

\*\*\*

شاک تو ابرار کو بھی لگا تھا رات ماما نے جوابات اسے بتائی تھیں وہ اس سے بے حد پریشان ہو گیا تھا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ضرور اس مسئلے کو حل کر کے چھوڑے گا بس اگلے روز کا اب اسے بے چینی سے انتظار تھا۔

\*\*\*

اور پھر اگلے روز کی اطلاع نے اسے اور زیادہ شاک کر دیا تھا، ٹیچرز کے ساتھ میٹنگ، نئی کلاسز کا سٹینڈس، نئی بکس، نیا یونیفارم وہ ان سب باتوں کو ایک پل میں میسر فراموش کر گیا تھا۔

ذہن بے حد الجھا ہوا تھا زندگی ایک دم بلیک ہو گئی تھی بے چینی اور پریشانی اتنی بڑھی

کہ بے اختیار اس نے کسی کے لینڈ لائن کا نمبر تیزی سے اپنے سیل نمبر سے ملا تھا اور پھر تیزی سے کانڈ پر چند سطرس ٹھیکٹ کر کانڈ کو مٹھی میں جکڑے وہ آفس سے نکلتا چلا گیا تھا۔

\*\*\*

واپسی پر وہ لاٹک ڈرائیو پر چلا گیا تھا جس کی اسے اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی ڈرائیو تک کے دوران گزشتہ دنوں کی باتیں فلیش بیک کی طرح ہم سفر تھیں۔ کبھی لیوں پر مسکان، کبھی آنکھیں، کبھی بے حد پریشانی اور کبھی کچھ کھوجانے کا ڈر ان سب کیفیات سے وہ بیک وقت گزر رہا تھا۔

\*\*\*

”ابراہیم! ہم لوگ“ میں اور تمہارے پیلا چاہ رہے ہیں کہ تمہارا رشتہ عافیہ سے گردیا جائے جس طرح کے تم سنجیدہ مزاج، ڈسپلینڈ ہو، کسی ہی وہ سوبر خاموش طبع اور تمہاری ہی طرح ذہین لڑکی ہے۔ ہمارے خیال میں تم دونوں پر فیکٹ پیل ثابت ہوگے۔ اگر لائف پارٹنر ہم مزاج ہو تو زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے اور پھر ہم تمہارے پیلا کے بے حد اچھے دوست کی بیٹی ہے۔ ہم اس فیملی سے بہت اچھی طرح واقف ہیں تم لوگ بھی ایک دوسرے سے کئی بار فنکشنز وغیرہ پر مل چکے ہو اور اب تم نے اسکول کی دوسری برانچ سنبھال لی ہے۔ اپنی لائف میں سیٹھل ہو وہ تمہارے ساتھ ان سب میٹرز کو شیر کر سکتی ہے، سنبھال سکتی ہے۔ اس لیے ہم بہت جلد یہ رشتہ گردینا چاہتے ہیں۔ ہمارے دل میں اپنے انکوٹے بیٹے کی شادی کے بے حد ارمان ہیں اور اب ہم انہیں جلد از جلد پورا کرنا چاہتے ہیں۔“

مسز گلزار نے ابراہیم کے بیڈ روم میں بیڈ پر لیٹے ابراہیم کے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کافی تفصیل سے بتایا جو ان دونوں میاں بیوی نے سوچا

تھا۔

لیکن ابراہیم کے رد عمل اور اس کی بات نے چند لمحے

کے لیے انہیں ساکت کر ڈالا تھا اور پھر وہ اس کے اصرار پر گلزار صاحب سے ہر بات معاملے پر بات کر کے تیسرے روز ہی مشعل کے گھر جا پہنچی تھیں۔ پتا انہیں مشعل کی فائل سے ملا تھا جو انہوں نے ابراہیم کے علم میں لانے بغیر اسکول کی کو آرنڈ میٹر مسز عارفہ سے منگوائی تھی۔

\*\*\*

”کلاس تھری! یہ پیریڈ میرا فیکسچر پیریڈ ہے اور آپ کا اردو کا ہے میں چونکہ سینئر فیکشن کی سائنس ٹیچر ہوں لہذا آئے اردو پڑھانا تو آسان ہے مگر چونکہ یہ آپ کا اردو خوش خطی کا پیریڈ ہے تو مجھے آپ لوگ پڑھائیں گے۔ کہ اردو کے الفاظ یا حرف کسی طرح لکھے جاتے ہیں۔“ راؤنڈ پر نکلے ابراہیم کے قدم کلاس تھری کے باہر ڈرافٹ پر غصے سے ٹھہر گئے تھے۔

اس سے بڑھ کر ایک ٹیچر کی ٹالاکھی کیا ہوگی کہ وہ چھوٹے بچوں کے سامنے اپنی خامی کا تذکرہ یوں فخریہ بیان کر رہی ہو آج اسے ڈانٹ کھانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا یقیناً ”کو آرنڈ میٹر مسز عارفہ اور مشعل کی انسلٹ ابراہیم کے آفس میں ہونے والی تھی۔ آخر مسز عارفہ نے مشعل کا پیرڈ لگایا ہی کیوں اگر وہ اس مضمون کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔“

”جی تو حرف“ اس کے کتنے شوشے ہوتے ہیں؟ کیا میں نے وائٹ بورڈ پر ٹھیک لکھے ہیں یا کوئی مجھے کرکٹ بتائے (درست) گا۔“ اندر سے آئی آواز پر وہ متوجہ ہوا تھا اور پھر چند سیکنڈ میں وہ جان گیا تھا کہ یہ مشعل کا بچوں کا پڑھانے کا طریقہ ہے جو کافی دلچسپ تھا۔

ٹیچر کو سمجھانے کے چکر میں پوری کلاس پوری توجہ اور شوق سے خوشخطی کے پیریڈ کو اینڈ کر رہی تھی اور ہاتھ کھرے کر کے ٹیچر کو بتا رہی تھی کہ وہ کون سا حرف درست لکھ رہی ہیں اور کون سا غلط۔

”لیجئے مسز عارفہ! آج آپ کی تھری کلاس نے اردو خوشخطی کا پیریڈ شوق سے اینڈ کیا ہے اور سب بچوں

نے نوٹ بکس پر بھی اچھی اور صاف لکھائی۔“ کی کوشش کی ہے یہ وہی کلاس ہے نا جو اردو لکھائی میں کافی خراب جا رہی ہے مسز مریم کو میں بتا دوں گی کہ ان شیطانوں کو کس طرح سے قابو کرتے ہوئے اس سبجیکٹ میں ان کی دلچسپی بڑھائی جا سکتی ہے۔“ کلاس سے باہر نکلتے ہی مسز عارفہ کے ساتھ ابراہیم کی مخالف سمت میں چلتی ہوئی وہ بولی تھی وہ دونوں ہی ابراہیم کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔

اس روز وہ اس لاروہ سی لڑکی کی ذہانت کا تھوڑا سا قائل ہوا تھا اور اس کی پرفارمنس پر ہر طرف سے اطمینان بخش جواب پا کر وہ اس کی بھکانہ کونٹوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھا یہ وہ جان چکا تھا۔

ایک اور یاد فرٹ سیٹ پر آئی تھی تھی۔ جب اس روز ہنگی پھوار میں بچوں کے ساتھ بھگتی بھگتی ہنستی کھلکھلائی اس کے لیوں کو بھی مسکان سے آشنا کر گئی تھی۔ اسی کی طرح شفاف مسکان اور اب وہی اس کے لیوں سے مسکان کو چھین رہی تھی، ایسا دکھ دیا تھا اسے کہ گیلی لکڑی کی مانند سنگ رہا تھا۔

ڈرائیو تک کرنا بھی دیر ہو گیا تھا اس کے لیے۔ ”توجہ ہے مشعل! چلتی پھرتی میوزک ہو یا ر تم تو۔“ وہ اس کی چوڑیوں اور پازیب کی کھٹکناہٹ سے خاموشی سے لیپ ٹاپ پر ضروری کام کرتے ہوئے بولا تھا۔ یہ آوازیں اس کی توجہ کو مرکوز نہیں رہنے دے رہی تھیں۔

جواب میں اس کی ہنسی کی جلتنگ بجی تھی۔ ”لو اس کی کمی تھی“ خواہ خواہ ابجھا۔

”تو یہ بیٹھی ہوں میں مجسمہ بن کر نہ ہلوں گی نہ میوزک بجے گا اور نہ ہی بولوں گی۔“ منہ پھیلا کر وہ ناشتہ کی میز پر اس کے مقابل کر سی پر آن بیٹھی تھی۔

”یار ایک کپ اور کافی بنا دو تم کافی بے حد مزیدار بناتی ہو۔ بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے پھر سٹوڈنٹ فری ہے۔“ لیپ ٹاپ پر تیزی سے کام کرتے ہوئے وہ

مصروف سے انداز میں بولا تھا اور پھر بالکل خاموشی سے چونکا تھا اس کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا تو وہ بالکل سامنے پھولے منہ کے ساتھ بیٹھی نظر آتی۔

اس کے انداز پر وہ بے اختیار ہنس اٹھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

”سوری یار تمہارے۔۔۔ یہ سب ہی انٹرومنٹ مجھے پسند ہیں پلیز میوزک بجاتی میرا مطلب مدھر میوزک بجاتی ایک کپ کافی بنا دو۔ اس کے بدلے میں ذہن میں تمہیں آج تمہارے فیورٹ ریڈیو سٹیشن میں کراؤں گا۔“ ہنسی پر قابو پاتے وہ خوش مزاجی سے بولا تھا۔

اور ناشتہ کی میز پر اخبار پڑھتیں مسز گلزار بے ساختہ ان دنوں کی باتوں اور حرکتوں پر مسکرائی تھیں۔ واقعی مشعل کے سنگ زندگی بنانے کا فیصلہ ان کے بیٹے کا بہترین فیصلہ تھا ورنہ ابراہیم اور یوں ہنسنا ناممکن وہ بے حد سنجیدہ مزاج بلکہ خشک مزاج تھا۔

اس روز اسکول آکر ابراہیم کو بتایا کہ مشعل اسکول چھوڑ رہی ہے اس کی نیبل پر مشعل کا استغنی پڑا تھا۔ دل پہلے ہی رات سے پریشان تھا جب ممانے بتایا کہ مشعل کے گھر سے جواب نفی میں آیا ہے اور پھر اس نے مشعل کے گھر کا نمبر ملا کر مسز گلزار سے بات کر کے اسی وقت ان کے گھر آنے کی اجازت طلب کی تھی اور جواب مثبت پا کر وہ فوراً ”ان سے ایڈریس پوچھ کر ان کے گھر روانہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو مشعل کی پرسنل فائل سے بھی ایڈریس لے سکتا تھا لیکن ان باتوں کا اسے دھیان ہی کب تھا۔

ڈرائنگ روم چھوٹا لیکن بے حد نفیس اور خوب صورتی سے سجایا ہوا تھا۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ تو مسز گلزار چند لمحے ابراہیم سے رسمی گفتگو کرنے کے بعد چائے بنانے کا کہہ کر اٹھ آئی تھیں۔

انہیں ابراہیم بہت اچھا لگا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ ان دونوں کے درمیان جو بھی غلط فہمی ہے وہ بات چیت کے ذریعے دور ہو جائے انہیں اپنی بیٹی پر خود سے بھی



زیادہ اعتماد تھا۔

”میں اس رشتے سے انکار کی وجہ جان سکتا ہوں؟ آخر آپ نے مجھے رعب جھکے کیا ہے تو اتنا حق تو رکھتا ہوں کہ مسترد ہونے کی وجہ جان سکوں۔“ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں آپ کو شروع سے پسند نہیں ہوں۔ میری ہر بات آپ کو بھگانے لگتی ہے۔ کسی نہ کسی بات پر روز میری حاضری لگ جاتی ہے۔ کبھی یہ ڈسپن خراب کیا کبھی وہ ڈسپن توڑا تو پھر رشتہ بھجوانے کو میں کیا سمجھوں۔ یہ آپ کی چال ہے اس طرح آپ مجھ پر اپنا رعب قائم کر ڈالیں میں آپ کے سامنے کچھ نہیں بول پاؤں اور وہ جو آپ کے دل میں باس ہونے کے ناطے میری نفسیت کی خواہش بیدار رہتی ہے وہ یہ رشتہ ہونے کے بعد پوری ہوگی۔ میں آپ کی ساری چال سمجھ گئی ہوں اس لیے انکار کر دیا۔“ مشعل نے گردن اٹھاتے ہوئے جواب دیا اور آخری الفاظ مقابل کی جانب دیکھتے ہوئے کہے لیکن اس کے تاثرات دیکھ کر وہ دل میں سم گئی تھی۔

”ہوں۔ ہوں۔ میرے پیلا اٹکوتے تھے۔ رشتہ داروں نے ہمیشہ ان کے ساتھ منافقانہ رویہ اپنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش رکھی۔ اتفاق سے میں اٹکو تاپنا ہوں ان کا پیلا کو ہمیشہ گھر میں اس تکلیف اور دکھ کے ساتھ دیکھا کہ میں اکیلا ہوں اور کوئی خالص رشتہ نہیں ہے۔ پیلا کو اپنے اکیلے پن کا ایک طرح سے دکھ ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس سوچ سے احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے۔ ماما کو بھی ان کے بہن بھائیوں سے زیادہ ملنے جلنے نہیں دیتے تھے کہ لوگ فریبی ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول ہے جد خاموش، سنجیدہ اور ایک طرح کی اداسی لیے ہوئے تھا۔ میں بھی اس ماحول میں ڈھل کر سنجیدہ مزاج ہوتا چلا گیا اور پھر ایک روز جیسے ہمارا آئی۔ یعنی تم میری زندگی میں آئیں، تمہاری

آن بے ساختہ سی بھگانے حرکتوں پر میرا دل مسکرائے لگا۔ اسکول کو لے کر میں کافی سیریس اور منشن میں تھا لیکن پھر مجھے سب ہی معاملات مجھے محل کرنے اچھے اور آسان لگنے لگے۔ تمہاری قابلیت کا میں چند دن

میں ہی قائل ہو گیا تھا اور پھر تمہاری اس شوخ چٹیل شخصیت نے مجھ پر ایسا اثر کرنا شروع کیا کہ جب ماما نے مجھ سے شادی کے متعلق بات کی تو فوراً ”تمہارا تصور ذہن میں آیا اور میں نے انہیں اپنی مرضی بتادی۔ بس یہی احساسات تھے جو میں نے آپ تک پہنچا دیے۔ اب اگر آپ کو لگے کہ میں کسی سازش اور چال کے بغیر چٹیل کے ساتھ آپ کے ساتھ اپنی سنجیدہ سی زندگی کو قوس قزح کے رنگوں سے بھرنا چاہتا ہوں تو جب اس بار میری ماما میں تو جواب مثبت دے دیتی تھیں گا اور میری دعا ہے کہ آپ کو میرے سچے جذبات پر یقین آجائے۔“ گلا صاف کرتے ہوئے وہ چند لمحے بعد بولا تھا میں میں آپ سے تم اور تم سے آپ کا سفر اس نے بہت تیزی سے طے کیا تھا اور پھر گاڑی کی کیچین نیبل سے اٹھا کر خدا حافظ کہتا ہوا اس کے گھر سے نکلتا چلا گیا تھا۔ اس کی سچائی والدین کو رشتہ بھجوانے سے واضح تھی۔

کوئی وجہ نہیں تھی جو اس رشتے سے انکار کیا جاتا۔ اعجاز صاحب اچھی طرح سے ان کی چھان بین کر دیا تھے۔ مزہ گزار دوبار ان کے گھر آچکی تھیں۔ تیسری بار وہ گلزار صاحب کے ساتھ آئی تھیں۔ دونوں مہاں بیوی مشعل اور اس کے والدین کو نفیس اور سلیبی طبیعت کے مالک لگے تھے مشعل ابرار کے اس عمل سے دل سے قائل ہوئی تھی کہ اس نے اس رشتے کو بنانے کے لیے صاف اور سیدھا راستہ چنا تھا۔ اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجا تھا۔

مالی کو بھی ابراہیم پر بند آیا تھا روز وہ مشعل کا سر کھاتا تھا کہ ہاں کرو اور میری بیوی کے لیے میدان صاف کرو۔ مشعل کی رضامندی یا کردوونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں۔

”ہمارا آئی۔“ \*\*\*  
تو جیسے یک بار لوٹ آئے ہیں پھر بعد میں وہ خواب سارے شباب سارے۔  
”نظم نگینا“ وہ ابرار کے لیے کافی بنانے کی جانب بڑھ گئی ساتھ ہی اس کے کانوں کے پاس شرارت سے چوڑیاں بجائی ہوئی گئی تھیں۔

خواتین اور شہزادوں کیلئے نئی طرز پر ہمارا ہند

## خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2018ء  
کے شمارے کی ایک جھلک



✽ ”اقرار کا موسم“ ایل رضا کاکمل ناول، ✽ میمونہ صدف اور فوزیہ فرخ کے ناولٹ،

✽ ”دیکھتے نہایت روٹی“ مصباح علی سید کاکمل ناول، ✽ آپ کی پسندیدہ مصنفہ ”غیلہ ابرار“ کے ملاقات،

✽ ”دھبہ جنوں“ آمنہ ریاض کا ناول، ✽ ٹی وی فنکار ”علی مرتضیٰ“ سے باتیں،

✽ ”حالم“ نمرہ احمد کا ناول، ✽ کرن کرن روٹی احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،

✽ قائد راہ، داعظہ زیدی، قرۃ العین سکندر، ✽ ہمارے نام اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

عذیب زہرا، ایمن فیاض، اور شینگل کے افسانے،

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔



دیکھنے میں جو آنکھیں میسلی لگتی ہیں  
تینز اُجالے ان کے اندر ہوتے ہیں  
ان کے من میں کئی سمندر ہوتے ہیں  
روشنیوں کے دریا جن میں گرتے ہیں

دیکھنے میں جو آنکھیں بھیگی بھیگی ہیں  
ان کی تہہ میں کئی طوفان ہوتے ہیں

ان کے چہچہے خشک بیاباں ہوتے ہیں  
جن میں دن بھر ریت کے بادل اُڑتے ہیں  
ٹوٹے دل کب جڑتے ہیں

دیکھنے میں جو آنکھیں سہمی سہمی ہیں  
ان کے اندر خواب اُمدتے بستے ہیں  
بچھر بچھر کے گہرے دریا بہتے ہیں  
جن کے کناروں پر خواہش دکھ جیتی ہے  
یوں کب قسمت بنتی ہے  
محمود شام

کبھی تعجیل ہوتی ہے، کبھی تاخیر ہوتی ہے  
مرتب کس طرح انسان کی تقدیر ہوتی ہے  
کسی سائل کی صورت کو کبھی دیکھو تو واضح ہو  
کہ خاموشی میں کتنی دکھ بھری تقریر ہوتی ہے  
زمانہ تو بصورت اُلجھنوں کا ایک چکر ہے  
جدھر بچ کر نکلتا ہوں، وہیں زنجیر ہوتی ہے  
زیادہ عشق کا اظہار بھی خطرے کا سنگل ہے  
مری بات ان کو یوں لگتی ہے جیسے تیر ہوتی ہے  
یہ ڈر ہے کہ کبیرے کی آنکھ خود اندھی نہ ہو جائے  
عدم اس جسم میں کچھ اور ہی تنور ہوتی ہے  
عبدالحمید عدم

یہ اچھا، وہ بُرا ہوتا ہے  
ان باتوں سے کیا ہوتا ہے  
رات گئے بھی آسکتے تھے  
دروازہ تو کھلا ہوتا ہے  
غم کے مارے جو مسکرائے ہیں  
آنسوؤں کو پسینے آئے ہیں  
کیا بلا ہے خوشی، خدا جانے  
ہم تو بس نام سننے آئے ہیں

جب دیکھو اس دروازے پر  
کوئی نہ کوئی کھڑا ہوتا ہے  
مہربانی، اخلاص، ہمدردی  
ہم نے کیا کیا فریب کھائے ہیں

تم تو خوش ہوتے ہو مل کے  
سارا شہر خفا ہوتا ہے  
تیرے جانے کے بعد مدت تک  
روئے ہیں ہم نہ مسکرائے ہیں

صاف نظر آ جاتا ہے وہ  
جس نے پیار کیا ہوتا ہے  
ہائے رے اُن کی یاد کا عالم  
میں یہ سمجھا کہ خود وہ آئے ہیں

چپ رہتا ہوں شعور کے منہ پر  
گو افسوس بُرا ہوتا ہے  
قاصدے اور بڑھ گئے ہیں شمار  
جب کبھی وہ قریب آئے ہیں  
خمار بارہ بنکوی

انور شعور

لڑکی نے بے دلی سے بوائے فریڈ سے کہا۔  
”آج سے ہماری دوستی ختم ہے، ہم ایک  
دوسرے کو دیے گئے سارے گفٹ واپس کر دیتے  
ہیں۔“

لڑکے نے خوش دلی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے.....  
ایزی لوڈ سے اسٹارٹ کرتے ہیں۔“  
لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اوہ..... کیا  
اب میں اپنے جانو سے مذاق بھی نہیں کر سکتی؟“

میاں بیوی میں جھگڑا ہوا تو بیوی نے اپنی ماں  
کو فون کر کے کہا۔ ”میں انہیں سزا دینا چاہتی ہوں  
لہذا میں آپ کے گھر آ رہی ہوں۔“  
ماں نے فوراً اپنی بیٹی کو منع کیا۔

”نہیں بیٹا! ایسا نہ کرو، اس طرح اسے اپنے  
کیے کی سزا نہیں ملے گی۔ تم وہیں ٹھہرو، میں اور  
تمہارے بہن بھائی تمہارے پاس رہنے کے لیے  
آ رہے ہیں۔“

ایک صاحب بہت دیر سے بک اسٹال پر  
سما رک بادکا کارڈ تلاش کر رہے تھے تاکہ شادی کی  
ساگرہ پر بیوی کو دے سکیں۔ ان کی تلاش جب کافی  
طول پکڑ گئی تو میز بین ان کے قریب آیا اور بولا۔

”مسٹر! میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“  
”ہاں..... مجھے کوئی ایسا کارڈ دو، جس کے  
مضمون پر میری بیوی اعتبار کر سکے۔“

ایک لڑکا اور لڑکی پیار میں کامیاب نہیں ہو سکے

تو انہوں نے خودکشی کرنے کا سوچا۔ وہ دونوں ایک  
بلند عمارت کی چھت پر پہنچے۔ پہلے لڑکے نے  
چھلانگ لگائی، لڑکی نے بارے خوف کے آنکھیں  
بند کر لیں اور واپس لوٹنے لگی۔ لڑکے نے اسے دیکھ  
کر ہوا میں پیراشوٹ کھولا اور بولا۔

”مجھے پتا تھا، تم نہیں کودو گی، اس لیے میں نے  
پیراشوٹ ساتھ میں رکھ لیا تھا۔“  
بس اس دن کے بعد سے لوگوں نے ہر  
معاملے میں کہنا شروع کر دیا۔  
”لیڈر فرسٹ۔“

ڈاکٹر نے مریض سے کہا۔ ”کل تمہیں اپنے  
دل کا آپریشن کروانا پڑے گا۔“  
”جینک جناب! میں یہ آپریشن ہرگز نہیں کروا  
سکتا۔“ مریض نے کہا۔

ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔ ”آخر کیوں؟“  
”اس لیے میں اپنا پیار دل کل ہی کسی کو تحفے  
میں دے چکا ہوں۔“ مریض نے جواب دیا۔

ایک جہاز اڑتے ہوئے فضا میں پھولے  
کھانے لگا جس پر مسافروں نے چچنا چلنا شروع  
کر دیا اور ہر طرف ہنگامہ مچ گئی۔ اسی دوران آپتیکر  
پر جہاز کے پتہ کی آواز سنائی دی۔

خواتین و حضرات گھبرانے کی ضرورت نہیں،  
یہ ایک بہترین اپورٹڈ جہاز ہے۔ غیر ملکی ماہرین  
روزانہ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں لہذا آپ بے فکر  
اور مطمئن ہو کر سفر کریں۔ آپ کھڑکی سے باہر  
دیکھیں، نہایت خوب صورت نظارہ ہے۔ شام

ہونے کو ہے، سورج کا سرخ گولا سمندر میں غروب  
ہو رہا ہے۔ لوگ رنگ رنگ کی کشتیوں میں سفر  
کر رہے ہیں آپ ایک لال رنگ کی کشتی دیکھ رہے  
ہوں گے..... میں اسی کشتی سے بول رہا ہوں۔

میاں، بیوی نے شادی کی پہلی سالگرہ پر  
ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ بیوی نے بڑے جاؤ سے  
اپنے ہاتھ سے کھانے تیار کیے تھے۔ مہمان جمع تھے،  
خوش ملیکوں اور مشروبات وغیرہ کا دور چل رہا تھا،  
ایک دوسرے کو لطفینے سنائے جا رہے تھے، قہقہے گونج  
رہے تھے۔

شوہر نے بیوی سے دریافت کیا۔  
”کیا خیال ہے بیگم! مہمانوں کو کچھ دیر اور  
لطف اندوز ہونے دیا جائے یا کھانا لگوادیا جائے۔“

شوہر: ”تم میرے ساتھ واک پر چلو گی؟“  
بیوی: ”تمہارا مطلب ہے کہ میں مولی ہوگی  
ہوں؟“

شوہر: ”اوکے، نہیں نہیں! پسند نہیں تو مت  
چلو۔“

بیوی: ”تمہارا مطلب ہے کہ میں سست ہوں؟“  
شوہر: ”غصہ کیوں کر رہی ہو؟“

بیوی: ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ہمیشہ جھگڑا  
کرتی ہوں؟“

شوہر: ”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“  
بیوی: ”تمہارا مطلب ہے، میں جھوٹ بول  
رہی ہوں؟“

شوہر: ”اوکے بابا! مت جاؤ، میں اکیلا ہی چلا  
جاتا ہوں۔“

بیوی: ”مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اکیلے ہی کیوں جانا  
چاہتے ہو؟“

شوہر: ”آف۔“ (اس نے اپنے سر کے بال  
اپنی ٹمٹی میں جکڑ لیے)۔

ایک ٹی وی چینل کارپورٹر ایک کسان کا انٹرویو  
لے رہا تھا۔

صحافی: ”آپ اپنے بکرے کو کیا کھلاتے  
ہیں؟“

کسان: ”سیاہ یا سفید کو؟“

صحافی: ”سفید کو۔“

کسان: ”گھاس۔“

صحافی: ”اور سیاہ کو؟“

کسان: ”اسے بھی گھاس.....“

صحافی: ”آپ ان بکروں کو باندھتے کہاں  
ہیں؟“

کسان: ”سیاہ یا سفید کو؟“

صحافی: ”سفید کو۔“

کسان: ”باہر کے کمرے میں۔“

صحافی: ”اور سیاہ کو؟“

کسان: ”اسے بھی باہر کے کمرے میں۔“

صحافی: ”اور انہیں نہلاتے کہاں ہو؟“

کسان: ”سیاہ کو یا سفید کو؟“

صحافی: ”سیاہ کو۔“

کسان: ”جی پانی کے ٹکے کے نیچے۔“

صحافی: ”اور سفید کو؟“

کسان: ”جی اسے بھی پانی کے ٹکے کے  
نیچے۔“

اب تو صحافی کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔  
وہ بولا۔

”حق آدمی! جب دونوں کے ساتھ سب کچھ  
ایک جیسا کرتا ہے تو مجھ سے بار بار کیوں پوچھتا  
ہے؟“

کسان: ”اب پتا چلا..... جب تم ایک ہی نیوز  
کے چند جملوں کو سارا دن گھما پھرا کر دکھاتے ہو،  
اس وقت ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے۔“

# نکالت کی کون سی سیل کا نکال دے

شفیقہ تبسم کتاب کر دو کے کھم شدہ باب کھے ہیں ترے نیلے کے پیچھے بھی ہمارے خواب کھے ہیں رہا ہے چوہدری مدد کے انتظار میں جس کے زندگی بتانی تھی راہ اس نے آمد کی مدتوں دکھائی تھی آج ہو گیا رخصت اک چراغ سا چہرہ جس نے غم بھر سب کو روشنی دکھائی تھی شبہ صنف لاکھوں اس طرح چھوڑ دوں تمہیں جاناں تم میری زندگی کی عادت ہو داستان ختم ہونے والی ہے تم میری آخری محبت ہو لیڈا رب نواز وہ حیوانی ہنکر وقت رہتا نہیں کہیں تک اس کی عادت بھی آدمی سی ہے بشری جاوید قریشی پھر اڑ ہم سے پوچھو مزاج بارش کا ہم جو بچے مکان والے ہیں حافظ اقبال جاوید نور اپنی شیشہ گری کا ہنر نہ کرنا آج میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے زارا ڈوگر ان کو مزاج پر سیر کی فرصت نہیں ہے گر ہم کو بھی گوئے یاد کی عادت نہیں رہی تنہائیاں ہوئی ہیں مری جب سے غم گسار مجھ کو تمہارے پیار کی عادت نہیں رہی

نوال افضل گمن نگر ات وہ عادت ہے تو عادت سے کنارہ ہو بھی سکتا ہے مگر اس سادی کو شش میں خضارہ ہو بھی سکتا ہے ہمیں حیرت سے مت دیکھو، اب ایسا کیا کیا ہونے نسیمی عشق ہے ماحب دوبارہ ہو بھی سکتا ہے مرزا اقبال ہسکانہ بلے دل، سو شکرانیت بھی چھوڑ دینی غویسے بھی اب فراہ کی عادت نہیں رہی کیا عشق کیا جنوں یہ ہم سے نہ پلے چھوے اس راہ غار دار کی عادت نہیں رہی خجہ اکرم اپنے حصے کی چال تم چل بیٹھے ہمارے منظور دہنا، کھاتی ختم کرنی ہے رابعہ بھری ہم شہر جاں میں آخری نغمہ سنا چکے سمجھو کہ اب تمہارا تماشا ختم شدہ سیدہ نوباحلا سہلست کھلے ذرا سی تو بانی بانی ہو میں چاہتا ہوں کہ دشمن بھی خانہ دل پر شازہ سعید اندھیرے سے لڑائی کا، یہی احسن طریقہ ہے تمہاری دسترس میں جو دیا ہو، وہ جلا دینا فریحہ فیصلہ جن جن کو تمہاری عشق کا آزار مر گئے اکثر ہمارے ساتھ گئے بیمار مر گئے اقبال عزیز عکس عکس گمان گمان، حیاں سارے مسترد تو نہیں تو کچھ نہیں، سارے سہارے مسترد

آسمان جاوید کیا کرے میری مسیحا بھی کرنے والا زخم یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا شامل ہونے کو ہے اور آنکھوں میں کھلبلی نہیں اس گھر میں نہیں کوئی روشنی کرنے والا ناویہ انٹرف ہم نے تمہارے بعد نہ رکھی کسی سے کس ایک تجربہ بہت متاثر بڑے کام آگیا فوزیہ شریف راز دل نہ سنا ناکی کو سماعز دنیائیں ہم راز بدل جاتے ہیں کسی سے مجھ گئے کوئی مروت نہیں جانا ہاں مگر مینے کے انداز بدل جاتے ہیں نرینب کبھی سائیاں نہ تھا ہم، کبھی کبکشاں بھی قیام نہیں بے مکان کبھی لارکھاں میری آج بھی غمزدگی آسے پایا اسے کھو دیا بھی شمس دیا بھی رو دیا بڑی مختصر ہے یہ داستان مری آدمی عمر گزر گئی عائشہ مرزا سنا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ بچوں کو سکھاد رہی تھی محبت ایسے لکھتے ہیں اقبال عزیز اس نے حب پکوں کو جنش دی عدم رائیگاں گفتگو کے سب فن گئے تسلیم اختصار وہ جنگل کے پھولوں پہ مڑتا ہے کیوں اس کو اچھے لگتے ہیں دیرانے کیوں محسن جب کبھی چوٹ نئی کھالیتا ہوں دل کو یاد آگئے ہیں یاد پرانے کیوں شفاعت بتوں ادا اس مست ہو کہ موسم بدل رہا ہے یہاں وہ دیکھ بٹاٹ سے پتا اٹل رہا ہے یہاں نہ وہ انجمن آرائیاں ہیں اور نہ چراغ بس ایک دل ہے سو مدت سے مل رہا ہے یہاں

نین تارا میں عمر بھر نہیں رويا، مگر ہنسنا بھی نہیں یہ دل کسی کا نہیں تھا مگر کسی کا رہا بقیس ریاض ہنسنے ہوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت روئے کی یہاں ویسے بھی فرصت نہیں ملتی کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی غصا ہیں ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی شاہل انور مار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں غم بھر کے لیے آزار ہوئی جاتی ہے یاسین کنول اک تمنا یہ لے کے پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہیں جے وہ ملتا نہیں یہ دکھائے گی امد کیا ہم تو بھید قسمت کا ہم پہ نکلتا نہیں افشاں مرزا خوشی سے ہم نے بے وفائیاں کیا کیا ذرا سے لطف سے نکلیں بھرا آج کیا کیا اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی تم آشنائیتھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا مدرثرہ سلیم ایک دل ہے کہ سایا نہیں جاتا ہم سے لوگ محلوں کو گھزار بنا دیتے ہیں صدق عمران کیا کہوں، دل پہ قیامت سی گزرجاتی ہے اتفاقاً جو کسی آنکھ میں آنسو چکے کتنی عزیزوں کو تیرے نام سے شوق کیا میری خواہش تھی مجھے شہر میں اک توپ چکے



**رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،**  
حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میں جبینہ قبیلہ کی ایک شاخ حرقہ کی طرف (لڑائی کے لیے) بھیجا۔ چنانچہ صبح صبح ہم ان کے پانی کے چشموں پر حملہ آور ہو گئے (لڑائی کے دوران) میری ابدانہاری کی مدد بھی ان کے ایک آدمی کے ساتھ ہوئی جب ہم نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تو اس نے (کلمہ) پڑھا۔ لا الہ الا اللہ جس پر (میرے سامنے) انصاری نے تو اپنا ہاتھ دوک لیا لیکن میں نے اپنا نیزہ مارا۔ حتیٰ کہ اسے قتل کر دیا۔ جب ہم مدینہ واپس آئے تو یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔  
”اے اسامہ! کیا تم نے اسے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کر دیا؟“  
میں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس نے تو صرف جان بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پھر) فرمایا۔  
”کیا تم نے اسے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کر دیا؟“  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی فقرہ بار بار دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے آرزو کی کہ میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔  
(یعنی اب مسلمان ہوتا تاکہ میرے ہاتھوں ایک نو مسلم کا قتل تو نہ ہوتا)  
(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :-  
ظاہری حالات پر اسلام کے احکام کا فیصلہ ہو گا۔ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح

انتقامی کارروائیوں سے روک دیا گیا ہے ورنہ کوئی بھی شخص اپنے دشمن کو قتل کر کے دھوا کر سکتا ہے کہ اس نے اسلام کا جھوٹا دعوا کیا ہے۔ جیسا کہ آج کل اکثر توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگا دیا جاتا ہے چنانچہ باطنی کیفیت کی کھوج لگانے کو میرے سے عزیز و دی قریب دے دیا گیا اور صرف ظاہر و معاملہ کر کے کی تاکید کی گئی۔

**مہمان،**  
ایک دن امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ روئے گئے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟  
آپ نے فرمایا۔  
”اس لیے رو رہا ہوں کہ مات دن سے کوئی مہمان گھر نہیں آیا ہے۔“

**ریاکاری،**  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اپنا سر نیچے کیے ہوئے ہے یعنی یہ ظاہر کر رہا تھا کہ میں بارگاہ ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا۔  
”اے عروں! کچھ کرنے والے، گردن سیدھی کر۔  
تواضع اور خاکساری کا تعلق دل سے ہے گردن نہیں۔  
برائی کا ساتھ دینا،

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف بن زون علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ میں تمہاری قوم سے ایک لاکھ آدمیوں کو ہلاک کروں گا۔ جس میں اسی ہزار ایک افراد ہوں اور میں ہزار گنہگار۔  
حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا۔ یہ

نیک لوگ کیوں ہلاک ہوں گے؟  
اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”اس لیے کہ انہوں نے ان شر پسندوں اور خطاکاروں کو اپنا دشمن نہیں سمجھا اور ان کے ساتھ کلمے پیئے، آٹھ بیٹھے اور دوسرے معاملات کرنے میں کوئی احتراز (دور در ہٹا) نہیں کیا۔“

### توکل،

مولانا محمد علی جوہر جیل میں نظر بند تھے۔ ان کی اہلیہ جیل خانہ میں ان سے ملاقات کے لیے گئیں۔ انہوں نے اپنے شوہر مولانا محمد علی جوہر سے کہا۔

”تم ہماری فکر نہ کرنا۔ اللہ ہی پہلے بھی رازق تھا اور اب بھی وہی رازق ہے۔ تم صرف ایک واسطہ تھے اور اللہ بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا۔

”رہا تمہارا کام، اس کو اگر اجازت ہو تو میں کرتی ہوں۔“  
چنانچہ انہوں نے ”کام“ شروع کیا اور دوسرا کے عرصہ میں پینتالیس لاکھ روپے کا چنڑہ خلافت تحریک کے لیے جمع کر لیا۔

### اسلام کی سیٹائی،

یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ ساری دنیا میں یورپ کی عیسائی قوموں کا غلبہ تھا۔ قاہرہ کے ایک عیسائی پادری سے ایک شخص نے پوچھا۔  
”آپ کتنے دنوں سے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟“  
”پچاس سال سے“ پادری نے جواب دیا۔  
”اچھے دنوں میں کتنے مسلمانوں نے عیسائیت کو اختیار کیا؟“ اس کا اگلا سوال تھا۔  
”تقریباً ڈیڑھ سو“ پادری نے کہا۔ پھر فوراً ہی بولا۔  
”لیکن یہ کوئی قابل اطمینان بات نہیں ہے؟“

”کیا مطلب؟“ اس شخص نے سوال کیا۔  
پادری نے کہا۔ ”وہ بیسے کے لیے عیسائی تو ہو جاتے ہیں لیکن پھر موت کے وقت تو بکر لیتے ہیں۔“  
یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے کہ بہت کم مسلمان اسلام لانے کے بعد عیسائیت یا کوئی اور مذہب اختیار کرتے ہیں جبکہ اسلام مسلسل پھیل رہا ہے۔

### باتیں اشفاق احمد کی،

وہ اللہ کے دے ہوئے میں سے دیا کرو، تم نے کون سا پتہ چنے سے دینا ہوتا ہے۔  
وہ جب آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے ہیں تو قبولیت کے سمندر میں مژدہ لہلہا جاتی ہے۔

وہ جب انسان اندر سے مر جاتا ہے تو وہ حد سے زیادہ خوش اخلاق ہو جاتا ہے۔

وہ دنیا میں کبھی کسی اچھے انسان کو تلاش مت کرنا بلکہ خود اچھے بن جانا اس سے کبھی اور کی تلاش ختم ہو جائے گی۔

وہ قاتلوں کے مرنے پر نہیں بلکہ احساس کے مرنے پر برہمنی جاپے کیونکہ لوگ مر جائیں تو میر آجاتا ہے، احساس مر جائے تو معاشرہ مر جاتا ہے۔

وہ انسان کے اور کبھی طرح کا بوجھ ہوتا ہے۔ ہمارے اور رتب سے بڑا بوجھ تکبر کا ہوتا ہے اور ہم یہ جانتے بغیر کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون بڑا ہے اور کون چھوٹا، فیصلے خود ہی کرتے رہتے ہیں۔  
وہ ہم اللہ کے لاڈلے مزدور ہیں مگر اتنے بھی نہیں جتنا ہم خود کو سمجھتے ہیں۔  
سعدیہ و حیدر سعدی۔ اسلام آباد

### کم غذا،

ایک شخص نے ایک دیہاتی آدمی کو دیکھا ساتھ سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ خوب تندرست اور سرگرم دکھائی دیتا تھا۔  
”آپ کی صحت کا راز کیا ہے؟“ اس نے پوچھا





خط بھجوانے کے لیے پتا  
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔  
Email: shuaa@khawateendigest.com

کے بعد؟ ایک درخواست کے ساتھ حاضر ہوں اپنی کم شدہ مصنفات کی واپسی کے ساتھ۔ فرحت اشتیاق نے کافی عرصے سے اپنی آمد بند کردی اور پھر بیونہ خورشید نے تو اتنا لمبا وقفہ دے رکھا ہے کہ.....؟ تین عدد جن سسٹرن نے نہ ہواؤں نہ بارشوں نہ فوٹو، مشوں نہ موسموں کی کوئی رقم جھم پڑتی چھواروں جیسی تحریر بھیجی اور عالیہ بخاری کی تحریروں میں ٹھہراؤ آ گیا۔ بشری احمد، آمنہ ریاض، ساجدہ حبیب، عمیرہ احمد کدھر ہیں یہ سارے پیرے جو اہر اہت ان سب کو برآمد کیا جائے۔ کوشش، کوشش اور پھر کوشش کیا یہی زندگی نہیں ہے تو پھر کیجیے۔ میں نے عرصہ ڈیڑھ سال سے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ زندگی کا تاریک اندھیرا کچھ روشنی میں آیا پھر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت لوٹنے لگی۔ اللہ کرے دماغ صحیح رہے جو ایک دشمن نمائندگی نے مفلوج کر دیا تھا اپنی بے بسی کی ظالم حرکات و اعمال سے۔ یہاں سے یاد آ یا کہ۔

اس ماہ جب تجھ سے نانا جوڑا تھا میں پشانی بہن

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔  
آپ کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔ پہلا خط نوشہرہ جلیمرہ سے مدثرہ سلیم کا ہے۔ جتنی ہیں۔  
فروری کی شروعات بہت اچھی رہی ایک تو یہ کہ ہمارے گھر مستورات کی جماعت ٹھہری، جس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا دوسرا میں نماز کی پابندی کرنے لگی ہوں۔  
پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں سنا آپ بہت نیکی کا کام کر رہے ہیں اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے دین کے بارے میں ”خواب شیشے کا“ میری فیورٹ اسٹوری ہے اور ہر ماہ میرا پسندیدہ کردار ”شہر زاد“ پھر وہی بات صائمہ جی! آخر یہ ہم زاد ہے کون؟ اب بتا بھی دیں ”سنہری دھوپ“ بہت سلو چار رہی ہے فرزانہ کھرل آپ کا نام ہی کافی ہے سب سے پہلے آپ کا ناول پڑھا کیا زبردست تھا شعب کا کردار مجھے بہت پسند آیا ”محبت تمہارے نام“ ویل ڈن سدرہ انتہی۔

”آؤ لالہ لگاتے ہیں“ ام ایمان قاضی کی اچھی کاوش تھی۔ افسانوں میں ”چانن روٹھ گیا“ دو آئسو آنکھ سے نکل کر دوپٹے میں جذب ہو گئے جانے کیوں؟ بانی افسانے زبردست تھے پیارے کے سارے ہی فوریہ فرخ کا ”عروں کے سلسلوں“ پسند آیا۔ کوثر خالد جی اس دفعہ کیوں غائب ہیں ناظمہ زیدی، فوزیہ شریث آئی لائیک پو وہ ہماری نسبت زہرہ تو پھول ہی ہیں۔ یہ ساری پرانی رائیٹرز کہاں کھو گئی ہیں۔ شمرہ بخاری کیا جواہری شلی سے ہم اب بھی نہیں مل سکتے ناظرہ افتخار ”داسی دھولن پاروی“ کی طرح نیا ناول کب لائیں گی سیر احمد علیز ”یادم“ کا دوسرا حصہ ”کارل“ کب آئے گا۔

ج: پیاری مدثرہ! بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ نماز کی پابند ہو گئی ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سیر احمد ”یادم“ کا دوسرا حصہ تو نہیں لیکن بہت جلد آپ کے لیے ایک نیا ناول لکھیں گی۔  
شمرہ احمد نے لکھا ہے  
کیا اب کراچی میں اصل امن و امان ہے آپریشن

ہوئی تھی۔ اس لیے میں پانی نہیں پیتا۔  
حضرت سلیمانؑ نے پوچھا: تو نے آبادی کو کیوں خیر باد کہہ دیا اور دیرانے میں رہنا تو نے کیوں پسند کیا؟  
اس نے کہا: ”دیرانہ رب تعالیٰ کی میراث ہے“  
میں رب تعالیٰ کی میراث میں رہتا ہوں، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے۔  
حضرت سلیمانؑ نے پوچھا: ”جب تو کسی دیرانے میں بیٹھتا ہے تو کیا بولتا ہے؟“  
اس نے کہا: ”میں یہ کہتا ہوں، وہ لوگ کیا ہوئے جو اس جگہ مزے سے رہتے تھے؟“  
حضرت سلیمانؑ نے پوچھا: ”جب تو آبادی سے گزر رہا ہے تو کیا کہتا ہے؟“  
الو نے کہا: ”اس وقت میں یہ کہتا ہوں ہلاکت ہو

بنی آدم پر ان کو نیند کیسے آ جاتی ہے۔ سلا لکڑی مصائب کے طوفان ان کے سامنے ہیں؟“  
حضرت سلیمانؑ نے کہا: ”تو دن میں کیوں نہیں نکلتا؟“  
”انسانوں کے ایک دوسرے پر ظلم کرنے کی وجہ سے میں دن میں نہیں نکلتا“  
حضرت سلیمانؑ نے کہا: ”اچھا مجھے بتا کہ تو برابر بولتا رہتا ہے۔ اس میں حیرت کیا پیغام ہے؟“  
الو نے کہا: ”میرا پیغام یہ ہوتا ہے، اے غافل لوگو! زاد راہ اور اپنے سفر آخرت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ نور پیدا کرنے والی ذات پاک ہے۔“  
اس وقت حضرت سلیمانؑ نے فرمایا ”پرندوں میں ان سے زیادہ انسانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد کوئی نہیں ہے۔ اور جانوں کے دلوں میں ان سے زیادہ کوئی پرندہ برا نہیں ہے۔“  
(حیاء الطیوان، جلد دوم)



تو دیہاتی نے جواب دیا۔  
”میرے سامنے جب بھی یہ سوال ہوتا ہے کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں تو میں ہمیشہ ”نہ کھاؤں“ کو ترجیح دیتا ہوں۔“  
سقراط کا کہنا ہے۔  
”اس وقت تک نہ کھاؤ جب تک تم بھوک سے بے تاب نہ ہو جاؤ۔“

**وضاحتیں،**  
صرف غلط ہونے پر وضاحتیں نہیں دی جاتیں۔ کئی بار ہم وضاحتیں اس لیے دیتے ہیں کہ سامنے والا ہمیں عزیز نہ ہوتا ہے۔  
مدیر سحر نورین مہاک۔ ریگرات

**خیر خواہ پرندہ**  
ابو نعیمؒ نے ”علیہ“ میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک دفعہ میں امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہاں حضرت کعبؓ اخبار بھی موجود تھے۔ کعبؓ نے حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔  
”اے امیر المومنین! کیا میں آپ کو ایک نہایت عجیب فقہ نہ سناؤں، جو میں نے انبیاء کے حالات کی کتاب میں پڑھا ہے۔ وہ فقہ یہ ہے کہ ایک بار حضرت سلیمان بن داؤد کے پاس ایک (تو) (ہمارے) آیا اور آکر کہا۔  
”السلام علیک یا نبی اللہ!“  
آپ نے جواب دیا ”وعلیک السلام یا ہامہ؟“  
پھر حضرت سلیمانؑ نے اس سے پوچھا: ”اچھا مجھے بتا کہ تو دکانے کیوں نہیں کھاتا؟“  
اس نے جواب دیا۔  
”حضرت آدمؑ کو اس وجہ سے جنت سے نکالا گیا۔“  
پوچھا: ”اچھا تو پانی کیوں نہیں پیتا؟“  
الو نے کہا: ”اس میں تو نم تو ب کھاک

نے اتنا اچھا اپنے خیالات کا اور زندگی کا رنگ لکھا بات روز  
ازل کی طرح صاف عیاں ہے کہ جیسے نیکی، ہمدی ہیں ویسے  
ہی اچھے برے لوگ، ظالم، مظلوم ہیں کہ کسی کے ساتھ  
زندگی میں ظلم ہوتا ہے اور زندگی اندھیروں میں بھٹکانی  
جاتی ہے۔

سچ: پیاری شہزادیہ حقیقت ہے کہ لوگ ظالم ہوتے ہیں، اپنے مذموم مقاصد کے لیے دوسروں کی زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔ آپ کی دوست نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ آپ کی ہنسی تخلیقی زندگی کو مسائل اور مصائب میں پھنسا دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے مشکلات اور مسائل کا سامنا بہت اور بہادری سے کیا اور اب بچوں کو تعلیم دے رہی ہیں جو بلاشبہ ایک عظیم کام ہے۔ جو پھر آپ کے ساتھ ہوا اسے اپنی طاقت بنالیں۔ اس کا مقابلہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کو شکر کرنے والوں کو کامیابی دیتا ہے۔ وقت کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ گزر جاتا ہے یہ وقت بھی گزر جائے گا۔

پرائی مصطفیٰ کی وی پر مصروف ہیں۔ ہم آپ کا پیغام ان تک پہنچا رہے ہیں۔ دیئے فخرہ میں نے کالی عرصہ بعد لکھا ہے۔ جو خواتین کے فردوں کے شارے میں شائع ہوا ہے۔ آئندہ بھی خواتین میں ناؤں لکھ رہی ہیں۔

فائزہ بھٹی نے چٹوکی سے لکھا ہے  
 سرورِ حق بہترین رہا۔ رنگِ برگے دھماکوں والے  
 جھمکے تو زیادہ ہی پہننے جانے لگے ہیں۔ ”پہلی شعاع“  
 ”حم و نعت“ کے بعد احادیث کی جانب رخ موڑا  
 (جزاک اللہ)

اقراء جٹ نے مخن آباد سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں  
 فردی کا سرورق الفاظ نہیں بیاں کے لیے، شعاع  
 کا ٹاکل تو ہر دفعی بہت زبردست ہوتا ہے۔ کسی پارک یا  
 کھیتوں وغیرہ میں بھی ایک زبردست سا ٹاکل دے  
 دیں، کمال لگے گا (ذاتی رائے) ”پہلی شعاع“ دل جمعی  
 سے پڑھی۔ ایک ایک بات سن میں اتر گئی ”حمد و نعت“  
 سبحان اللہ، سبحان اللہ، قلب دروہ اسیر ہو گئے۔ ”بیادے  
 نبی کی پیاری باتیں“ بہت ہی زبردست سلسلہ ہے۔  
 ”جب مجھ سے نانا جوڑا“ آسیہ ملازم حسین بہت اچھا لگا  
 انٹرویو، ڈھیر ساری دعائیں آپ کے لیے (مجھے بھی بیوچ  
 بہت پسند ہیں) ہندھن میں شگفتہ یاسمین ہمراہ ڈاکٹر شاہد  
 ماشا اللہ اچھا پل ”دستک“ نیلم منیر اور خالد بٹ سے  
 ملاقات اچھی رہی۔ ”خواب شیشے کا“ بہت عمدہ جارہا ہے  
 ”شہر زاد“ جان ہے ہماری یہ ناول ”سنہری دھوپ“  
 زبردست جارہا ہے۔ ”مہمت جوڑی جیسی“ فرزانہ کھرل  
 بہت اچھا لکھتی ہیں آپ مگر بھول بھلیاں میں پہلے گم ہونا  
 پڑتا ہے پھر منزل لکھتی ہے۔

”مہمت تمہارے نام“ سدرۃ المنتہی ویڈن جی!  
 ”عمروں کے سلسلوں“ فوزیہ فرخ ٹاکس تحریر ”آؤ لالہ  
 اگاتے“ ام ایمان قاضی ہر باری کی طرح نہایت عمدہ!  
 افسانے (سنہری خواہش) سعید عمر جی موضوع  
 بہت اچھا تھا۔ گل فروش قرۃ العین کمال گردیا۔ فیصلہ نور  
 الصباح بہت اعلیٰ بہت اعلیٰ ”چائون روٹھ گیا“ عظمیٰ اختیار  
 زبردست۔

”خط آپ کے“ سب کے اچھے لگے۔ ”موسم کے  
 پکوان“ اسپانسی ”نارنج کے جھروکوں“ بہت اعلیٰ سلسلہ  
 ہے۔ مختلف بادشاہوں کے دور بتائیں باری باری۔ آئی  
 رضیہ جمیل آپ کے جواب ہمیں بہت پسند ہیں۔ بشانکہ  
 بھابی، پھوپھو، آئی سرین، سیکین میڈم اور بھائی عرسب کو  
 سلام اور بانی تمام کزنز، فرینڈز جو پڑھ رہے ہیں اسی کے  
 ساتھ اللہ حافظ۔

ج: پیاری اقراء! ہمیں افسوس ہے آپ کا خط شامل  
 نہ ہو سکا۔ سب کیا بتائیں کبھی ڈاک میں تاخیر وجہ بنتی ہے تو  
 بھی صفحات کی بجوری آڑے آ جاتی ہے۔  
 ٹاکل کے سلسلے میں آپ کی تجویز اچھی ہے لیکن کراچی  
 میں تو کھیت کیا اب ہزہ بھی خال خال ہی نظر آتا ہے۔

آپ کے تمام عزیز واقارب کو سلام پہنچا رہے  
 ہیں۔ لیکن ایک بات بتانا چاہتے ہیں کہ یہ سلسلہ سلام دعا  
 کے لیے نہیں ہے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکر ہے۔  
 کوثر خالد نے فیصل آباد سے شرکت کی ہے جتنی ہیں  
 دبیر ہماری نئی کتاب ”منہر نسیم“ جھولی میں ڈال  
 گیا۔ اور جنوری بنی کا مقدر چکا گیا۔ 19 اپریل کو وہ  
 ”سرتاج ولا“ ہوگی ان شاء اللہ اور شیخ یاسر کھلائے گی۔ جو گھر  
 کے سامنے ہے چار گھر چھوڑ کر۔ رشتہ میں نے کیسے جوڑا۔  
 دعا میری مرضی خدا کی۔ مگر خوفناک حالت صرف بیٹے نے  
 کی۔ افسانہ بن سکتا ہے مگر کھلے کون؟ چلیے تبصرہ کی طرف۔  
 سرورق روشن سا پہلی شعاع صرف اور صرف ہر لمحے ہر پل  
 اللہ کا ذکر اور بدیوں کا خاتمہ اک ماں ہی کر سکتی ہے۔ بجا  
 فرمایا۔ اچھی ماں..... اچھی اولاد..... دادی معذور۔ گھر  
 چھوڑ کر اکیلی اگر گھنٹوں کہیں چلی جاؤں۔ دروازے کھلے  
 رکھ کے تو الحمد للہ میرا اللہ حفاظت کرتا ہے۔ ذکر کی  
 بدولت حمد و نعت دونوں زبردست داعلا۔

”نبی کی باتیں“ سر آکھوں پراوردل میں رحمت بن  
 کر چھا گئیں۔ ”ہندھن“ شگفتہ شگفتہ تھا۔ ”دستک“ نیلم نام  
 بہت پسند ہے۔ ناول شیشہ و شہر زاد۔ دونوں میں ظالم و  
 جابر کردار دکھائے گئے ہیں۔ اچھی بچانا ”گل فروش“  
 اچھی لگی۔ محبت ہو تو ایسی ہو۔ یاد آ یا غریب کے دنوں میں  
 خالد کو سرمنی موٹا سوئیٹر لٹہ سے لگا کر دیا تھا۔ انہیں اچھا  
 لگا۔ تو حالات اچھے ہونے پر پھر پانچ سو کا نیا سرمنی سوئیٹر  
 بھی لا دیا۔ وہ بتاتے۔ دوست کہتے ہیں۔ یار تیری بیوی یا  
 بھابھی کی پسند بہت اعلیٰ ہے۔ اسی طرح شکر قدی تو ہے پر  
 پکانے کی تحریف بھی دوستوں سے آئی۔ ”جان روٹھ گیا“  
 قلم تو اچھا ہے مگر ایسی محبت؟ خدا سب کو ذلیل ہونے سے  
 بچائے۔ محبت صرف خدا سے اور اس کے تمام بہترین  
 بندوں سے ہو تو سمجھو بیڑا پار۔ ہماری عظمیٰ چھٹی میں۔  
 دیدار میرٹھک میں۔ ملاقات ماموں کی شادی پر خالد سے  
 ہوئی۔ اتنے حسین کہ نظر اٹھی مگر چوری تنہائی میں بھی بات  
 تو کیا دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ جب ساس نے کہا کہ کوثر ٹینک  
 اتار نہیں سکتی شادی کے بعد خط لکھا۔ اگر آپ لوگوں کو  
 ٹینک نہیں پسند تو رشتہ تو ڈو۔ جواب آیا ”کچھ نہیں کہتے۔“  
 بعد میں ہماری حق گوئیاں انہیں ”جن“ لگیں۔ اور پیر سے  
 72 ڈنڈے بڑھوائے گئے۔ میری ماں اور خالد کے

سامنے۔ ہم روتے تو کسی کو ترس آتا۔ کلمہ کا ورد زبان پر  
 تھا۔ درد کہیں نہ تھا۔ آج وہ ”پیر“ یادداشت کھوئے۔  
 گردے ٹھل۔

”نارنج کے جھروکے“ نوری نوری۔ ”خوب  
 صورت بنے“۔ صائمہ! تم نے وہ وقت کیسے گزارا ہوگا؟  
 ہمیں یہ راز بچپن سے پتا ہے۔ جناب والا مسئلہ کوئی بھی  
 ہو۔ صدقہ اور ذکر اللہ ہر پل تو پھر۔

ج: پیاری کوثر! آپ ہماری اس محفل کی رونق ہیں۔  
 آپ کی عدم موجودگی کو ہم اور ہمارے قارئین بھی بہت  
 محسوس کرتے ہیں۔ کئی قارئین نے خطوں میں آپ کے  
 بارے میں استفسار کیا۔

پیاری شمع کا رشتہ طے ہونے پر مبارک باد۔ ہماری  
 دعا ہے کہ تجیر و خوبی ان کی شادی انجام پائے اور انہیں  
 ڈھیر ساری خوشیاں نصیب ہوں۔ آئیں  
 افراتیزر جلبانی نے گاؤں در پاخان سے شرکت کی  
 ہے، لکھتی ہیں

آپ کو خط لکھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس گوگی  
 سردی نے اپنا کام دکھایا۔ فلو اور نزلہ زکام نے ایسا جکڑا کہ  
 پورا کر دیا میں نے بھی گلاب جامن جلیبیاں کھا کے زکام کو  
 بھگایا۔

میں دعائیں دیتی ہوں شعاع اور خواتین کو! ان کی  
 پوری ٹیم کو خاص کر عمیرہ احمد، سمیرا حمید، نمرہ احمد، عزیزہ سید کو  
 جن کی لازوال تحریروں نے ہمیں بھی بھگتے بابا یوں ہونے  
 نہیں دیا۔ نمرہ نے کہا تھا۔ ”لوگوں کی مخالفت کو انکسور کرنا ایک  
 آرٹ ہے۔“ یقین کریں ہم اس آرٹ سے مالا مال ہیں  
 سائرہ رضائے کہا ”ہم کون ہوتے ہیں۔ کسی کے ایمان پر  
 فتویٰ لگانے والے۔“ یقین چاہیے ہم اپنی آنکھوں سے  
 منافقت سازشیں دیکھتے لیکن پھر بھی چپ چاپ رہتے ہم  
 اداس مایوس ہوتے تو ہمیں عمیرہ احمد یاد آتی ہیں۔ ”پتا نہیں  
 ہم کتنے نمون، کتنے کافر ہیں لیکن جو بھی ہیں اللہ ہمارے  
 دلوں سے بے خبر نہیں۔“ جہاں ہر طرف گھٹو ماحول گھٹو باتیں  
 دیکھتے فوراً نمرہ کی بات یاد آتی۔

”ثبت سوئیں اٹھا کہ آپ سے ثبت شعاعیں  
 پھوٹے لگیں۔ کوئی امید کوئی آس نہ ہونے کے باوجود ہم  
 مثبت پوائنٹ ڈھونڈ نکالتے۔ مختصر یہ کہ ہم سکس اسٹار  
 گروپ نے جو بھی سیکھا ہے آپ ہی (شعاع، خواتین)

سے سیکھا ہے۔ اگر ہم مضبوط ہیں تو آپ کی وجہ سے کیونکہ  
 ہمیں لڑنا حالات سے آتا ہے۔ سب سے پہلے ”شہر زاد“  
 پڑھی یہ درد اور تو ہر د پھر چرچ ہو گئی ہے چھپوری حرکیں  
 کر رہی ہے۔ ”سنہری دھوپ“ اب پور کر رہا ہے اہم اور  
 دعا کے وہی روایتی جھکڑے شروع۔

فرزانہ کھرل۔ مجال ہے جو ان کے کسی بھی ناول  
 میں موجود رشتہ دار یاں میری سمجھ میں آئی ہوں۔ فرزانہ  
 کھرل کے ہیرو، ہیروئن ایک دوسرے سے اتنے سرد  
 لہجے میں بات کیوں کرتے ہیں۔ اوپر سے فلسفی زبان میں  
 بول رہی گے جو سرے گز جائے بعد میں دماغ میں بیٹھے۔  
 ویسے لکھتی بہت اچھا ہے۔

سدرۃ المنتہی بڑے عرصے بعد جھلک دکھائی بہت  
 اچھا تھا ناول یہ سدرۃ المنتہی کینز نبوی کی کزن ہیں؟  
 افسانے سارے ہی اچھے تھے خاص کر مجھے گل فروش بہت  
 پسند آیا۔ خالدہ جیلانی سے فرمائش ہے بلکہ ریکویسٹ ہے  
 کہ جو دنیا فضل آ طیت بنائی تھی سفیدی میں لیوں زردی  
 میں شہد اگرایے انڈے بنانا آتے ہیں تو پلیز ہمیں ترکیب  
 بتائیں اور ایک گزارش آپ سے ہے پلیز ہمیں سے بہت  
 سحر عمیرہ احمد، کینز نبوی کو ڈھونڈ لائیں۔ اور بقیہ انا  
 چکوال، نسبت زہرا آپ دونوں بھی کہاں گم ہو۔

ج: واہ بھئی اقراء! آپ کا زکام بھگانے کا نسخہ تو بڑا  
 مزے دار ہے۔ یہ نسخہ تو ہم بھی ضرور آزمائیں گے۔  
 انڈے کی زردی میں شہد، سفیدی میں لیوں والی ترکیب تو  
 سمیرا حمید ہی بتا سکتی ہیں۔ فرزانہ کھرل کی رشتہ دار یوں  
 سے ہماری بہت سی قارئین ناخوش ہیں۔ ہم نے ان سے  
 کہا ہے کہ وہ ہیرو، ہیروئن پر زیادہ توجہ دیں اور دور پرے  
 کے رشتے داروں کو دور ہی رکھیں۔ سدرۃ المنتہی کینز نبوی کی  
 کزن بھی ہیں اور نند کا رشتہ بھی ہے۔ سدرہ کے بھائی سے  
 کینز نبوی کی شادی ہوئی ہے۔

عائشہ جہانگیر ڈھوک صابری ٹکرسید اس سے شریک محفل ہیں  
 اس ماہ ماؤں اچھی تھی میں نے ہاتھ کلاں سے  
 شعاع پڑھنا شروع کیا اب میں تھرا ڈیڑ میں ہوں۔ ہم  
 نے شعاع کیسے پڑھا، یہ الگ کہانی ہے بہت ڈانٹ  
 پڑی۔ حتیٰ کہ مار بھی پڑی مگر ہم نے شعاع نہ چھوڑا۔  
 عفت سحر طاہر کا ناول ”خواب شیشے کا“ ٹاپ پر جا  
 رہا ہے۔ ”شہر زاد“ بھی اچھا جارہا ہے۔ پلیز صائمہ آئی

ہم زاد کو سامنے لے آئیں۔ باقی ناول افسانے اچھے تھے۔ چلیز نیلہ عزیز سے کوئی ناول لکھوا دیے۔

ج: پیاری عاتشہ! آپ کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نیلہ عزیز تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

میں رب نواز نے دو چھوٹی جھلکے سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

عفت سحر طاہر کا خواب شیشے کا میں مودہ سے زیادہ نمیر آغدی مجھے پسند آیا ہے۔ ”سنہری دھوپ“ میں سلوٹی سیف اللہ بیٹ نے کمال کر دیا۔ باقی سب کہانیاں بھی مزے کی قسم کیا میں شعاع میں لکھ سکتی ہوں۔

ج: لیلیٰ! اشعار کی محفل میں خوش آمدید۔ شعاع آپ کا پرچہ ہے۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں، صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں۔

فرحانہ مہناز نے گوجرہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں ”خواب شیشے کا“ ہائے عفت جی اگر یہی کہانی ڈرامائی شکل میں ہوتی تو نمیر سامنے تھا لیکن۔ نانا جوڑا تو اس دفعہ بیٹ تھا پڑھ کر اپنا بچپن اور مٹکی کا پریڈ یاد آ گیا۔ کیونکہ ہم بھی جوانی کی مٹکی میں تھے اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں رخصتی تھی۔

آپ شہزاد میں در خواہ اپنے محبت کے لیے خود سے پہل کر رہی ہے تو پچھوری کا لقب مل گیا۔ اور اگر کوئی لوکا پہل کرے تو وہی لڑکی معصوم اور پاکیزہ ہوتی ہے اور پلیز ہماری قاری بہنیں مذہب کو کچھ میں نہ لایا کریں کیونکہ مذہب میں تو ہم زادی گفتگو ہی جائز نہیں ہے۔

سنہری دھوپ میں ایک اچھی دوست کو سوتن میں بدل کر کہانی کچھ عجیب سی کر دی ہے۔ مزہ نہیں آتا پڑھ کر، ام ایمان قاضی نے دو ٹکٹے کھڑے کر دیے والے قلم کرواتے اور اچھا ہونیکلی صاحبہ کو معافی کا موقع بھی نہ دیا۔ ”خس کم جہاں پاک“ فوزیہ فرخ نے بہت اچھی بہو دکھائی جو جگہ کے برابر خواب کا لکھتی ہے۔

افسانوں میں سنہری خواہش نمبر لے گیا۔ سہیہ غیر جی اپنا نہیں کیوں سنہری منزل کی تقسیم پر مجھے بہت رونا آیا۔ آنکھیں دھکے لگیں تو نیچے آ کر سرمہ لگا یا تو آنکھوں کی جلن کم ہوئی۔

ج: فرحانہ! اللہ تعالیٰ نے عورت میں شرم، حیا، ضبط اور صبر و برداشت کا جذبہ زیادہ رکھا ہے۔ اسے اپنی عزت نفس بہت عزیز ہوتی ہے۔ وہ محبت میں مٹ جاتی ہے لیکن اظہار میں پہل نہیں کرتی۔ در خواہ نے حیا کے ساتھ ساتھ اپنی عزت نفس کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اسی لیے وہ قارئین کو بری لگ رہی ہے۔

سہیہ عمیر کا افسانہ بہت حساس موضوع پر تھا۔ انہوں نے انتہائی سچ حقیقت بہت اچھے طریقے سے بیان کی۔ اسی لیے حساس دلوں نے اسے اتنی شدت سے محسوس کیا۔

سلیمہ مینگل نے اوستا محمد بلوچستان سے لکھا ہے ماڈل کی خوش شکل سی تصویر نے حیران کر دیا۔ سلفے سے کیا ہوا میک اپ بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے، پہلی شعاع کو پڑھا۔ ویل ڈن۔ شہزاد کی اس بار کی قسط مزے کی رہی ”خواب شیشے کا“ عفت سحر طاہر جس طریقے سے لے کر چارہ ہیں۔ بہت حرا آ رہا ہے۔ ”سنہری دھوپ“ دعا کی آزمائشوں کو فتح کر دیں ”محبت جنوری جیسی“ فرزانہ کھل کی کمال کی تحریکی۔ فوزیہ فرخ کو داد دی۔ ام ایمان قاضی کسی گریٹ ہوئی۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ دستک۔ میں شاہین رشید سے درخواست ہے کہ وہ کرکٹر کے انٹرویو لیں۔

ج: سلیمہ مینگل! آپ کا خط دیکھ کر بے حد خوش ہوئی کیونکہ آپ کا حلق ایسے صوفے سے ہے جہاں سے ہمیں بہت کم خط ملتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

نجمہ نذری ڈی جی خان سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے شعاع میں لکھی بار خط لکھا مگر شامل نہیں ہوا اس بار سنہری دھوپ نے خط لکھنے پر مجبور کیا بہت اچھا جا رہا ہے صائمہ اکرم کا ”شہزاد“ زبردست اسٹوری ہوئی جاری ہے۔

ج: پیاری نجمہ! خط لکھنے کا شکریہ۔ صدف رفیق نے مجھ سے لکھا ہے سرور قی ماڈل نے توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کی کوشش کی مگر میں نے اسے نظر انداز کر کے ”خط آپ کے“ میں چھلانگ لگائی۔ سرور قی سے لے کر ”خواب صورت لینے“ تک تمام رسالہ ہی لا جواب اور زبردست تھا۔ میرا امید اور اکیل رضا کی شہادت سے محسوس ہوئی۔

دوستوں کے لیے نام سر پر آؤ تھا۔ وہ ناراض ہیں کہ ہمارا تذکرہ کیوں نہیں۔ سن لو! نا جو (نازیہ شاہین) ہوا (مصاصدر) ڈھیر سارا اس پواد میرے اسکول کے تمام اُستاد کو سلام۔

ج: بہت شکریہ صدف! شفیقہ تبسم ج سے شریک محفل ہیں

اسلام علیکم! اس ماہ کا شعاع زبردست تھا۔ شامل، دیا اور سحر انور (سدواں) نے پوچھا تھا کہ کیا شاعری کرنا اسلام میں پسندیدہ عمل ہے؟ یا تا پسندیدہ؟ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں ان بہنوں کو مطلع کرنا چاہتی ہوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں اچھی بات بھی ہوتی ہے اور بری بھی اس میں سے اچھی بات لے لو اور بری چھوڑ دو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے اشعار کو پسند فرماتے جن میں توحید اور رشتہ دہایت کی باتیں ہوتی تھیں۔

قرآن میں سورۃ الشعرا کی روشنی میں ایسی شاعری کی مذمت ہے جو مبالغہ آرائی، جھوٹے اور بے ہودہ خیالات کی عکاسی ہو۔

آنحضرت نے تفکار کی جھوٹے شاعری کا جواب دینے کی اجازت دی ہے لیکن مومن کو مومن کی جھوٹے کی اجازت نہیں۔

”شاعری اپنی ذات میں تو اچھی، بری نہیں البتہ اس کا نفس مضمون اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔“ میری بہن اسماء تبسم کا شکریہ جس کی رہنمائی نے قلم اٹھانے کی ہمت دلائی۔

خط کافی طویل ہو گیا ہے لیکن مسئلہ ایسا ہے کہ میں لکھنے پر خود کو مجبور پاتی ہوں۔ آپ بہتر جانتی ہیں کیسے شائع کرنا ہے۔

ج: بہت شکریہ شفیقہ! آپ نے بہت عمدگی سے وضاحت کی۔

پسرور سے یاسمین کنول نے لکھا ہے ”پہلی شعاع“ کا ادارہ بہت زبردست رہا۔ حالات و واقعات کے تناظر میں بہت اچھا لکھا۔ واقعی تربیت کی ضرورت لڑکیوں سے زیادہ اہل لڑکوں کو ہے۔

”محبت جنوری جیسی“ زبردست ناول ہے واہ واہ شگفتہ یاسمین کا بندھن ڈاکٹر شاہد کے ساتھ بڑا پیارا لگا۔ ”جب تجھ سے نانا جوڑا“ بھی پسند آیا خوش قسمت ہے

ابھی انیم فیل اور پی ایچ ڈی کے غائب! بلور! اللہ تعالیٰ اس کے خوابوں کی تعبیر دکھائے۔ (آمین!)

ج: پیاری یاسمین! بہت شکریہ لیکن صرف شعاع کے سلسلوں پر ہی تھمرے.....؟

رقیہ سیف نے واہ واہ کی جگہ ملتان سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

سب کہانیاں لا جواب ہوتی ہیں۔ میری فیورٹ قسط واہ کہانی ”شہزاد“ ہے۔ اور عفت سحر آپ پلیز اپنے ناول کا جلدی ایڈ کریں۔ خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ فرزانہ کھل صاحبہ سے گزارش ہے کہ ذرا آسان فہم انداز میں ناول لکھا کریں۔ اتنا اچھا لکھا سا ناول مجھے تو ذرا بھی مزہ نہیں آتا ان کے ناول پڑھ کر یہ سلوٹی سیف بیٹ کا ناول بھی میرا پسندیدہ ہے ماشاء اللہ..... اللہ کرے زور قلم اور زیادہ اور آخر میں آپ سے ایک سوال کہ کہیں آپ کو یاد ہوں؟ دل تو چاہتا ہے ہر ماہ شامل ہوں لیکن چھوٹے چھوٹے دو بچوں کے ساتھ ہزار کام۔ ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔

ج: پیاری رقیہ! اللہ تعالیٰ آپ کے ناموں کی مغفرت کرے۔ آئیں آپ ہمیں یاد ہیں۔ ہماری قارئین ہمیں اتنی محبت سے خط لکھتی ہیں۔ ہم انہیں کیسے بھول سکتے ہیں۔ فرزانہ کھل تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

سونیا یاسمین نے نا میوالی سے لکھا ہے

میں بہت شرارتی اور نٹ کھٹ سی بے ضرر لڑکی ہوں ہالہا۔ سب بہنوں کی باریاں لگی ہوتی ہیں اور ترتیب بنائی ہوتی ہے کہ کس کو کس نمبر پہ ملے گا جب میری باری آئی تو میں ناٹل پر بنی ماڈل عروج کو سراہ کر آگے چلی گئی اور پھر ”سنہری دھوپ“ پڑھا مگر یہ تو بہت عام سا کلا کچھ خاص نہیں لگا۔ پھر میں نے صائمہ اکرم کی ”شہزاد“ سے ملاقات کی جس نے بہت متاثر کیا مگر ”در خواہ“ اور ارسل کارویہ اچھا نہیں لگا۔ ”شہزاد“ اور ”ہم زاد“ کی لکھا چھپی اور کب تک چلے گی۔ سامنے بھی آ جا میں اب۔ عفت سحر کا ”خواب شیشے کا“ بہت زبردست لگا۔ ”عمروں کے“ سلسلوں میں ”فوزیہ فرخ کا ناول بہت اچھا لگا۔ تمام افسانے بس ٹھیک تھے۔ ”محبت جنوری جیسی“ فرزانہ کھل کا مکمل ناول۔ مصباح کو بہت اچھا لگا باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ”تاریخ کے جھروکے“ تو میرا مومن فیورٹ

ہے بہت بہت اچھا لگا۔ ”موسم کے پکوان“ میں ہائے کھوپرے کی برنی۔ کچا پیر بتائی ہے۔ واہ میری پیاری پیاری سیسیلیوں کی تو قسمت چمک انھی کر اب وہ بہت جلد برنی سے انصاف کرنے والی ہیں (ہا ہا ہا) پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت اچھی لگیں۔ ”جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے“ پڑھ کے بہت حزا آیا۔ ”خط آپ کے“ میں سرت الطاف، مہر حسین اور نور بیگم بٹ گروپ کا خط اچھا لگا۔

وجہ: پیاری سونیا! اپنی دوستوں کو برنی کھلائیں اور جب وہ خوش ہو کر آپ کو دعائیں دیں تو اس میں خالدہ کا حصہ بھی رکھیں کیونکہ برنی میں تو حصہ ملنا مشکل ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے لشکر۔

افراج آصف نے ڈنگر محلہ مغل پورہ سے شرکت کی ہے۔ کھتی ہیں

انتہائی خوب صورت، وسیع و عریض بلند و بالا مسجد اہل حدیث پوری شان سے ایستادہ ہے۔ جسے دیکھتے ہی دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ ہماری مسجد دیکھنے ضرور آئیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس ہیں۔ آپ کچھ بات ہو جائے شعاع کی ٹائل پر ماڈل کی جگہ قدرتی مناظر ہونے چاہئیں۔ اچھی تجویز ہے۔ آپ ہر ماہ کسی ایک ڈاکٹر کا مشورہ و پوچھ کریں، بیماریوں کے متعلق سوال کریں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت اچھا سلسلہ ہے۔ آپ اس میں نماز کے طریقے کے متعلق بھی احادیث دیں۔ صانع اکرم چوہدری ہماری فیڈرٹ رائٹر ہیں۔ سب سے پہلے شہزاد پڑھتے ہیں۔ کیمراستان محل کہاں غائب ہیں؟ مرثیہ عزیز سے کچھ لکھو! میں اور نبیلہ عزیز ہم آپ کے منتظر ہیں۔ پلیز۔

انٹرویو کے لیے آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ شعان کی پسندیدگی کے لیے شکر۔  
حافظہ امراء جاوید اور بشری جاوید بی بی پھر از صلیع  
خوشاب سے شریک محفل ہیں

اکسایا ہے وہ ہے ”شہرِ زاد“ صائمہ جی اول کرتا ہے ہم آپ کے ہاتھ چوم لیں۔

اب آپ مجھے یہ بتادیں کہ کیا میں رائٹر بن سکتی ہوں۔ مائی سویٹ سسٹر بھئی بڑی اچھی شاعری کرتی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ آپ ہم دونوں مصوموں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔



اما ہمارے خواتین واجت اور ادارہ خاتین واجت کے تحت شائع ہونے والے جرنل ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کون میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل جن ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نئی جرنل یا جرنل کے ذریعہ یا کسی اور سلسلہ و قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشرس تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ یا قلمی ادارہ جو حق رکھتا ہے۔



## واصفہ سہیل کیتھکین



بھروسا

ادا کارہ ریٹیم نے کہا ہے کہ ”انہوں نے بچپن سے لے کر اب تک جس پر بھی بھروسا کیا ہے اس نے انہیں دھوکا دیا ہے۔“ (اور آپ اب تک دھوکے کھاتی رہیں.....؟)

انہوں نے کہا ہے کہ بچپن میں والد کے انتقال کے بعد ان کی بہن نے ہی انہیں ماں بن کر پالا۔ (ہیں..... والد کے انتقال کے بعد ماں بن کر پالا، یا والدہ کے انتقال کے بعد.....؟)

ریٹیم کا کہنا ہے کہ ان کی سب سے اچھی دوست بابر شریف ہیں (تو ریٹیم! آپ کی عمر.....؟) وہ انہیں مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلاتی ہیں (بابر شریف! مزے مزے کے کھانے..... بنا کر.....؟) مگر دوستی کے باوجود وہ بابا کا سینئر ہونے کے باعث بہت احترام بھی کرتی

ہیں۔ اور ان سے خوب ہنسی مذاق بھی کرتی ہیں (آخر انا ہی مذاق.....؟)

ریٹیم نے مزید کہا کہ بچپن سے ہی انہیں بابر شریف پسند تھیں۔ (بتادیا ناں کہ کم عمر ہیں) اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ایک دن بابر شریف ان کی بہترین دوست بن جائیں گی۔

ترجیح

مہرین سید ماڈلنگ کے بعد فلموں کی طرف آگئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ”شادی کے بعد وہ فلموں سے دور ہو گئی تھیں۔ مگر اب دوبارہ انہوں نے فلمیں کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ایک فلم کے بعد انہیں مزید فلموں کی آفرز بھی آتی ہیں (ویسے کس کس نے آفر کی ہے۔ بھی فلموں کی اور کس کی.....) مگر ابھی انہوں نے فیصلہ نہیں کیا۔ (کیا آپ کو لینے کا.....؟)



مہرین سید کا مزید کہنا ہے کہ۔ پاکستانی فلموں میں ماڈلز کی بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ سے پرانی اداکاراؤں اور اداکاروں کی اجارہ داری کا دور ختم ہو گیا ہے۔ (ویسے ہی جیسے نئی اور کم عمر ماڈلز کے آنے سے آپ جیسی ماڈلز کو فلموں کی طرف آنا پڑ گیا ہے)

مہرین سید نے کہا کہ میں اپنی مرضی کا کام کرنے والی اداکارہ ہوں (فلموں میں مرضی.....؟) اور فیشن انڈسٹری ہی میری ترجیح ہے۔ (کام مانگنے کا یہ طریقہ.....؟)

قربانی

صنم سعید کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے وہ ماڈلنگ ہو یا اداکاری، فلم ہو یا ڈرامہ ہر صنف میں یکساں مقبول ہیں۔ صنم سید کہتی ہیں کہ جدید دور میں صف اول کے فنکار فلم انڈسٹری کو استحکام دینے کے لیے ڈراموں میں کام نہ کرتے ہوئے بڑی قربانی دے رہے ہیں (بینک بیلنس بڑھانے کی.....؟) فلم انڈسٹری کوئی وی فنکاروں نے ایک نئی سمت دی ہے۔ (جی جی اب فلم، فلم نہیں لی وی ڈراما ہی لگتی ہے۔) کئی فنکار اب فلموں کی مصروفیات کی وجہ سے لی وی سے بالکل دور ہو گئے ہیں۔ میں بھی ایسا ہی کر کے اپنا حصہ ادا کر رہی ہوں (یا معاوضہ کی صورت وصول کر رہی ہیں؟) میری کئی فلمیں ریلیز ہو چکی ہیں (قابل ذکر کوئی نہیں)

دانش مند

پاکستانی نژاد برطانوی گلوکار زین ملک نے انکشاف کیا ہے کہ ان کے آنے والے البم میں اردو گانے اور قوالی بھی شامل ہوگی۔ زین ملک جو کہ برطانوی میوزک بینڈ ”ون ڈائر ایکشن“ کے سابق لیڈ سکر بھی ہیں کا کہنا ہے کہ ”آنے والے البم کے لیے ایک گانا بولی وڈ کے مشہور موسیقار ارشد رحمن کے ساتھ بھی کر رہا ہوں۔ اردو زبان سے شروع ہی سے ناتا رہا ہے۔ بچپن سے اچانک اور عامر خان کی فلمیں دیکھ دیکھ کر بڑا ہوں (وے کا کے ایک آدھ نام کوئی

ہما یوں سعید، عدنان صدیقی یا بشری الصاری کاں لہا سی) جو کوئی بھی ملے اسے شاہ رخ خان کی فلم دیو داس دیکھنے کا مشورہ دینا نہیں بھولنا۔ زین ملک کا مزید کہنا ہے کہ ”اگر آپ کسی مسئلے کا پراسن اور دانش مندانہ حل چاہتے ہیں تو اسے کسی خاتون کے حوالے کر دیں (ہیں ہیں.....؟) میں دیانت داری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری کامیابی کے پیچھے بھی میری زندگی میں آنے والی خواتین کا ہاتھ ہے۔“ (اچھا جی! وہ جو آپ کو ملی ہے وہ کامیابی ہے.....؟)

کچھ ادھر ادھر سے

دنیا کے نفسیاتی ماہرین بہت سارے اختلاقات کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ اپنے آپ سے محبت کرنے والے اور اپنی ذات میں کم رہنے والے اپنی ازدواجی زندگی میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

(عجاز منگی۔ آواز حق)

☆ اقامہ پر عدلیہ کے کمزور فیصلے سے نواز شریف کو فائدہ ہوا ہے۔ ہم اس فیصلے پر کیسے تنقید کرتے عدلیہ پہلے ہی حملے کی زد میں تھی۔

(عمران خان)

☆ میں کچھ دوستوں کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا عاصمہ جہانگیر کا خلا پُر نہیں ہو سکتا۔ جہاں ظلم ختم نہ ہوگا۔ ہزاروں گمشدہ افراد واپس نہ آئیں گے اور غیرت کے نام پر قتل بند نہ ہوں گے وہاں عاصمہ جہانگیر کی مزاحمت بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ مزاحمت جاری رہے گی۔

(قلم کمان۔ حامد میر)

☆ جرم سزاؤں سے کم نہیں ہوتے، معاشرے میں عدل سے ختم ہوتے ہیں۔ عدالتوں کا احترام خوف سے قائم نہیں ہوتا۔ عدالتوں کے انصاف پر مبنی فیصلوں سے ہوتا ہے۔

(فیض عام۔ سہیل وڑائچ)

# کرن

مارچ 2018 سالگرہ نمبر

## کرن کا دسترخوان

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- ”کیا تجھے یاد ہیں گزرے زمانے اپنے“ قارئین سے سروے
- ”فکارہ “کنزہ ہاشمی“ سے شاہین رشید کی ملاقات
- ”شعروخی کی دنیا سے معروف شاعر “نیراؤنیر“ اس ماہ مہمان ہیں
- ”اداکار “زادہ افشار احمد“ کہتے ہیں ”میری بھی سنیے“
- ”اس ماہ مددگار کرن اور اقراء جٹ کے “مقابل ہے آئینہ“
- ”من موزک کی ہاٹ نہالو“ آسیہ مرزا کا مہوار ناول کی آخری قسط
- ”ہوا کیسے رخ بدل سکیں“ محبت مہدالہ کا ناول
- ”مچھر رشمن“ مصباح علی سید کا ناول کی آخری قسط
- ”جادوگر نیاں“ گہمت سیما کا ناول
- ”سوئے دی تاوہری“ امت العزیز شہزاد کا ناول
- ”شم ہے یا خوشی ہے تو“ تنزیلہ دیاض کا ناول
- ”چھوٹی سی خطا“ نادیہ احمد کا ناول
- ”چندوئی“ منشا حسن علی کا ناول
- ”راشدہ رقصت، نقیبہ سعید، نقیبہ فاطمہ اور مریم ہامیر کے افسانے اور مستقل قسط

عمیرات کی دنیا میں محبت اور عقیدت کی معراج ہے۔ ذرا تفصیل پڑھیے اور اپنے دلوں کو عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منور کریں۔ ترکوں نے جب مسجد نبوی کی تعمیر کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنی وسیع و عریض ریاست میں اعلان کیا کہ ”اہمیں عمارت سازی سے متعلق فنون کے ماہرین درکار ہیں۔“

اعلان کرنے کی دیر تھی کہ ہر علم کے مانے ہوئے لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں، سلطان کے حکم سے استنبول کے باہر ایک شہر بسایا گیا جس میں اطراف عالم سے آنے والے ان ماہرین کو الگ الگ محلوں میں بسایا گیا، اس کے بعد عقیدت اور محبت کا ایسا باب شروع ہوا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

خلیفہ وقت جو دنیا کا سب سے بڑا فرمان روا تھا، شہر میں آیا اور ہر شعبے کے ماہر کو تاکہ لکھ لکھائے کہ اسے کیا دے مثلاً کر دے۔“

اس اثنا میں ترک حکومت اس بچے کو حافظ قرآن اور شہسوار بنائے گی، دنیا کی تاریخ کا یہ عجیب و غریب منصوبہ کئی سال جاری رہا۔

پچیس سال بعد ایسے نوجوانوں کی جماعت تیار ہوئی جو نہ صرف اپنے شعبے میں یکتائے روزگار تھے، بلکہ ہر شخص حافظ قرآن اور باعمل مسلمان بھی تھا، یہ لگ بھگ پانچ سو لوگ تھے۔ اسی دوران ترکوں نے پتھروں کی نئی کانیں دریافت کیں، جنگلوں سے لکڑیاں کٹوائیں، تختے حاصل کیے گئے اور شیشے کا سامان، ہم پہنچایا گیا۔ یہ سارا سامان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر پہنچایا گیا تو ادب کا یہ عالم تھا کہ اسے رکھنے کے لیے مدینہ سے دور ایک بستی بسائی گئی، تاکہ شہر سے مدینے کا ماحول خراب نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے اگر کسی پتھر میں ترمیم کو ضرورت پڑتی تو اسے



## شوق شہادت

حضرت عمرؓ کو بوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے پیارے صحابی تھے۔ آپؐ ٹانگ سے معذور تھے، مگر ایمان کی ایسی حرارت آپؐ کے سینے میں تھی کہ احد کی جنگ میں آپؐ جذبہ شہادت سے سرشار جہاد میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپؐ ٹانگوں سے ہیں اور معذوروں کو اللہ نے رخصت دے رکھی ہے، مگر آپؐ کا شوق جہاد بڑھتا ہی گیا۔ کہتے گئے

”میں اپنے بیٹوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا کہ وہ تو جام شہادت نوش کر کے جنت میں چلے جائیں اور میں پیچھے رہ جاؤں۔“

بالآخر آپؐ شہادت کی تمنا سے بے قرار ہو کر ایک دن ہتھیار لگائے قبلہ کی طرف رخ کر کے دعا کرنے لگے۔

”خدا یا! مجھے گھروالوں کی طرف نہ لوٹا دیے گا۔“

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری دعا ہے کہ میں راہ خدا میں شہادت پاؤں اور میں اپنے اس لنگڑے پیر سے جنت میں پہلوں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو منع کیا کہ تم معذور ہو اور اللہ نے تمہیں رخصت دی ہے، لیکن ان کے شوق اور آرزو کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔

حضرت عمرؓ کو بوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے پیارے صحابی تھے۔ آپؐ ٹانگ سے معذور تھے، مگر ایمان کی ایسی حرارت آپؐ کے سینے میں تھی کہ احد کی جنگ میں آپؐ جذبہ شہادت سے سرشار جہاد میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپؐ ٹانگوں سے ہیں اور معذوروں کو اللہ نے رخصت دے رکھی ہے، مگر آپؐ کا شوق جہاد بڑھتا ہی گیا۔ کہتے گئے

”میں اپنے بیٹوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا کہ وہ تو جام شہادت نوش کر کے جنت میں چلے جائیں اور میں پیچھے رہ جاؤں۔“

بالآخر آپؐ شہادت کی تمنا سے بے قرار ہو کر ایک دن ہتھیار لگائے قبلہ کی طرف رخ کر کے دعا کرنے لگے۔

”خدا یا! مجھے گھروالوں کی طرف نہ لوٹا دیے گا۔“

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری دعا ہے کہ میں راہ خدا میں شہادت پاؤں اور میں اپنے اس لنگڑے پیر سے جنت میں پہلوں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو منع کیا کہ تم معذور ہو اور اللہ نے تمہیں رخصت دی ہے، لیکن ان کے شوق اور آرزو کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔

عقیدت و محبت کی لازوال کہانی  
لوگ تاج محل کو محبت کی علامت قرار دیتے ہیں، مگر یقین کریں کہ عثمانی دور میں مسجد نبوی کی تعمیر،

واپس اسی بستی بھیجا جاتا۔ ماہرین کو حکم تھا کہ ہر شخص کام کے دوران یاد دہا رہے اور درود شریف اور تلاوت قرآن میں مشغول رہے۔ حجرہ مبارک کی جالیوں کو کپڑے سے لپیٹ دیا گیا کہ غبار اندر وضع پاک میں نہ جائے۔ ستون لگائے گئے کہ ریاض الجنتہ اور وضع پاک پر مٹی نہ گرے۔

یہ کام پندرہ سال تک چلتا رہا اور تاریخ عالم گواہ ہے کہ ایسی محبت اور ایسی عقیدت سے تعمیر نہ بھی پہلے ہوئی اور نہ بھی بعد میں ہوگی۔

### عجیب و حیرت انگیز

گورنر امیر محمد خان کا انتقال 1967ء میں ہوا، اس وقت پاکستان دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوا تھا اور بنگلہ دیش مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ امیر محمد خان مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔

گورنر امیر محمد خان اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے یورپ کی یونیورسٹی سے ایگریکلچر کی ڈگری لی

تھی۔ صدر ایوب خان کے زمانے میں پاکستان میں جو زرعی انقلاب آیا تھا۔ اس کا سہرا اور اصل ملک محمد امیر خان ہی کے سر ہے جو اس وقت پاکستان کے غذائی اور زرعی کمیشن کے صدر تھے۔ بعد میں ان کو ان کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں گورنر بنادیا۔

امیر محمد خان باہر سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے۔ وہ گورنر ہاؤس میں نماز، روزہ کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ان کے گھر کی خواتین ہمیشہ پردہ کے اندر رہتیں۔

صدر پاکستان ایوب خان پاکستان کی بڑھتی آبادی سے خائف تھے۔ انہوں نے تیسرے بیچ سالہ منصوبے میں بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے خاندانی منصوبہ کے لیے تیس کروڑ کی رقم رکھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ خاصی بڑی رقم تھی۔

امیر محمد خان نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ ایوب خان کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ بات بڑھتی گئی۔ یہاں تک ایوب خان نے جھنجھلا کر کہا۔

”اگر آبادی اسی طرح بڑھتی رہی اور اس کی روک تھام نہ ہوئی تو ایک وقت وہ آئے گا جب اناج کی کمی کی وجہ سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کو بھون کر کھائے گا۔ خوشی صرف اس بات کی ہے کہ اس وقت تک میں زندہ نہیں رہوں گا۔“

حالات اس بیچ برآ گئے کہ ملک محمد امیر خان نے ستمبر 1966ء میں گورنری سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے آبائی علاقے کالا باغ چلے گئے جہاں ان کے کھیت اور باغات تھے۔

یہاں ان کے گھر پر جائیداد کا جھگڑا شروع ہوا۔ بالآخر ایک روز وہ خود اپنے بیٹے ملک محمد اسد کے خلاف راکفل لے کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے بیٹے پر گولی چلائی۔ مگر وہ کندھے کو زخمی کرنی ہوئی نکل گئی۔ اب بیٹے کی باری تھی۔

بیٹے نے چھ گولیاں اپنے باپ کے جسم میں اتار دیں اور وہ اسی وقت دم توڑ گئے۔

وہ شخص جس نے خاندانی منصوبہ بندی کو قتل قرار دے کر اس کی مخالفت کی اور گورنری کے عہدے تک کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود اپنے بیٹے کے خلاف بندوق لے کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی موت بھی اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں لکھی تھی، یہ انتہائی عجیب اور حیرت انگیز بات ہے۔

### غلط عقائد

کارٹیج کے لوگ مولوک دیوتا کی عبادت کرتے تھے۔ وہ ایک خاص دن اپنے دیوتا کے سامنے امیر، اعلیٰ خاندان کے لڑکوں کی قربانی پیش کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق مولوک دیوتا اعلیٰ اور امیر خاندان کے لڑکوں کی قربانی پسند کرتا تھا۔ اعلیٰ خاندان کے لوگوں نے اپنے لڑکوں کو بچانے کے لیے غریب خاندان کے لڑکوں کی قربانی دینا شروع کر دی۔ وہ غریبوں کے لڑکوں کو پھر کر لے آتے اور قربانی کے دن اسے دیوتا کے چرنوں میں قربان کر دیتے تھے۔ کئی سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔

رومیوں نے کارٹیج پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں جب کارٹیج کی فوج کو شکست ہوئی تو انہوں نے سوچا کہ یہ اس غلطی کا نتیجہ ہے جو مولوک دیوتا کی عبادت کے سلسلہ میں ان سے ہوئی ہے۔ انہوں نے اشرافیہ کے لڑکوں کی قربانی پیش نہیں کی، جس کی وجہ سے مولوک دیوتا ان سے ناراض ہو گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جنگ میں شکست کے بعد اس غلطی کی تلافی اس طرح کی کہ آگ جلا کر اعلیٰ خاندان کے بہت سے لڑکے اس آگ میں جھونک دیے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ توہم پرستی اور غلط عقائد انسان کی عقل کو کس طرح خطہ کر دیتے ہیں اور اسے کس انتہا تک لے جاتے ہیں۔



### ادارہ خواتین ڈائجسٹ لیٹل بھنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	موضوع	قیمت
فرول کے دھارے	نارنگی	400/-
نکے کاٹا	نارنگی	200/-
بہار	لڑکھانوں	400/-
بندوبست کا لہو	لڑکھانوں	200/-
جنگ ہاں ہے	لڑکھانوں	600/-
دل نہیں	شہرہ نگاری	350/-
پن کا آج	شہرہ نگاری	300/-
وہ جلیں دیالی	آپریٹو	400/-
آزاد بھارتی	آپریٹو	400/-
ایمان و امید و محبت	میراثہ	200/-
لا مائل	میراثہ	180/-
امر قتل	میراثہ	450/-
اک دھارے کا مکنا	ماہک	300/-
جو چلے وہاں سے کرے	ماہک	120/-
میرے خواب پروردہ	ماہک	300/-
موسم کا بے قرار	لڑکھانوں	300/-
دل سے اصرار ہے	آپریٹو	300/-
زکریا کی روشنی	رشتہ نگاری	500/-
میرے سارے کچھ	لڑکھانوں	180/-
پہلاں سے نکالے	نارنگی	180/-
میری جنت	نارنگی	250/-
بہار	خوشحال	150/-
اسے وقت گواہ دے	راحت نہیں	350/-
شام آرزو	انیمیشن	300/-
رنگ، خوشبو، ہوا، پانی	انیمیشن	400/-
آنکھیں کا شہر	نارنگی	400/-
بڑا آگاہی	نیم ہرگز نہیں	300/-
میرے خواب پروردہ	محبت	400/-

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

# بھارتی



قیمت - 400/- روپے

منسلک کتاب

ملکیت عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:  
32735021

## شعاع کے ساتھ

اداکہ

### رمیش گل

(1) - بچپن سے ہی شعاع اپنی کزنز کے ہاتھوں میں دیکھا ہے۔ ہم میں ادبی ذوق کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ بات یہ ہے کہ رسالے ہوں۔ اخبار..... کتابیں کچھ بھی..... سب کچھ چائے کا ہمیں جنوں ہے۔ اور پڑھتے ہوئے دنیا ماٹھیا سے بے خبر ہو جانا ہماری فطرت.....

ہماری کزن ہمیں چڑ کر اخباری کیز کہتی ہے۔ ہم کبھی اس خطاب پر خوش نہ ہو سکے۔ کیونکہ کیز کوئی بھی ہو، ہمیں برا لگتا ہے۔

خواتین سے نويس دسويں ہی میں متعارف کروا دیا تھا۔ میں نے ان سے بہت کچھ حاصل بھی کیا۔ امی پہلے مجھے منع کرتی تھیں۔ مگر جب میں نے انہیں سمجھایا کہ امی اس میں ہم لڑکیوں کے لیے بہت سے سبق ہوتے ہیں۔ تو وہ اب کچھ نہیں کہتیں..... آج پہلی بار قلم اٹھا کر شعاع کے ساتھ ایک اور رشتہ استوار کر رہے ہیں..... گھبرائے گھبرائے کیونکہ آج سے پہلے تک تو ہم نے ایک لائن یا جملہ لفظ تک لکھ کر نہیں بھیجا۔ سو سوچا پہلے تعارف کروا لیا جائے۔ کہ ہم بھی پڑے ہیں پاکستان میں.....

(2) - صبح سویرے امی کی آواز کانوں میں پڑتی ہے۔ پھر وہی روایتی صبح نماز، ناشتہ، کانج..... پھر کانج سے دو چہر تک واپسی ہوتی ہے۔ پھر کھانا کھانا، تھوڑا بہت کام یا آرام کر لینا، پھر اکیڈمی..... شام کے قریب واپسی ہوتی ہے۔ پھر بس کانج کا کام اور پڑھائی ہوتی ہے اور فارغ ہو جاؤں تو چلی جاتی ہوں..... سب سے الگ تھلک..... اپنے مخصوص کمرے میں..... مخصوص نشست پر..... اپنا مخصوص

ٹپک لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ کچھ پڑھنے کا موڈ نہ ہو تو لکھتی ہوں۔ لکھنے کا موڈ نہ ہو تو پڑھ لیتی ہوں۔ بیٹینگ کرنا..... پوسٹری کرنا میرے پسندیدہ مشاغل ہیں۔

کہانیاں لکھنا بھی اچھا لگتا ہے۔ بلکہ آج کل ایک ناول لکھ رہی ہوں۔ پہلے میرے معمولات میں شام کی چھل قدمی شامل تھی۔ اپنی بہن کے ساتھ..... اور ٹپکتے ہوئے میں اسے خود سے بنا بنا کر ناول سنایا کرتی تھی اور مجھے کیا تھا۔ مجھ سے ایسا ناول بھی بن جائے گا۔ جو مجھے مجبور کرے گا میں اسے لکھوں..... میں بہت گھبراتی ہوں کیونکہ یہ میری زندگی کا پہلا ناول ہے۔ اور سنانے اور لکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سنانے ہوئے ساتھ ساتھ بنانا پڑتا ہے۔ جس کی میں عادی تھی۔ اور لکھتے ہوئے ساتھ ساتھ دکھانا پڑتا ہے۔ جو میرے لیے نیا تجربہ ہے۔ اس کے بعد بارہ بجے تک ہماری یہی روٹین ہوتی ہے۔

بارہ بجے کسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ”اب آ جاؤ سونے“

کبھی کر بیٹھی رہتی ہوں۔

(3) - کسی کہانی میں اپنا مکمل کردار نظر نہیں آیا۔ ایک تو ناول میں بہت منتخب کر کے پڑھتی ہوں۔ اس لیے بہت کم ناول پڑھے۔ اور جو پڑھے ان میں کوئی کردار اپنا عکس نہیں لگا۔ تھوڑی بہت عادات شاید مل جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی سے.....

پسندیدہ مصنفات میں عمیرہ احمد کی گردیدہ ہوں۔ پیر کامل پڑھ کر..... کرداروں کے درمیان غیر متوجع جملے بازی..... برجستہ جوابات ان کی تحریر کا حسن ہے۔ دو تین ماہ پہلے ہی نمرہ احمد کا ناول ”جنت کے پتے“ پڑھا۔ ان کے ناول کے ساتھ ساتھ ان کی ذہانت، محنت اور معلومات کی داد دینی پڑے گی۔ سائرہ رضا اور پھر سمیرا حمید کا ناول یارم بھی میرے پسندیدہ ناولوں میں شامل ہے۔ اور ان دونوں کی

تحریریں پڑھنے کو مجبور کرتی ہیں۔ ایک بار پھر پڑھنے یارم کے لیے تو میرا دل چاہ رہا ہے۔ ایک ٹیچر سے خط لکھوں۔

(4) - خوبیاں اور خامیاں..... سوال دلچسپ بھی ہے اور شاید مشکل بھی..... حساس ہوں۔ بلکہ بے حد حساس ہوں اسے خوبی کہہ دیں، خامی سمجھیں۔ آپ کی مرضی..... میرے نزدیک یہ کمزوری ہے۔ مگر کمزوری کو اپنی طاقت بنانا جاسکتا ہے۔ سو میں بھی اپنی حساسیت صغے پر منتقل کر لیتی ہوں۔ میرا خیال ہے، میں ایک بہادر لڑکی ہوں۔ اس کے علاوہ بہت انا پرست ہوں۔ مجھے عزت سے زیادہ دنیا میں اور کوئی چیز پیاری نہیں۔

”لوگ دکھ پہنچائیں۔ تو معاف کر دیتی ہوں۔ دل بہت بڑا ہے میرا..... اپنے لیے یہ جملہ نئی لوگوں سے سنا اپنی چیز بخوشی دوسروں کو دے دیتی ہوں۔ کوئی مجھے میری خامی بتائے۔ تو میں اس خامی کو تودور کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بدگمان جلد ہو جاتی ہوں۔ اور جس سے ہوں۔ اس سے بغیر کچھ کہے اپنی راہیں الگ کر لیتی ہوں۔ لیکن یہ گزر سال مجھ میں ایک بڑی تبدیلی لے کر آیا۔ اور وہ یہ کہ میرے دل میں جس کے لیے بدگمانی ہو۔ میل ہو۔ تو میں کسی دوسرے سے ڈسکس کرنے کے بجائے براہ راست اسی بندے سے بات کر لیتی ہوں۔

باقی اور کیا لکھوں..... عام سی لڑکی ہوں۔ اچھی لڑکی سمجھی جاتی ہوں۔ کوشش ہوتی ہے جان پہچان والے کم ہوں۔ ایک ہی بندہ ہو سلام دعا والا مگر بے رخصت (مگر ہوتے ہوئے سلام دعا والے زیادہ ہی بن جاتے ہیں) خود میں مگن رہتی ہوں۔ نہ دوسروں کی کسی چیز سے متاثر ہوتی ہوں۔ نہ انہیں متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اچھے لوگوں سے واسطہ رکھ لیتی ہوں بن جائے تو..... برے، خود غرض، بدتمیز، مغرور لوگوں سے نہ دشمنی رکھتی ہوں نہ دوستی..... بھئی خوش رہیں۔ جیسے رہیں۔ اپنی زندگی ہے میرا کیا..... میں سنجیدہ دکھائی دیتی ہوں۔ مگر میں سنجیدہ نہیں ہوں۔

(5) - کوئی ایسا بھی ہے جو کہ اسے بارش اچھی نہیں لگتی..... ”میں نہیں مند“ جی ہاں بہت اچھی لگتی ہے بارش..... گرمیاں ہوں تو گھوم پھر کر..... اور سردیاں ہوں تو اپنی مخصوص نشست پر کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ بشرط موڈ اچھا ہو۔ اپنا ہی ایک شعر لکھتی ہوں۔

چاند ستارے ٹھنڈی ہوائیں گلشن میں آئیں تو کیا آگ، گلے ایسے موسم کو دل کا موسم اچھا ہوتا سو بارش کبھی کبھی اداس بھی کر دیتی ہے۔ جب یہ سوچ ذہن میں آئے۔ کہ ایک دن یہ بارش یوں ہی زمین پر ہو رہی ہوگی۔ اور میں ہجر کے اندر ہوں گی۔ اور یہ سن کر میری کزن مجھے بوڑھی روح کہتی ہے۔ میں بالکل نہیں چڑتی ہوں دیتی ہوں۔ یہ سوچ..... یعنی ہمارے اندر بڑھا بزرگ..... مجھے یہ احساس ضرور دلاتا ہے۔ یہ زندگی جو مجھے ملی..... اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اور اسے بے کار مسکے مسائل میں گنوا دینا عقل مند کی نہیں۔

(6) - شاعری میں نے زیادہ نہیں پڑھی ناول کی طرح..... اور جو پڑھی ان میں احمد فراز اور جاذب غار پسندیدہ شاعر ہیں۔ میں آپ کو جاذب غار کے چند شعر لکھ رہی ہوں۔ دنیا ہمیں کیسے کیسے امتحانوں میں ڈال دیتی ہے۔ ذرا پڑھیے۔

باہر آؤں تو خفا مجھ سے کنارے والے سانس کھتی ہے ڈبوتا ہوں جو سر پانی میں اور یہ خوب صورت شعر

میں گرا تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن سوچتا یہ ہوں کہ آئے تھے اٹھانے کتنے پسندیدہ اشعار تو بہت ہیں۔ فی الحال یہ ہی کافی ہیں۔

میں لڑکی ہوں۔ میں لڑکی بہت معصوم دکھتی ہوں۔ مگر میرا خیال ہے میں سادہ نہیں ہوں۔ ان اور عقل مند ہوں۔ کیا آپ کو میری تحریر سے نہیں لگتا ہا۔ ہاں اپنی بدتمیز بہن کے ہاتھوں آسانی سے بدبو بن جاتی ہوں۔ جو بہن کم اور دوست زیادہ ہے میری.....

(5) - کوئی ایسا بھی ہے جو کہ اسے بارش اچھی نہیں لگتی..... ”میں نہیں مند“ جی ہاں بہت اچھی لگتی ہے بارش..... گرمیاں ہوں تو گھوم پھر کر..... اور سردیاں ہوں تو اپنی مخصوص نشست پر کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ بشرط موڈ اچھا ہو۔ اپنا ہی ایک شعر لکھتی ہوں۔

چاند ستارے ٹھنڈی ہوائیں گلشن میں آئیں تو کیا آگ، گلے ایسے موسم کو دل کا موسم اچھا ہوتا سو بارش کبھی کبھی اداس بھی کر دیتی ہے۔ جب یہ سوچ ذہن میں آئے۔ کہ ایک دن یہ بارش یوں ہی زمین پر ہو رہی ہوگی۔ اور میں ہجر کے اندر ہوں گی۔ اور یہ سن کر میری کزن مجھے بوڑھی روح کہتی ہے۔ میں بالکل نہیں چڑتی ہوں دیتی ہوں۔ یہ سوچ..... یعنی ہمارے اندر بڑھا بزرگ..... مجھے یہ احساس ضرور دلاتا ہے۔ یہ زندگی جو مجھے ملی..... اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اور اسے بے کار مسکے مسائل میں گنوا دینا عقل مند کی نہیں۔

(6) - شاعری میں نے زیادہ نہیں پڑھی ناول کی طرح..... اور جو پڑھی ان میں احمد فراز اور جاذب غار پسندیدہ شاعر ہیں۔ میں آپ کو جاذب غار کے چند شعر لکھ رہی ہوں۔ دنیا ہمیں کیسے کیسے امتحانوں میں ڈال دیتی ہے۔ ذرا پڑھیے۔

باہر آؤں تو خفا مجھ سے کنارے والے سانس کھتی ہے ڈبوتا ہوں جو سر پانی میں اور یہ خوب صورت شعر

میں گرا تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن سوچتا یہ ہوں کہ آئے تھے اٹھانے کتنے پسندیدہ اشعار تو بہت ہیں۔ فی الحال یہ ہی کافی ہیں۔

☆

## موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

جے پوری کھانا گوشت

ضروری اشیاء:-

گوشت

پیاز کا پیسٹ

ادرنک، لہسن پیسٹ

دہی

املی کا پیسٹ

لال مرچ

ہلدی

دھنیا

گرم مسالا

کچا پیٹا

ہری مرچیں

ہرا دھنیا

نمک

تیل

ترکیب:- گوشت میں کچا پیٹا، ادرنک اور لہسن

پیسٹ لگا کر دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔

دہی میں تیل گرم کر کے اس میں پیسی پیاز

دہی، لال مرچ، ہلدی، پیسا دھنیا، گرم مسالا پاؤڈر اور

نمک ڈال کر بھون لیں۔ اس میں گوشت شامل

کر کے درمیانی آگ پر دس منٹ ڈھک کر پکائیں

اس کے بعد املی کا گودا اور ہری مرچیں شامل کر کے

مزید دس منٹ بھلی آگ پر دم پر رکھیں، گوشت گل

جائے تو ہرا دھنیا ڈال کر اتار لیں۔

مکھنی ملائی ہرا مسالا چکن

ضروری اشیاء:-

چکن

آدھا کلو

ہرا دھنیا (کٹا ہوا)

ہری مرچیں (کٹی ہوئی)

لہسن، ادرنک پیسٹ

دہی

زیرہ (بھنا اور کٹا ہوا)

لیموں کا رس

پیاز (پسی ہوئی)

نمک

تیل

ترکیب:- دہی میں تیل گرم کر کے پیاز اور

لہسن، ادرنک پیسٹ ڈال کر تیل لیں۔ اس میں مرچی

ڈال کر بھونیں، مسالا بھن جائے تو نمک، ہرا دھنیا،

ہری مرچیں اور دہی ڈال کر حسب ضرورت پانی ڈال

دیں، ڈھک کر درمیانی آگ پر پکائیں۔ گوشت گل

جائے تو بھون کر لیموں کا رس، کٹا ہوا زیرہ، مکھن اور

ملائی شامل کر کے کس کر دیں۔ سردنگ پلیٹ میں

نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

قیمہ سیٹیکھٹی

ضروری اشیاء:-

قیمہ

پیاز

لہسن

ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے)

تیل

نماثر پیسٹ

لال مرچ

نمک

ہلدی

ایک چوتھائی پائے کا چچہ

ہرا دھنیا (کٹا ہوا)

ہری مرچ (کٹی ہوئی)

ایک پیسٹ

ترکیب:- سیٹیکھٹی کو بالائے تیل میں پھر کسی برتن

میں تیل میں پیاز ڈال کر ہلکا سا فرنی کریں، قیمہ،

لہسن، ٹماٹر ڈال کر بھونیں۔

قیمہ کا پانی خشک ہو جائے تو نمک، لال مرچ،

ہلدی ڈال کر بھونیں، پھر ٹماٹر پیسٹ، ہرا دھنیا، ہری

مرچ ڈال کر بھونیں۔ تیل الگ ہو جائے تو سیٹیکھٹی

ڈال کر کس کر لیں۔ ایک منٹ پکائیں اور ڈش میں

نکال لیں اور گرم گرم پیش کریں۔

آلو، خشکاش کے ساتھ

اشیاء:-

آلو

خشکاش

تیل

کلوچی

زیرہ

لہسن کے جوے

سیاہ مرچ پاؤڈر

ہلدی پاؤڈر

ہری مرچ

نمک

ترکیب:- آلو چھیل کر چوکور ٹکڑوں میں کاٹ

لیں، ایک فرانک پین میں تیل گرم کریں۔ جب تیز

گرم ہو جائے تو آگ سے اتار لیں اور اس میں کلوچی

اور زیرہ ڈال کر کڑکڑائیں۔ اس کے بعد اس میں کٹا

لہسن ڈال کر درمیانی آگ پر بھون لیں۔ اب اس

میں سیاہ مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، آلو اور ہری مرچ

ڈال کر اچھی طرح کس کریں اور دو سے تین منٹ

کے لیے تیز آگ پر پکائیں۔ مستعمل چھچھلائی رپیں۔

اس کے بعد آگ بھلی کر کے ڈھکن ڈھک کر آلوؤں

کے عمل مکمل جانے سے پہلے

وقفے سے چھچھلائی رپیں۔

لیں اور اس کو بھی آلوؤں میں شامل

پانچ سے چھ منٹ کے لیے پکائیں۔ آخر میں

شامل کر کے اچھی طرح کس کریں اور چوتھے

اتار کر گرم گرم پیش کریں۔

چکن چیز پر اٹھاروں

مرچی کا گوشت (بون لیں)

آدھا کلو

بند گوشتی (باریک کٹی ہوئی)

آدھا کلو

لہسن پیسٹ

ایک چائے کا چچہ

ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)

دو کھانے کے پیچھے

ایک چائے کا چچہ

نمک

تیل

سیاہ مرچ پاؤڈر

نمک

حسب ضرورت

پرائے کے اجزاء:

میدہ

آٹا

نیم گرم پانی

نمک

کھی

ترکیب:- فرانک پین میں تیل گرم کر کے اس

میں لہسن پیسٹ اور گوشت ڈال کر پانی خشک ہونے

تک فرنی کر لیں۔ بند گوشتی، سیاہ مرچ پاؤڈر، ہری

مرچیں اور نمک شامل کر دیں 2-3 منٹ پکانے کے

بعد یوکریم اور چڈر چیز ڈال کر کس کر دیں۔ میڈہ،

آٹا، کھی اور نمک کس کر کے نیم گرم پانی سے گوندھ کر

10 منٹ کے لیے رکھ دیں۔ گندھے ہوئے آٹے

کے پیڑے بنا کر گرم توے پر پرائے بنا کر گولڈن

ہونے تک فرنی کر لیں۔ پرائے میں گوشت کا آمیزہ

رکھ کر رولی بنا لیں۔ سردنگ پلیٹ میں نکال کر دہی

اور ہری چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔



# Goldenpearl

BEAUTY FOR EVER

PAKISTAN'S  
BEST SELLING  
BEAUTY CREAM

Khaabsoorti  
Aik  
Sacha Khawab

Golden  
Pearl  
Beauty Cream



دھولیں۔ جلد سے دانوں، کیل مہاسوں کا خاتمہ چند دنوں میں ہی ہو جائے گا۔

☆ اگر آپ کے بالوں میں خشکی بڑھ گئی ہے تو آدھا پاؤ دہی میں ایک انڈا ملا کر بالوں پر لگائیں۔

اس کے بعد تو لے سے اپنے بالوں کو پیٹ لیں۔ ایک گھنٹے بعد سر دھولیں۔ اس طرح سر میں پھلی کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔

☆ دہی میں سے بالائی الگ کر کے اس میں ایک لیٹوں کا رس ملا کر چند گھنٹوں کے لیے ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ یہ آمیزہ ہاتھوں اور ناخنوں پر لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھ اور ناخن دھو کر خشک کر لیں۔ دو ہفتے تک یہ عمل دہراتے رہنے سے ہاتھوں کی جلد نرم و ملائم اور خوب صورت ہو جاتی ہے۔

☆ سادہ دہی کو بہترین مونچر انر قرار دیا جاتا ہے جس میں گلیکولک ایسڈ کی مقدار خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ بہترین فوائد کے لیے ایک انڈے کی سفیدی میں چائے کا ایک چمچ دہی اور چائے کا ایک چمچ شہد ملا کر چہرے اور گردن پر لگائیں۔ پندرہ منٹ پر نیم گرم پانی سے اچھی طرح دھولیں۔ چند دنوں میں ہی جلد دکنے لگے گی۔

☆ اگر آپ چہرے کو چھریوں سے پاک رکھنا چاہتی ہیں تو چائے کا ایک چمچ دہی میں ایک چوتھائی چمچ کینو کا رس یا آدھے لیٹوں کا رس شامل کر کے چہرے پر پانچ منٹ کے لیے لگائیں۔ آخر میں نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔ لیٹوں اور کینو کے علاوہ کسی دوسرے ریلے پھل کا رس بھی دہی میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

☆ ایک چمچ سادہ دہی میں چائے کا آدھا چمچ زیتون کا تیل، چائے کا آدھا چمچ لیٹوں کا رس ملائیں۔ دس منٹ لگا رہنے کے بعد نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔

☆

انگوٹھ



دہی ایک مکمل قدرتی ذریعہ

قدرتی غذا میں ایسی بھی ہیں جنہیں کھانے کے علاوہ چہرے اور بالوں کی خوب صورتی اور دیکھ بھال کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دہی کا شمار بھی ان ہی قدرتی اشیاء میں کیا جاتا ہے۔ موسم گرما میں دہی فرحت بخش ذائقے سے ہم کنار کرنے کے علاوہ مختلف جلدی نسخوں اور ٹونکوں کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے۔ تاہم اس کے دور رس فوائد سے بیشتر خواتین اب بھی لاعلم ہی ہیں۔

دہی کا جلد اور بالوں کی خوب صورتی میں بنیادی کردار ہوتا ہے۔ اس میں زک، کیشیم، وٹامن بی ون، بی ٹو، بی 6 اور بی 12 کے علاوہ حیاتین کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے۔ یہ جلد کو بنیادی اجزاء فراہم کرنے کے علاوہ قدرتی مونچر انر کے طور پر بھی کام آتی ہے۔ یہ جلد کے خلیوں کی دوبارہ تعمیر کر کے اس کی عمومی صحت درست کرتی ہے۔ ساتھ ہی جلد کو بارونق اور چمک دار بناتی ہے۔ یہ بہت سے طریقوں سے جلد اور بالوں کے لیے فائدہ بخش ثابت ہو سکتی ہے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

بالوں اور جلد کے لیے ٹونر

☆ روزانہ چہرے پر دہی لگانے سے جلد کی چمک بھال ہوتی ہے۔ دہی میں شامل زک تمام قسم کے جراثیم چہرے سے صاف کر کے اسے خوب صورت بناتا ہے۔ تاہم اسے جلد پر لگانے سے قبل چہرے کو ہر قسم کے میک اپ سے پاک کر لینا ضروری ہے۔

☆ بالائی سے پاک دہی میں تھوڑا سا خیر ملا کر چہرے پر لگائیں۔ چند منٹ بعد سادہ پانی سے چہرہ